پیام تعلیم
جامعہ ملیہ اسلامیہ دھلی کا
پندرہ روزہ تعلیمی رسالہ
رجسٹرڈ ایل

بیگم صاحبه بهوپال

علیا حضرت بیگم صاحبه بهوپال کی وفات کی حادثۀ نی ساری ملک مین صف ماتم بچهادی هی هرشخص بلاقید مذهب و ملت آپکی بی مثال محسن اخلاق دانائی و تدبر بیدار مغزی و روشن خیالی علمی سرپرستیون اور همدردی خلائق کو یاد کر کی متاثر اور متاسف هی بلاشبه آج ایک ایسی عدیم المثال هستی هماری درمیان سی اٹهه گئی هی که زمانه بمشکل اسکی نظیر پیدا کرسکیگا ۞

اس مین شک نهین که هندوستانی خواتین کی سرتاج تهین لیکن انهون نی مختصر سی وقفۀ حیات مین جو کارنامه انجام دئی هین هندوستان کی مردون سی بهی انکی توقع نهین کی جا سکتی بلاشبه هندوستان کا مورخ ان کارنامون کو زرین حروف مین لکهیگا ۞

علیا حضرت نی جسوقت ریاست کی انتظام کی باگ اپنی هاته مین لی هی ریاست کی حالت قابل اطمینان نه تهی خزانه خالی پڑا تها انتظامی امور مین ابتری پهیلی هوئی تهی* یه آپ کی تدبر بیدار مغزی اور مسلسل جد و جهد کا نتیجه تها که تهوڑی هی عرصه مین تمام حالات پر قابو حاصل هوگیا۔ ریاست کا خزانه مالا مال هوگیا اور تمام علاقه مین مرفعه الحالی عام هو گئی۔ لیکن انهون نی اپنی ریاست کی انتظامی امور هی مین انهماک نهین رکها بلکه ملک کی عام حالت پر بهی ایک غائر نظر ڈالی اور انهین صحیح طور پر اندازه هو گیا که هندوستان کی مسلمان مردون خصوصاً عورتون کی حالت کسقدر اصلاح طلب هی ملک کا کوئی تعلیمی و اصلاحی اداره ایسا نهین هی جو انکی سرچشمه فیض سی سیراب نه هوا هو خواه وه ندوه هو یا دیوبند، جامعه هو یا علیگڈه یونیورسٹی: عورتون کی تعلیم کی لئی انهون نی خود اپنی ریاست مین متعدد مدارس قائم کئی۔ کتابین لکهین اور انکی اصلاح کی سلسله مین کسی ممکن جد و جهد سی دریغ نهین کیا۔ وه خود علم کا ذوق رکهتی تهین اور اپنی علمی سرپرستیون مین هر موقع پر انهون نی اسکا ثبوت دیا هی ان سب باتون کی ساتهه ساتهه مذهبیت کا یه عالم تها که باوجودیکه آبکاری کا محکمه ریاست کی آمدنی کا بڑا ذریعه تها لیکن انهو نی اسکا کچه خیال نهین کیا اور ریاست کو اسکی آمدنی سی پاک کردیا مولانا شبلی کی سیرة النبی کی تالیف بڑی حد تک انهین کی سرپرستی کی رهین منت هی۔ قوم کی ضروریات کا صحیح احساس انکی دل مین تها جامعه ملیه سی حضرت علیا مرحومه کو قلبی تعلق تها اور آخر دم تک رها۔ انهین اس امر پر نهایت حیرت اور افسوس تها که جامعه جیسا ضروری اداره مسلمانون کی بی توجهی کا شکار هی۔ یهی وجه هی که گو ظاهری طور پر وه هم سی جدا هوگئی هین لیکن انکی یاد هماری دلون پر نقش هی اور ان کی علمی و اصلاحی کارنامون نی انهین زنده جاوید بنا دیا هی۔

آخر مین هماری دعا هی که خدا مرحومه اعلی علیین مین جگه دی اور اعلی حضرت هز هائینس نواب صاحب اور دوسری محترم اعزا کو صبر کی توفیق عطا هو ۞

نواب سلطان جہان بیگم صاحبہ مرحومہ

جنہون نے والیان ملک مین سب سے پہلے جامعہ کی طرف توجہ فرمائی اور علاوہ گرانقدر مالی امداد کے ریاست سے بچون کو بغرض تعلیم جامعہ مین بھیجا

PESHWA FINE ART PRESS, DELHI.

۷۸۶

جلد ۹ فہرست مضامین نمبر ۱و۲

بچوں کے صفحے

فہرست تصاویر

ہندوستان میں کیا ہو رہا ہی؟

مہاتما گاندھی جی نے جب سے نمک کا قانون توڑا ہے، اسوقت سے تمام ہندوستان میں یہ وبا عام ہوگئی ہے اور اب ہر ہر قصبہ، ہر ہر شہر اور ہر ہر جگہ پر جہاں اس کے بنانے کا امکان ہے نمک بننا شروع ہوگیا ہے حکومت نے جب یہ وبا اس طرح عام ہوتے دیکھی تو اس نے نہ تو یہ کیا کہ یکبارگی اس کے اصل بانی مبانی مہاتما گاندھی کو گرفتار کرلے اور نہ یہ کیا کہ ان سیکڑوں، ہزاروں رضاکاروں کو پکڑلے جو اس کام میں مصروف تھے، بلکہ اس نے ہر ہر جگہ کے ان سربرآوردہ کام کرنے والوں کو قید کرلیا جن کی نگرانی میں یہ کام ہو رہا تھا۔ مہاتما جی کو گرفتار کرنے میں تو اسے تامل اسلئے تھا کہ انگلستان کی حکومت ابھی ایسا کرنا نہیں چاہتی تھی اور نہ حکومت ہند اس کے لئے کچھ بہت زیادہ آمادہ تھی، علاوہ اس کے مہاتما گاندھی کی شہرت اور اہمیت خود اب اس درجہ کو پہنچ گئی تھی کہ اس کا اثر دنیا کے دوسرے ممالک پر پڑے بغیر نہ رہتا اور انگلستان کو ان کے سامنے اپنی نظریں نیچی کرنی پڑتیں۔

بہرحال اس نے سب سے پہلے یہی مناسب سمجھا کہ پہلے ہر ہر جگہ کے مقامی کارکنوں اور بااثر اشخاص کو گرفتار کرلیا جائے، اس سے ممکن ہی تحریک دبجائے اور پھر اس کے بعد مہاتما گاندھی کو آسانی کے ساتھ پکڑا جا سکے گا، اس لئے کہ پھر کوئی شور و شغب کرنیوالا نہ رہے گا۔ چنانچہ ہندوستان کے ہر ایک صوبہ میں جتنے کام کرنیوالے تھے، آج سب کے سب حکومت کے مہمان خانوں میں مقیم ہیں۔ بنگال میں وہاں کے سب سے بڑے لیڈر مسٹر جے ایم سین گپتا، سوباش چندر بوس اور دوسرے بہت سے لوگ گرفتار کرلئے گئے۔ بہار میں وہاں کے تمام مقامی کارکنوں کو گرفتار کرلیا گیا ہے صوبہ متحدہ میں آیئے الہ آباد میں کانگرس کے صدر اور نوجوانوں کے سرتاج پنڈت جواہرلال نہرو گرفتار کرلئے گئے، انکے ساتھ بنارس میں کانگرس کے سکریٹری بابو سری پرکاش مع دوسرے بااثر کارکنوں کے پکڑلئے گئے۔ اسی طرح آگرہ، فرخ آباد، میرٹھ وغیرہ میں گرفتاریاں ہوئیں۔ پنجاب میں ڈاکٹر کچلو ڈاکٹر ستیہ پال، ڈاکٹر محمد عالم، ظفر علیخاں وغیرہ پکڑلئے گئے، اس سے آگے بڑھئے، صوبہ سرحدی میں وہاں کے سب سے سربرآوردہ لیڈر عبدالغفار خاں مع اپنے چند بااثر رفقا کے قید کرلئے گئے۔ نیچے آئیے، گجرات اور مہاراشٹر، سردار پٹیل، منی لال کوٹھاری، جمنالال بجاج، مہادیو ویسائی وغیرہ کی گرفتاری سے خالی ہی ہوچکا ہے۔ سندھ میں بھی متعدد کارکنوں کی گرفتاری اور جے رام داس دولت رام کے زخمی ہو جانے سے کوئی سیاسی کام کرنے والا نہیں رہا ہی۔ سی۔ پی سے مسٹر کیلکر چن لئے گئے، بمبئی میں کے۔ ایف نریمان کے پکڑ لئے جانے سے کوئی انکا جانشین نہیں رہا۔ مدراس میں مسٹر ٹی پرکاشم اور ابھی حال میں مسٹر سری نواس آئنگر کے گرفتار ہو جانے کی خبر پہنچی ہے۔ غرض یہ اور انکے علاوہ اور کتنے بااثر اور سربرآوردہ کام کرنیوالے تھے جو ہر ہر صوبہ سے چھین لئے گئے ہیں اور سوائے ایک مہاتما گاندھی کے کہ جن کی گرفتاری کی خبر بھی ان سطروں کے لکھتے لکھتے آگئی ہے، ہندوستان میں کوئی بااثر کارکن نہیں رہا ہے جو لوگوں کی سربراہی کرسکے۔ لے دے کے ایک بوڑھے پنڈت موتی لال نہرو اور انکے ساتھ ان کے ہم عمر مسٹر وی۔ جے پٹیل باقی رہ گئے جو خود بھی دو چار روز کے مہمان ہیں۔

اب اس پر مستزاد یہ کہ پولیس اور حکومت کی طرف سے ہر ہر جگہ عوام کو اشتعال دلانے اور لوگوں کو آمادۂ فساد کرنے کی تدبیریں کیجا رہی ہیں تاکہ لوگ جوش میں آکر آپے سے باہر ہوجائیں اور پھر پولیس کے ڈنڈے اور فوجوں کی بندوقیں اس تحریک کو دباکر رکھدیں، لیکن اب کی بار حکومت کو معلوم ہوجانا چاہئے کہ وہ آگ لگی ہی جو معمولی چھینٹوں سے بجھائے نہیں بجھ سکتی۔ پشاور میں بلاکسی خاص وجہ یا کسی اطلاع کے انکے ہر دلعزیز لیڈروں کو انکی جماعت سے چھین لیا گیا۔ ایسی صورت میں ضرور تھا کہ لوگ اظہار ناراضگی کرتے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوجیں بلاکر ان پر بے تحاشہ گولیاں چلائی گئیں ظاہر ہے کہ اسکا کیا انجام ہوسکتا تھا! معلوم ہوا ہی کہ چار پانچ سو آدمی شہید ہوئے ہیں اور جب اتنے شہید ہوئے ہیں تو نہ جانے کتنے مجروح اور زخمی ہوں گے۔ یہ اور اس قسم کے کتنے خونچکاں واقعات ہیں جو اس ہفتہ کے اندر پولیس کے اشتعال دلانے اور کسی روک ٹوک کے بغیر عام کرنیوالے کے نہونے سے مختلف مقامات پر پیش آئے جن کا ذکر آئندہ پرچہ میں ہوگا۔

والدین اور اُستادوں کا صفحہ

اُردو کا قاعدہ اور اُسکی مشکلات

(۲)

اکثر اصحاب نے اُردو قاعدہ کو سہل بنانیکی کوشش کی ہے اور بہت سے قاعدے نئی طرز و نئی ترتیب کے ساتھ طبع ہوکر اطراف ملک میں آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ لیکن جہانتک غور کیا گیا وہ ہمارے مرض مزمنہ کا مکمل علاج نہیں۔ سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ مصیبت صرف اردو ہی قاعدہ کے لئے مخصوص ہے ہندوستان کی دوسری زبانوں مثلاً ہندی، گورمکھی، ناگری، مرہٹی، گجراتی، بنگالی، کنڑی، سنسکرت وغیرہ کے قاعدے ان جملہ قیود سے آزاد ہیں، نہ انہیں کسی جدید سسٹم کی ضرورت ہے، نہ نئی ترتیب کی احتیاج۔ اُن کی تعلیم اپنے قدیم طریقہ پر قائم ہے جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان زبانوں کے حروف تہجی کے نام اردو حروف تہجی کے نام کی طرح پیچیدہ اور مخلوط الصوت نہیں ہیں اور نہ ایک آواز کے لئے مختلف حروف، بلکہ جو حرف ہے اس کی تقریباً وہی آواز ہے جو اس حرف کا نام ہے۔ برعکس اُردو حروف تہجی کے جن کی آواز زمین ہے تو نام آسمان ہے۔ ان تمام باتوں پر غور کرنے سے یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اگر اردو حروف کی شناخت اور آوازیں بھی انہی زبانوں کے طریقہ کی پابندی کیجائے تو ایک حد تک آسانی کی امید ہوسکتی ہے۔ رہا اسمائے حروف کا سوال وہ حسب موقع اور ضرورت کسی اور وقت تک جبکہ بچہ کچھ چل نکلے بلا کسی ہرج کے ملتوی کئے جاسکتے ہیں۔ مگر ابتک کوئی ایسا قاعدہ نظر سے نہیں گزرا جس میں اردو حروف تہجی کو دیگر ہندی زبانوں کے حروف کی طرح پڑھانے کی ہدایت درج ہو۔ علاوہ ازیں ہجا کرنیکے قدیمی اور غیر ضروری طریق کی پابندی نے بیچارے بچوں کی مشکلات میں ایک ظالمانہ اضافہ کر رکھا ہے جس کا ترک قطعاً ضروری ہے کیونکہ مخلوط الصوت اردو حروف اور اعراب ہجا کرتے وقت بجائے اس کے کہ الفاظ سازی میں ممد ہوں، مبتدیوں کو مزید پریشانی میں ڈال دیتے ہیں۔

اس لئے میرے خیال میں جدید قاعدے کی ترتیب دینے والے کا یہ کام ہونا چاہئیے کہ:-

(۱) حروف تہجی کی نئی ترتیب حروف کی یکسانیت کی بجائے اُن کی آواز اور ادائیگی مخارج کی مشکلات کو مدنظر رکھ کر دیجائے اور ہر ایک حرف کی آواز کو پہلے عام فہم چیز کے نام کے پہلے حرف کو بچہ سے کہلوا کر صاف کرلیا جائے جس میں ضرورتاً تصاویر سے بھی مدد لیجاسکتی ہے۔ بعدازاں شناخت حروف کی مشق تختہ سیاہ یا سلیٹ پر کرائی جائے یا قاعدے ہی میں حروف بلا ترتیب لکھے جائیں اور مشق کرائی جائے۔ جہاں ایک سے زیادہ ہم آواز حروف ہوں انکی آواز بخوبی کرائی جائے، آواز کا فرق بتانیکی ضرورت نہیں۔ مثلاً ض ظ۔ ذ۔ ز کو فقط (ز) کہا جائے۔ س۔ ث۔ ص کو (س) مگر ا۔ ع، گ غ، س بشں، ج۔ ز اور ک۔ ق۔ خ کے مخارج جدا جدا ابتداہی سے صحت مبالغہ کے ساتھ بتائے جائیں۔ ہمزہ (ء) دراصل کوئی حرف نہیں اسے خارج الحروف سمجھائیے۔ بڑی ز (ژ) اردو میں قلیل الاستعمال ہے لہذا ابتدا میں اس کی چنداں ضرورت نہیں جب اسما حروف بتائے جائیں، اسی ترتیب میں انہیں بھی بتایا جاسکتا ہے۔

(۲) حروف تہجی کی شناخت کی مزید مشق کے لئے اگر ایک نقشہ بناکر اور ہندسے لگاکر ہندسوں کے ذریعہ حروف اور حروف کے ذریعہ ہندسے تختۂ سیاہ پر بتائے جائیں تو کافی اور دلچسپ مشق ہوسکتی ہے۔ مرتبہ قاعدہ میں بھی اس کا التزام ہونا چاہئے۔ اس کے ساتھ ہی نقطوں کی شناخت کا بھی ایک عمدہ نقشہ تیار ہوسکتا ہے جو اوپر کے نقشے کی مدد سے بچوں سے سوال وجواب کے ذریعہ پُر کیا جاسکتا ہے اور اس طرح حروف اور اُن کے نقاط کی شناخت کامل طریق سے کرائی جاسکتی ہے۔

(۳) اس کے بعد دو حرفی الفاظ کے جوڑ توڑ حرفوں کی شکلوں کی تبدیلیوں کو سمجھایا جائے۔ د۔ ڈ ذ۔ ر۔ ڑ۔ ز۔ ا۔ و۔ ط۔ ظ۔ و س ہیں جو ابتدا میں اور بیچ میں اپنے بعد والے حروف سے نہیں ملتے اور

سالم نہیں رہتے ہیں بجز ط۔ ظ کے جو مل تو جاتے ہیں مگر رہتے سالم ہی ہیں (دو حرفی الفاظ میں دوسرا حرف عموماً سالم ہی رہتا ہے) لہذا اس قسم کے دو حرفی الفاظ کی شناخت میں کوئی دقت نہیں ہوسکتی۔ صرف دوسرے حروف پر جزم لگا کر اور دونوں حرفوں کو ملا کر لفظ کی آواز صحیح نکلوائی جائے۔ بلا جزمؔ الفاظ کے حروف کو جدا جدا بولا جائے۔ باقی سولہ حروف ج۔ چ۔ ح۔ خ۔ س ش۔ ص۔ ض۔ ع۔ غ۔ ف۔ ق۔ ک۔ گ۔ ل۔ م ایسے ہیں جن کا محض سر یعنی ابتدائی حصہ استعمال ہوتا ہے۔ اس کو بڑی اچھی طرح بورڈ پر واضح کیا جاسکتا ہے۔ پورا حرف بورڈ پر لکھکر ترکیب لفظی میں حرف کی مستعملہ صورت تک بتدریج کاٹکر بچہ سے پوچھا جائے۔ تیسرا قاعدہ حروف کی شناخت کا ترکیب لفظی میں محض نقطوں کی تعداد پر موقوف ہے یعنی اوپر ایک نقطہ ن۔ نیچے ایک نقطہ ب۔ اوپر دو ت۔ نیچے دو ي۔ یے۔ اوپر تین ش۔ نیچے تین پ۔ اس طرح قریباً جملہ حروف تہجی کی اشکال ترکیب لفظی میں بخوبی ذہن نشین ہوسکتی ہیں۔ ترکیب لفظی میں حروف کی اشکال مستعملہ کی شناخت بڑا کام ہے۔ یہ اگر صحیح طور سے مکمل ہو جائے تو گویا نصف قاعدہ پڑھ لیا۔ یہ شکلیں در اصل ایک نئے حروف تہجی بن جاتی ہیں جن کی شناخت ایک زنجیر حرفی بنا کر یا بڑے بڑے الفاظ لکھکر خوب کرائی جاسکتی ہے دو حرفی الفاظ کی اس مشق میں زبان بھی ٹوٹ کر خوب صاف ہوسکتی ہے۔

(۴) اس کے بعد سہ حرفی الفاظ کی مشق ہو۔ الفاظ میں حروف کی ابتدائی اشکال معلوم ہوچکیں۔ وسطی اشکال میں بجز ع۔ غ اور ہ کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ ف اور ق کا صرف منہ کھل جاتا ہے۔ اخیر میں قریباً ہر اک حرف سالم مستعمل ہوتا ہے۔ سہ حرفی الفاظ پڑھنے کے صرف دو قاعدے ہیں (۱) پہلے دو حرفوں کو ملا کر تیسرے حرف سے ملا دینا (۲) پہلے حرف کو جدا بولکر دوسرے دو حرفوں کو ملا کر پہلے حرف سے ملا دینا۔ ترک ہجا کی وجہ سے "ساکن" یا "موقوف" کا جھگڑا بالائے طاق رہے گا جو حرف جدا بولتا ہے۔ یا دو حرف ملکر آواز دیتے ہیں انکو جدا جدا دکھانا چاہئے پھر تینوں حرف ملکر جو لفظ اور اس کی شکل بنتی ہے وہ جدا دکھائی جائے چونکہ مفرد حروف اور دو حرفی الفاظ پڑھنے کی مشق ہوچکی ہے اس لئے ان سہ حرفی الفاظ کو سمجھنے اور پڑھنے میں دقت نہ ہوگی۔ جزم کی مشق کے لئے چہار حرفی، پنج حرفی الفاظ کی اس کے بعد کافی مشق ہونی چاہئے۔

(۵) اس کے بعد ہر ایک حرف کے بعد (الف) کا جوڑ سمجھایا جائے اور مد (آ) کو بلا نام لئے واضح کیا جائے اسی طرح یائے مجہول مکسور ماقبل سے جو آواز نکلتی ہے اسے سمجھایا جائے۔ شروع اور بیچ میں یائے مجہول کی آواز کو دو نقطوں سے ظاہر کیا جائے۔ ایک سے زیادہ حروف علت ایک جگہ جمع ہونے پر عموماً ہمزہ (ء) کا استعمال ہوتا ہے وہ بھی یہیں واضح کیا جاسکتا ہے۔ یائے مجہول مفتوح ماقبل سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اس کے لئے زبر (ـَ) کا استعمال مخصوص سمجھا جائے اور بلا نام لئے محض آواز بتائی جائے، کیونکہ مذکورہ طریقہ تعلیم میں علامت زبر (ـَ) کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اسی طرح واؤ (و) کی دونوں آوازیں بتا دیجائیں۔

(۶) میرے خیال میں یہاں سے قاعدہ کا دوسرا حصہ شروع کیا جائے۔ دوچشمی ھ محض ہندی الفاظ میں مستعمل ہوتی ہے اس لئے مرکب ہندی حروف کے مقابلہ میں دوچشمی ھ کے پہلے مفرد اردو حروف لگا کر اسے مرکب حرف سمجھا جائے اور مفرد حروف کی طرح پڑھا جائے۔ جس طرح پہلا حصہ مفرد حروف سے شروع ہوا تھا دوسرا حصہ مرکب حروف سے شروع ہو۔ ب۔ ھ۔ زبر۔ بھ وغیرہ پڑھانا درست نہیں۔ غرض ان مرکبات حروف کو بھی اردو حروف تہجی کا درجہ دیا جائے۔ اور مفردات ہی طرح انکو آواز کے ذریعہ بچے کے ذہن نشین کرایا جائے۔ مفرد حرف اور اس کا مرکب حرف ساتھ ساتھ رکھکر ہر دو کی آواز کے فرق کو واضح کیا جاسکتا ہے۔ دوچشمی ھ اور سادی ہ کا فرق بھی یہاں ذہن نشین کیا جائے۔

(۷) اس کے بعد علامت زیر (ـِ) کو آواز کے ذریعہ سمجھایا جائے اور ب بِ۔ ک۔ کھ وغیرہ حروف کے ساتھ ساتھ رکھکر زبر اور زیر کے فرق کو واضح کیا جائے۔ کسی حروف کے بعد یائے معروف آنے سے جو آواز نکلتی ہے اس کو بھی یہیں سمجھانا مناسب ہوگا۔ لیکن شروع یا بیچ میں یائے معروف میں برخلاف یائے مجہول کے دو نقطوں کے ساتھ علامت زیر کا اضافہ ضروری ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی اِ۔ اِی۔ اِے۔ اَے۔ ب۔ بِی۔ بے۔ بَے وغیرہ کی چاروں آوازوں میں الفاظ کی مدد سے تمیز کیجائے۔

(۸) زیر کی طرح اب پیش (ـُ) کی علامت بھی حسب دستور بالا یہاں بتا دیجائے۔ واؤ معروف سمجھانے کا بھی یہی موقع ہے۔ واؤ معدولہ بھی واؤ کے نیچے آڑی لکیر دیکر سمجھایا جائے کہ اس قسم کی علامت والا واؤ

علم پرور دولت آصفیہ دکن

جنھوں نے ابھی حال میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کو ایک ہزار روپیہ ماہوار اور ۵۰ ہزار یکمشت دیا جانا منظور فرمایا ہے

آواز نہیں دیتا اور مثالیں دیجائیں۔ اس کے بعد اُ۔ اَو۔ او۔ اَو۔ بُ۔ بُو۔ بو بو وغیرہ کی چاروں آوازیں الفاظ کی مدد سے سمجھائی جائیں۔

(۹) اب نون غنہ (ں) جو ناک سے بولا جاتا ہے سمجھایا جائے۔ نون غنہ جب لفظ کے اخیر میں آئے تو سالم نون بغیر نقطہ لکھا جاتا ہے جیسے ماں۔ ہاں وغیرہ لیکن جب لفظ کے بیچ میں نون غنہ کی آواز ہو تو نون کا نقطہ تو دیا جائیگا مگر نقطہ پر الٹا جزم ں کو ن سے ممیز کرنے کے لئے دے دیا جاتا ہے۔ مثلاً جنگ تنگ وغیرہ علامت تشدید (ّ) کا تلفظ گو مشکل ہے لیکن اسکا سمجھانا آسان ہے۔ علامت تشدید کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ مشدد حرف ایک دم دو دفعہ بولا جائے جیسے رسّی۔ دلّی وغیرہ اس کے بعد قاعدہ ختم ہونے پر اردو حروف تہجی کے نام ترتیب معروفہ کے ساتھ معہ اعراب کے ناموں کے یاد کرائے جاسکتے ہیں۔

اگرچہ یہ معمولی باتیں ہیں مگر پڑھنے لکھنے میں بچوں کو ابتدا میں ان اصولوں کی واقفیت اور پابندی من وعن ضروری ہے۔ چنانچہ مبتدیوں کی ابتدائی تعلیم میں ان پابندیوں کا التزام ضروری ہے۔ ان قواعد کو علیحدہ علیحدہ منضبط کرنے میں ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ جہاں کہیں عبارت خوانی میں بچے سے غلطی ہو اس کو اس قاعدہ کی طرف فوراً رجوع کرا کے اس کی مشقوں سے غلطی کی اصلاح کرائی جاسکتی ہے۔ اس لئے الفاظ کی کافی مشق ہونی چاہئے کیونکہ لفظ اٹھانے کی اٹکل آجائے تو بچہ کو عبارت پڑھنے میں چنداں دقت نہیں ہوسکتی۔ اگر حسب الہدایت مذکورہ بالا قاعدہ ختم ہوجائے تو جو استعداد پڑھنے کی بچہ کو دو تین کتابوں کے بعد ہوتی ہے وہ پیدا ہوسکتی ہے بلکہ کوئی بھی کتاب اس کے سامنے رکھدیجائے بشرطیکہ ضروری اور صحیح اعراب موجود ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ عبارت اصول خواندگی کے مطابق نہ پڑھ سکے۔ گو آہستہ ہی سہی جس قدر بچہ کی سمجھ بڑھتی جائے گی، ان پابندیوں کی احتیاج کم ہوتی جائے گی کیونکہ جب عبارت سمجھنے لگے گا اس وقت زیادہ تر اس کی اپنی سمجھ عبارت خوانی میں اسکی امداد کریگی کیونکہ یہ واضح رہے کہ پڑھنا سمجھنا دو جداگانہ چیزیں ہیں۔

سب سے بڑھکر خوشی کی بات یہ ہے کہ اس طریق سے قاعدہ پڑھنے کے بعد عربی پڑھنے میں فی الحقیقت چنداں دقت نہیں رہتی۔ محض چند عربی خوانی کے اصولوں کو ترتیب کی ضرورت ہے اور بس۔ کیونکہ جب اردو حروف اور الفاظ پر بچہ کا قابو ہوجائے گا تو عربی چنداں مشکل نہ رہے گی۔ میرے خیال میں بچہ کو عربی شروع کرا کے جیسا کہ عام رواج ہے سنگلاخ مخارج حروف اور پریشان کن تلفظ الفاظ کا خواہ مخواہ تختۂ مشق بنانا اس بیچارے کو آئندہ تعلیم سے بددل کرنا ہے۔ یوں بھی غیر زبان کی نسبت بچہ کو اپنی مادری زبان کا بولنا آسان ہوتا ہے۔ اور خوش قسمتی سے اردو اور عربی ہر دو زبانوں میں عسیر المخارج حروف مثلاً ع۔ غ۔ ح۔ خ وغیرہ مشترک ہیں لہذا اس طریق سے قاعدہ کی تکمیل کے بعد عربی خواندگی کی کٹھن منزل بہت آسان ہوسکتی ہے۔ اور یہی طریقہ درحقیقت 'یسرنا القرآن' کہلانے کا مستحق ہوسکتا ہے۔

چونکہ آج کل جبریہ تعلیم کا رواج عام ہو رہا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ بچوں کے استاد خاص طور سے اس طرف توجہ کریں اور اردو خواندگی کے اصولوں کو اچھی طرح سے سمجھکر ایسے طریق سے بچوں کو سمجھائیں کہ آسانی سے بلا جبر و تشدد انکے ذہن میں اتر جائیں۔ الغرض کوئی بچہ قاعدہ کی مشکلات یا اساتذہ کی ناجائز سختی یا انکی قاعدہ کے اصولوں سے عدم واقفیت کی بنا پر تعلیم سے محروم نہ رہے۔ ان اصولوں کو سمجھ کر استاد قریباً ہر قاعدہ کو بسہولت تمام پڑھا اور سمجھا سکتا ہے لیکن بلا شناخت رٹنے کے قدیمی طریق کو قطعی خیرباد کہدیا جائے۔ آج کل جبریہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ناخواندہ جوانوں کی تعلیم (Adult-Edu.) کا چرچا بھی عام ہو رہا ہے۔ مذکورالصدر اصول پر تعلیم ناخواندہ جوانوں اور بوڑھوں کے لئے یقیناً نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگی کیونکہ ان کی سمجھ ان اصولوں کے سمجھنے میں بہت زیادہ امداد کرے گی اور وہ دنوں میں ہی کتابیں پڑھتے اور اخبار بینی کرتے نظر آنے لگیں گے۔ انشاء اللہ

اگر کسی صاحب کو اس میں اصلاح کا خیال ہو یا کسی قاعدے کے استاد یا شائق تعلم کو کوئی شک۔ اعتراض یا عملی دقت محسوس ہو تو وہ مطلع ہونیکا موقع دیں۔

*۔ مثلاً "پہلی کتاب" اگر غلط رواج یا ان باتوں کو معمولی سمجھنے کی بنا پر کہیں پہلی کی بجائے 'پھلی' لکھا ہو تو جو شخص عبارت سمجھتا ہے وہ 'پھلی' کو 'پہلی' ہی پڑھے گا کیونکہ آگے کتاب کا لفظ اسکو 'پھلی' پڑھنے سے مانع آتا ہے۔ مگر مبتدی کو جو عبارت کا مطلب بالکل نہیں سمجھتا لفظ 'پھلی' کو 'پھلی' ہی پڑھ سکتا ہے۔ 'پہلی' بھی پڑھ سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ 'پھلی' پڑھے گا تو آپ اسے مجبور کرینگے کہ یہاں 'پہلی' پڑھو اس وقت آپ اس کی عقل سے اپیل کرینگے کہ چونکہ آگے لفظ کتاب موجود ہے اس لئے 'پہلی' پڑھا جائے گا۔ لیکن بچہ سے یہ اپیل قبل از وقت ہوگی۔ لہذا ابتدا میں اصولوں کی سمجھ اور پابندی لازمی ہے۔

مصر کی موجودہ تعلیمی حالت

غلام سرور صاحب ہماری جامعہ کے ایک لائق اور ہونہار فارغ التحصیل طالب علم ہیں۔ آپ نے عربی ادب میں جامعہ سے بی۔ اے امتیازی کا امتحان پاس کیا ہے اور اب مزید تعلیم کے لئے مصر تشریف لے گئے ہیں۔ مصر سے آپ نے ایک خط لکھا ہے جس میں وہاں کے تعلیمی حالات بیان کئے ہیں۔ ناظرین کی دلچسپی کے لئے ہم اس خط کو شائع کرتے ہیں۔

اڈیٹر

میں نے ۲۰ ؍ فروری کو آپ کو ایک خط لکھا تھا، امید ہے ملا ہوگا بمبئی سے روانہ ہوکر ۵ ؍ مارچ کو جدہ پہنچا، خوش قسمتی سے وہاں انگریزی وائس کاونسل کے ہاں جگہ مل گئی، ۱۰ ؍ مارچ کو وہاں سے روانہ ہوکر ۱۵ ؍ کو سویز پہنچا۔ سویز میں چار دن کے لئے قرنطینہ میں رہنا پڑا۔ ۱۹ ؍ کو قاہرہ آیا دو دن تک ایک ہوٹل میں ٹھہرا۔ اب رواق الہنود میں ہوں بمبئی سے جدہ تک مطلق کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ لیکن سویز میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بندرگاہوں کے لوگ اجنبیوں کو بہت دق کرتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ قاہرہ میں چند ہندوستانی طلبہ مل گئے ہیں جن سے بڑی مدد ملتی ہے۔ رواق الہنود میں ٹھہرنے کے لئے کوئی قید نہیں، ازہر کا ہر طالب علم اس میں رہ سکتا ہے، اور ازہر کا داخلہ نہایت آسان ہے لیکن رواق کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اول تو یہ ایسی جگہ واقع ہے جہاں صاف ہوا کا گذر ممکن نہیں، دوسرے ایک کمرے میں چھ طلبہ ہیں، اور ہر وقت آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے، رواق میں رہ کر پڑھنا بڑا مشکل ہے، میں کوشش کر رہا ہوں کہ باہر کوئی کمرہ کرایہ پر لے لوں، ایک پونڈ میں اچھا کمرہ مل جاتا ہے اور دس روپیہ میں ایک آدھ کمرہ کا مل جانا ممکن ہے۔ حتی الوسع میں رواق کو چھوڑنے کی جلد از جلد کوشش کروں گا۔ ازہر کی تعلیمی حالت اطمینان بخش نہیں ہے مصریوں کے لئے جو یہاں باقاعدہ تعلیم پاتے ہیں، مناسب انتظام ہے لیکن اجانب بالکل آزاد ہیں۔ اول تو انکے لئے پڑھانے والوں کا کوئی خاص انتظام نہیں دوسرے ان کے لئے دروس میں شرکت ضروری نہیں رکھی گئی، جامعہ ازہر میں داخل ہوکر رواق میں جگہ مل جاتی ہے اس کے بعد جہاں کسی کا دل چاہے جائے اور جو جی میں آئے کرے، کوئی روکنے والا نہیں، رواق میں تین تین چار چار سال سے طلبہ پڑے ہوئے ہیں، ہفتہ میں ایک آدھ دن ازہر کی زیارت کر آتے ہیں اور بس پڑھنے لکھنے سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ ازہر میں اجانب کے لئے مختلف نصاب تعلیم ہے، کم از کم دو سال کی مدت میں عالمیہ کی سند حاصل کیجا سکتی ہے، اس سند کے لئے اہلیت کی اتنی ضرورت نہیں جتنی مشائخ کی نظر کرم کی، ازہر کی سند کے لئے تعلیم پانا بیکار ہے، البتہ یہ ممکن ہے کہ ازہر میں داخل ہوکر درجہ نظامی کے بعض درسوں میں شرکت ہو سکے مثلاً تخصیص کے درجہ میں ایک شیخ عبدالوہاب صاحب ہیں جن کو تاریخ اسلام کا ماہر مانا جاتا ہے، اُنکے علاوہ چند ایک اور بھی قابل مشائخ ہیں جن سے استفادہ ممکن ہے۔ ازہر کی شرکت سے اگر کوئی فائدہ ہے تو فقط یہی ورنہ بالکل بیکار ہے۔

جامعہ مصریہ کے حالات ایک طالب علم سے معلوم ہوئے، یہ حیدرآباد سے سرکاری وظیفہ پر آئے ہیں، ان کو ۱۶ پونڈ وظیفہ ملتا ہے، یونیورسٹی کے مطالبات حکومت ادا کرتی ہے، صاحب موصوف کے ساتھ جامعہ جانیکا اتفاق ہوا، جامعہ کی عمارت شہر سے کافی دور ایک نہایت پرفضا مقام پر واقع ہے، آس پاس صرف باغات ہی باغات ہیں ظاہری سج دھج میں تو مصری مشہور ہیں، طلبہ کی تعداد ایکہزار سے کم نہیں۔ باقاعدہ انتظام ہے، پروفیسر زیادہ تر فرانسیسی ہیں، اس کے بعد اطالوی، المانی اور انگریز مصریوں کا آخری درجہ ہے۔ سالانہ فیس ۳۲ پونڈ ہے۔ ہندوستان کے بی۔ اے کو فسٹ ایر میں لیتے ہیں۔ اس کے بعد لیسانس کے لئے چار سال ہیں۔ اور لیسانس کے بعد تین سال میں ڈاکٹریٹ، یہ یہاں کا نظام ہے کالج کے درجوں میں فرانسیسی، انگریزی، المانی، طلیانی وغیرہ زبانیں لازمی ہیں، ادب عربی کے مشہور پروفیسر طہٰ حسین ہیں، تاریخ اسلام کا اچھا انتظام ہے، ایک عرب پروفیسر کے علاوہ باہر کے پروفیسر بھی ہیں، جامعہ مصریہ

میں باقاعدہ لیکچرز کی شرکت بلاکسی فیس کے ممکن ہے، صرف رجسٹرار سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ میں فی الحال دو ایک لیکچرز میں شریک ہوا ہوں۔ شہر سے کافی دور ہونے کی وجہ سے آنے جانے میں بہت خرچ ہوتا ہے، میں کوشش کر رہا ہوں کہ جامعہ ازہر میں داخل ہوکر باقاعدہ جامعہ مصریہ کے درسوں میں شریک ہوا کروں، اور اس کے ساتھ ایک آدھ درس ازہر میں بھی سنوں۔ یہ صورت مفید ہے اور اس سے تاریخ اسلام اور ادب عربی میں مہارت پیدا کرنے کا موقع ہے، دار العلوم کا حساب دوسرا ہے۔ وہاں شرکت مشکل ہے۔ جامعہ امریکانی برائے نام ہے وہاں کی امتیازی خوبی صرف انگریزی زبان ہے۔ اسکے علاوہ مصر میں تاریخ اسلام کے جاننے والے کافی لوگ موجود ہیں جن میں سے احمد ذکی پاشا، اور تیمور مشہور ہیں، اُن سے کبھی کبھی ملاقات کرنا مشکل نہیں۔ اس اثنا میں میں نے اپنا تعلیمی پروگرام بنالیا ہے۔ تاریخ اسلام اور ادب عربی کے لئے جامعہ مصریہ کے درسوں میں شریک ہوں گا اور فقہ اور تفسیر کیلئے جامعہ ازہر میں اس حساب سے ہر روز میرے تین چار گھنٹے ہو جاتے ہیں۔ دو سال کے بعد جامعہ ازہر سے سند مل گئی تو غنیمت ہے ورنہ جامعہ مصریہ سے اس امر کی شہادت ملجاتی ہے کہ فلاں صاحب نے اتنی مدت تک لیکچرز میں شرکت کی۔ مصر میں زیادہ سے زیادہ دو سال کی مدت کافی ہے۔ اس کے علاوہ باہر سے پروفیسر وغیرہ آتے رہتے ہیں وہ جامعہ مصریہ اور جمعیۃ جغرافیہ ملکیہ میں ہر ہفتہ میں مختلف موضوعات پر لیکچر دیتے ہیں مثلاً آجکل پروفیسر ارنلڈ تاریخ اسلام اور اسلام میں مصوری پر ہر ہفتہ لیکچر دیتے ہیں۔ ان مواقع سے کافی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، مصری لائبریری میں کتابوں کا کافی ذخیرہ ہے۔ فہرست کتب دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس دس بارہ سال کے عرصہ میں تاریخ استقلال مصر پر بہت کتابیں لکھی گئی ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے فاضل وقت میں ان میں سے دو ایک کو سامنے رکھ کر اردو میں ان کا ترجمہ کرنے کی کوشش کروں۔ مصر کی یہ تاریخ نہایت دلچسپ ہے، نپولین کا حملہ محمد علی، ابراہیم پاشا اور اس کے جانشینوں کی معرکہ آرائیاں، نہر سویز، مہدی سوڈانی اور عرابی پاشا وغیرہ کے دلچسپ حالات اور مصر میں انگریزوں کے احتلال کی تاریخ کافی دلچسپ رہے گی اس کے علاوہ یہ عہد موجودہ علمی حرکت اور نہضت کا زمانہ ہے اگر آپ اس تجویز پر صاد فرمائیں تو میں اپنا کام شروع کردوں۔

ازہر میں دنیائے اسلام کے ہر حصہ کے طلبہ موجود ہیں، ہر ملک کا علحدہ علحدہ رواق ہے۔ عربی بولنے میں مہارت کے بعد ان لوگوں سے ملنے کی کوشش کرونگا، سب سے زیادہ تعداد جاویوں کی ہے، آج کل پٹنہ کے ایک پروفیسر موجودہ عربی لٹریچر پر اپنا مقالہ تیار کرنے مصر آئے ہوئے ہیں اُن سے اکثر ملاقات ہوتی ہے، اس کے علاوہ خوش قسمتی سے ایک اور صاحب سے ملاقات ہوگئی ہے یہ علیگڑھ کے گریجویٹ ہیں، عربی بالکل نہیں جانتے۔ اب عربی پڑھنا چاہتے ہیں، صرف اس قدر کہ قرآن شریف سمجھ سکیں ابھی تک رواق ہی میں ہیں۔ پانچ چھ ماہ کے قیام کا ارادہ ہے اُنکی وجہ سے ابھی تک رواق میں ٹھہرا ہوں۔ ورنہ وہاں رہنا تو ایک مصیبت ہے۔

جہانتک تعلیم و تعلم کا تعلق تھا حتی الوسع میں نے تفصیل سے لکھ دیا ہے اب مصارف کا ذکر کرتا ہوں۔ رواق میں رہنے سے کرایہ مکان کی بچت ہوتی ہے لیکن خرچ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ رواق میں رہ کر پڑھنا محال ہے۔ علیحدہ مکان کی سخت ضرورت ہے میں اس کوشش میں ہوں کہ سات آٹھ روپیہ میں کوئی کمرہ ملجائے، لیکن دس بارہ روپیہ سے کم میں ملنا مشکل نظر آتا ہے۔ ایک وقت ناشتہ اور دو وقت کھانے کا خرچ کم از کم پچیس روپیہ ہے لیکن اس میں گوشت نہیں کھایا جا سکتا۔ قاہرہ میں خاص طور پر گوشت بہت گراں ہے۔ جامعہ جانے آنے کے لئے دس روپیہ ماہوار سے کم خرچ ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ جیب خرچ، کپڑے کی دھلائی اور خرید کتب وغیرہ کے اخراجات ہیں، میرے خیال میں کم از کم ساٹھ روپیہ ماہوار میں قاہرہ میں گذارا ہو سکتا ہے۔ اس سے کم خرچ بھی ممکن ہے لیکن وہ تعلیم میں حارج ہوگا مجھے نہ چائے کی عادت ہے، نہ سگرٹ کی، ورنہ پندرہ بیس روپیہ ماہوار کا یہ اور خرچ ہے

۱۵ مارچ سے لیکر اسوقت تک میں کام ڈھونڈ رہا ہوں لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی، مصری انگریزی زبان کی طرف سے بالکل بے نیازی برتتے ہیں یہاں صرف فرانسیسی زبان کی مانگ ہے، ہندوستانی یہاں یا تو سندھی ہیں، جو غیر سندھی سے کلام تک کرنا عار سمجھتے ہیں، چہ جائیکہ ان سے کسی کام کے ملنے کی توقع ہو، یا وزیری اور ہاتھ دیکھنے والے۔ انکے ہاں کوئی کام ملنا مشکل کیا محال ہے۔ اب صرف اخبارات ہیں۔ عربی لکھنے کی

مشق کررہا ہوں لیکن اس کے لئے کافی مدت کی ضرورت ہے۔ معمولی ترجمہ کے لئے تین چار ماہ کی محنت درکار ہے، اس کے بعد عربی اخبارات پر گفتگو کروں گا۔ بات یہ ہے کہ مصری اخبارات میں غیر ملکی مباحث بہت کم لکھے جاتے ہیں، البتہ آج کل ہندوستانی سیاسیات سے خاص دلچسپی کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن اس کے لئے ریوٹر کے تار کافی ہیں اور نیز الاہرام اور دو ایک مشہور اخبارات کے نامہ نگار ہندوستان سے خبریں بھیجتے رہتے ہیں۔ میں اپنی کوشش جاری رکھوں گا، خدا تعالیٰ کامیاب فرمائے۔ رواق میں رہ کر مجھ سے کام نہیں ہوسکتا۔ میں کھانے پینے میں کفایت کرسکتا ہوں لیکن رہائش میں کفایت سخت مضر ہے۔ اس میں ایک تو وقت ضائع ہوتا ہے اور دوسرے رواق کی صحبت اچھی نہیں۔ میں اس ماہ کے اندر اندر باہر کمرہ لے لوں گا۔

مصر کی اخلاقی حالت دن بدن روبزوال ہے۔ آفندی (وہ حضرات جو سوٹ پہنتے ہیں) مذہب سے تو آزاد ہے ہی لیکن اخلاقی قیود کو بھی خیرباد کہہ چکا ہے، سوائے بار، ہوٹل اور سینما کے اور کوئی شغل نہیں دارالکتب (لائبریری) میں جاکر دیکھا تو وہاں سب شیوخ (عمامہ پوش) نظر آئے، خدا کا شکر ہے کہ اس گئے گذرے زمانے میں بھی ازہر میں طلبائے دینیات کا قحط نہیں، سابق شیخ الجامعہ نے ازہر میں بہت سی اصلاحیں کی ہیں۔ نظامی باقاعدہ درس میں تمام ضروری علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ روٹی وغیرہ کا سلسلہ بند کردیا گیا ہے لیکن اساتذہ جامعہ ازہر کی حالت قابل رحم ہے۔

آفندی اسلام کے ساتھ ساتھ اخلاق کو بھی بیکار سمجھتے ہیں۔ مصری طالب العلم بحیثیت مجموعی ہندوستانی طالب علم سے بہت پیچھے ہے اور انکی وسعت معلومات کی یہ حالت ہے کہ اکثر کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہندوستان میں مسلمان بستے ہیں وہاں ان سب باتوں کے ساتھ وطنیت کا بھوت ہر شخص کے سر پر سوار ہے۔ ہر چھوٹا بڑا، زندہ باد استقلال مصر کے نعرے لگاتا پھرتا ہے۔ لباس کا یہاں بہت اہتمام ہے جبہ اور عمامہ پہننے والے کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جامعہ مصریہ وغیرہ میں تو بغیر سوٹ کے اندر نہیں جانے دیتے، خدا کا شکر ہے کہ میں ہندوستان سے ایک دو سوٹ لیتا آیا تھا ورنہ بڑی دقت ہوتی یہاں کپڑے کی سلائی دھلائی بہت گراں ہے۔ بس اب رخصت ہوتا ہوں۔

کوائف جامعہ

جامعہ میں میٹرکولیشن ایف۔ اے اور بی۔ اے کے امتحانات ۲۶ر اپریل ۳۰ء سے شروع ہوگئے ہیں اور ۷ر مئی ۳۰ء تک جاری رہیں گے اس کے بعد ان طلبہ کی چھٹی سمجھی جائیگی۔ لیکن جامعہ سے انکو جو دلچسپی ہے اور اپنے چھوٹے بھائیوں سے انھیں جو محبت ہے، اسکی بنا پر اُمید ہے کہ وہ جامعہ بند ہونے سے قبل رخصت نہ ہوں گے اور عید اپنے انھی بھائیوں میں کریں گے۔

مدرسہ جامعہ کے امتحانات وسط مئی سے شروع ہوں گے اور گرمیوں کی بڑی تعطیل یکم جون سے ہوگی جو اب کی بار صرف ۲ ماہ کی ہوگی گرم ہوا اور سخت دھوپ ابھی سے ہونے لگی ہے لیکن کبھی کبھی آسمان پر بادل کے ٹکڑے یا ہلکی پھوار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی پر شاید قدرت کو رحم آرہا ہے اور امسال بارش کا موسم شاید پہلے شروع ہوجائے۔

دیو داس گاندھی جی جنہیں نمک بنانے کے سلسلہ میں دہلی کے دوسرے کارکنوں کے ساتھ چند ہفتے قبل ۳ ماہ قید محض کی سزا ہوئی تھی، اب ایک دوسرے مقدمے کے سلسلے میں دفعہ ۱۲۴ (الف) کے ماتحت ایک سال قید بامشقت کی سزا ہوئی ہے آپ کا جرم یہ تھا کہ آپ کو طلباے دہلی کے ایک جلسہ میں تقریر کرنے کے لئے بلایا گیا جس میں آپ نے انہیں انکے فرائض سے آگاہ کیا اور متعدد مثالوں سے یہ بتایا کہ دنیا کے دوسرے ملکوں کے طلبہ نے ایسے موقعوں پر کیا فرائض انجام دئے ہیں۔ ۲۶ر اپریل کو آپ کا مقدمہ تھا جو جیل ہی کے اندر ہوا اور ۳۰ر کو آپ کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ آپنے اپنے مقدمے کی کوئی پیروی نہیں کی بلکہ صرف ایک بیان دینے پر اکتفا کیا ہے جو نہایت دلیری اور صداقت پر مبنی ہے ہم دیو داس جی کی اس دوبارہ عزت افزائی پر دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔

هز هائنس فرمانروائے بھوپال

جن کے وجود گرامي سے رياست بھوپال کي روايات علم پروري کو چار چاند لگ گئے ھیں - آپ نے جامعہ ملیہ کے لئے ایک ہزار ماهوار منظور اور ڈیڑہ لاکہ یکمشت کا وعدہ فرمایا ھے -

سائنس

نمک اور اُسکے بے شمار فائدے

اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ جب سے انسان پیدا ہوا، اُس وقت سے نمک کا استعمال ہوتا چلا آرہا ہے اور یہ انسانوں اور جانوروں کی غذا کا خاص جزو ہے۔ یہ ساری دنیا میں پایا جاتا ہے۔ عیسائیوں کی مذہبی کتاب "بائبل" میں بھی نمک کے بہت فائدے بتائے گئے ہیں۔ یہودیوں اور دوسری قوموں کے رسم ورواج سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے زمانہ کی قومیں نمک کی بہت تعظیم کرتی تھیں۔ اور آجکل کے عرب کے لوگ بھی نمک کا استعمال پہلے زمانہ کے قانون کے مطابق کرتے ہیں یعنی اگر انکو قسم کھانی ہوتی ہے تو وہ نمک ہاتھ میں اُٹھا لیتے ہیں جس سے ان کی سچائی ظاہر ہو جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نمک کی خواہش سے زبردست خواہش کسی اور چیز کی نہیں ہوتی۔ جب چین میں قحط پڑا تھا تو وہاں کے قیدیوں کو نمک بہت کم دیا جاتا تھا اور اناج زیادہ ایک تجربہ کار کا قول ہے کہ فی آدمی ایک سال میں ۲۹ پونڈ نمک کی ضرورت پڑتی ہے۔ پیٹ کی نلکیوں میں جو تر غذا ہوتی ہے اُس میں جو ½ ہائڈروکلورک ایسڈ پایا جاتا ہے وہ بھی نمک ہی کا طفیل ہے۔ جانور چھوٹے پودے کھا کر اپنی نمک کی خواہش پوری کر لیتے ہیں۔ اور بعضے جانور اپنی نمک کی خواہش پوری کرنے کیلئے سیکڑوں میل تک نمک کے جھرنوں کی تلاش کرتے چلے گئے ہیں۔ انسان کی خواہش کو پورا کرنے کیلئے خدائے تعالیٰ نے بہت نمک کے ذریعے بنائے ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ دنیا کی ہر ایک ندی ہر سال ۲ ارب ۸۰ کروڑ من نمک سمندروں میں بہا کر لیجاتی ہے دنیا کے سمندروں میں کل ایک سنکھ چالیس ٹن نمک ملا ہوا ہے جو دنیا کی ساری خشکی کو چارسو (۴۰۰) فٹ اونچائی تک ڈھک سکتا ہے۔ جب پہاڑی جھیلوں کے نمک کے علاوہ اتنا بڑا نمک کا خزانہ دنیا میں موجود ہے تو اس کے بہت سے استعمال بھی ہونگے۔ یہ کام بہت ہی مشکل ہوگا کہ یہاں نمک کے بہت سے استعمال بیان کئے جائیں۔ اگر آپ مجھ سے یہ دریافت کرینگے کہ کیا دنیا میں کوئی ایسی نباتات بھی ہے جو اپنے اندر نمک کا اثر نہ رکھتی ہو تو شاید میں یہ نہ بتا سکونگا۔ اگر نمک کے خاص خاص فائدے بیان کئے جائیں تو کم از کم مندرجہ ذیل چیزیں بتائی جا سکتی ہیں:۔

ڈبل روٹی بنانے کیلئے جو سوڈا استعمال کیا جاتا ہے اسمیں کافی نمک پڑتا ہے۔ اس مصنوعی ریشم اور چمکدار روئی کے کپڑے بھی نمک کی آمیزش سے خالی نہیں۔ بغیر دھوئیں کے اڑانیوالی بارود اور طرح طرح کے خوشبودار تیلوں میں بھی نمک ملایا جاتا ہے۔ زہریلی اور سونے کو صاف کرنیوالی چیزیں مثلاً سوڈیم سائی نائڈ وغیرہ بھی نمک سے خالی نہیں۔ ملوں میں استعمال کیا جانیوالا "بلی چنگ پاوڈر" جراثیم کو مارنیوالی دوائیں اور دوسری ادویات بھی نمک سے بنائی جاتی ہیں۔ خوبصورت، چمکدار ہزاروں طرح کے رنگ، صاف کی ہوئی لاکھ، موٹروں کے کام میں آنیوالے تیل بھی نمک کی آمیزش سے خالی نہیں۔ معدنیات کو کانوں سے نکالنے، جنگ میں "فاسجین مسٹرڈ گیس" کلورو پکرن "پکرن ایسڈ" جیسی مہلک گیسوں سے انسانوں کو بچانے کے لئے اور روئی کو تباہ کرنے والے کیڑوں کو مارنے کی دواؤں اور مسالوں میں نمک کا استعمال ضروری ہے۔ کپڑوں کی چھپائی، گوشت اور مچھلی کو دیر تک محفوظ رکھنا، چینی مٹی کے برتن بنانا یہ تمام کام بھی نمک کی مدد سے انجام پاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ربر، چمڑا، کاغذ وغیرہ وغیرہ میں بھی نمک سے مدد لیجاتی ہے۔

برٹش گورنمنٹ کا نمک پر ٹیکس لگانا نہ صرف ہندوستانیوں کی روحانی طاقت کو فنا کر رہا ہے بلکہ انکے بڑھتے ہوئے تجارتی قدم کو پیچھے ہٹا رہا ہے۔

ترجمہ از ہندی۔ میر اصغر علی درجہ ابتدائی چہارم (جامعہ)

تاریخ

ایک حبشی غلام کی سرگزشت

اس نے غیر متمدن حبشیوں کو متمدن کیسے بنایا

مسٹر بکر۔ ٹی۔ واشنگٹن امریکہ کی ریاست ورجینیا کا ایک غلام تھا جس نے ایک نہایت معمولی اور ادنیٰ درجہ سے ترقی کر کے شہرت و ناموری کی معراج تک پہنچا، اور نہ صرف یہی بلکہ آگے چل کر اپنی پوری غلام قوم کی نجات اور ترقی کا باعث ہوا۔ اسکے اس سبق آموز زندگی میں سے آج اسکا وہ حصہ دیا جاتا ہے جس میں اس نے یہ بتایا ہے کہ اس نے اپنی قوم کو معاشرت کیسی سکھائی۔

ماہ مئی ۱۸۸۱ء میں یکایک مجھ کو اپنی زندگی کے کام کو شروع کرنے کا موقعہ مل گیا۔ ایک رات گرجا میں جب کہ نماز ختم ہو چکی جنرل آرمسٹرانگ نے ذکر کیا کہ ٹسکیگی کے چھوٹے سے قصبے میں حبشیوں کے لئے ایک نارمل اسکول کھلنے والا ہے۔ اور الیابامہ کے چند اشخاص نے اس کے لئے مجھ سے ایک آدمی کی درخواست کی ہے۔ یہاں کے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ کوئی حبشی اس عہدے کے لائق نہیں مل سکتا۔ اور جنرل موصوف کسی گورے کی سفارش کریں گے۔ دوسرے دن جنرل موصوف نے مجھے اپنے دفتر میں بُلا کر دریافت کیا۔ کیا تم الیابامہ میں اس عہدے کے فرائض ادا کر سکتے ہو؟ میں نے عرض کی کہ اپنی طرف سے حتی الوسع کوشش کرونگا۔ چنانچہ اس نے جواب میں لکھ بھیجا "میرے پاس اس وقت کوئی ایسا لایق گورہ موجود نہیں ہے۔ لیکن اگر تم کو منظور ہو، تو میں اس عہدے کے لئے مسٹر بکر۔ ٹی۔ واشنگٹن کی نہایت خوشی سے سفارش کر سکتا ہوں" چند روز بعد اتوار کے دن شام کے وقت جنرل کو گرجا میں اس مضمون کا ایک تار پہنچا "بکر۔ ٹی واشنگٹن ہمارے مطلب کا آدمی ہے فوراً بھیج دیجئے"۔

یہ خبر سن کر طلبہ اور اُستاد سب کے سب نہایت خوش ہوئے۔ اور اکثر نے مجھ کو دل سے مبارک باد دی۔ اور میں اسی وقت روانگی کی تیاریاں کرنے لگا۔ یہاں سے رخصت ہو کر اول تو اپنے گھر مغربی ورجینیا میں گیا۔ چند روز وہاں رہ کر ہیمپٹن میں پہنچا۔ ٹسکیگی کی کل آبادی دو ہزار تھی جس میں تقریباً نصف حبشی تھے اور اس علاقہ کو "جنوبی بلیک بلیٹ" کہتے تھے۔ جہاں تک میں تحقیق کر سکا ہوں۔ ابتدا میں "بلیک بلیٹ" ایسی جگہ کو کہتے تھے۔ جہاں کی مٹی سیاہ اور زرخیز ہوتی تھی۔ اور وہاں غلاموں سے کام لینا زیادہ مفید سمجھا جاتا تھا۔ بعد ازاں خصوصاً "خانہ جنگی" کے بعد ایسی جگہ کو کہنے لگے، جہاں پر حبشیوں کی آبادی گوروں سے زیادہ ہو۔ ٹسکیگی کے علاقے میں حبشیوں کی تعداد گوروں سے تگنی تھی اور اُس کے گردونواح میں چھ گُنی سے کم نہ تھی۔

ٹسکیگی میں پہنچنے سے پیشتر میرا یہ خیال تھا۔ کہ وہاں کوئی مکان ضرور ہوگا۔ اور تعلیم کے متعلق تمام ضروری اشیا ہونگی لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ نہ مکان ہے۔ اور نہ ضروری سامان۔ ہاں اس بات سے بہت خوش ہوا کہ سینکڑوں مفلس اور سرگرم طلبہ وہاں موجود تھے۔ جو سرچشمۂ علم سے فیضیاب ہونا چاہتے تھے۔ اس قسم کے اسکول کے لئے ٹسکیگی سے بہتر اور کوئی مقام نہ تھا۔ اس کے آس پاس حبشی آباد تھے۔ اور ریلوے اسٹیشن سے ۵ میل کے فاصلہ پر بھی ایک مقام خلوت میں واقع تھا۔ زمانہ غلامی سے یہ قصبہ گوروں کی تعلیم کا ایک مرکز رہا ہے اور وہاں کے گورے دیگر مقامات کے لوگوں کی نسبت زیادہ تعلیم یافتہ اور مہذب تھے۔ اس لئے میرے حق میں، اور بھی زیادہ مفید ثابت ہوا۔ اگرچہ حبشی لوگ ناخواندہ تھے لیکن وہ بڑے شہروں کے ادنیٰ اور غیر مہذب لوگوں کی طرح بدچلن نہ تھے۔ اور حبشیوں اور گوروں کے باہمی تعلقات عموماً خوشگوار اور دوستانہ تھے۔ چنانچہ اس وقت تمام قصبے میں نہ سب سے بڑی بلکہ کل ایک ہی دکان آہنی اسباب کی تھی جس کے مالک ایک حبشی اور ایک گورہ دو شخص تھے اور گورے کی حین حیات تک یہ شرکت جاری رہی۔

میں نے سُنا ہے کہ ٹسکیگی میں میرے جانے سے ایک سال پیشتر چند حبشیوں نے جو ہیمپٹن کے تعلیمی کاروبار سے کچھ سُنی سُنائی واقفیت رکھتے تھے، اپنے قائم مقاموں کی معرفت حکومت سے درخواست کی تھی کہ ٹسکیگی میں نارمل سکول جاری کرنے کے لئے انھیں کچھ امداد دے حکومت نے

دو ہزار ڈالر سالانہ گرانٹ بدیں شرط دینی منظور کی، کہ یہ روپیہ اُستادوں کی تنخواہ ہی پر صرف کیا جائے۔ باقی زمین۔ مکان اور دیگر اشیائے ضروری وغیرہ کا کچھ بھی انتظام نہ تھا۔ گو یہ کام میرے لئے چنداں حوصلہ افزا اور خوش آئند نہ تھا۔ لیکن اسکول کھلنے سے حبشی خوشی کے مارے پھولے نہ سماتے تھے اور ہر طرح کی امداد دینے کے لئے ہر وقت تیار تھے۔

میرا پہلا کام یہ تھا کہ اسکول کھولنے کے لئے جگہ تلاش کروں چنانچہ میتھوڈسٹ چرچ کے پاس ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی ملی۔ گرجا اور جھونپڑی دونوں بہت بُری حالت میں تھے۔ پہلے مہینہ میں تو یہ حالت رہی کہ اثنائے تعلیم میں جب کبھی بارش آجاتی تو ایک بڑا سا طالب علم میرے سر پر چھتری کھول کر کھڑا ہو جاتا۔ اور اگر کھانا کھاتے وقت مینہ برستا تو اس مکان والی خود میرے سر پر چھتری کا سایہ کئے رہتی۔

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ہے، جون ۱۸۸۱ء میں ٹسکیگی میں وارد ہوا اور پہلا مہینہ اسکول کے لئے جگہ تلاش کرنے اور لوگوں کے اصلی حالات دریافت کرنے کے لئے الاباما کے مختلف مقامات میں پھرنے اور دیہاتی اضلاع میں اسکول کا اشتہار دینے ہی میں گزارا۔ میں دیہات میں اکثر خچر والی گاڑی میں سفر کرتا اور لوگوں کے ساتھ عام کھانا کھاتا اور انہی کے ہمراہ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں سوتا تھا۔ اور ان کے کھیتوں اسکولوں اور گرجوں میں بلا اطلاع چلا جاتا تاکہ انکی طرز معاشرت اور زندگی کے روزانہ واقعات سے واقف ہو سکوں۔ زراعت پیشہ اضلاع میں عموماً دیکھا گیا کہ سارا خاندان اپنے رشتہ داروں کو بعض اوقات مہمانوں سمیت ایک ہی کمرے میں سویا کرتا تھا اور غسل وغیرہ باہر صحن میں کیا جاتا تھا۔ لوگوں کی عام خوراک سور کا گوشت اور باجرہ کی روٹی تھی۔ مجھے کئی دفعہ صرف باجرے کی روٹی اور اُبلے ہوئے مٹر کے دانوں پر ہی قناعت کرنی پڑی۔ اگرچہ ہر قسم کے پھل اور ترکاریاں ان کے کھیتوں میں پیدا ہو سکتی تھیں لیکن اس موٹے گوشت اور باجرے کی روٹی ہی پر بسر اوقات کرنا کافی سمجھتے تھے جو بازار سے نہایت گراں قیمت پر خریدتے تھے۔ اور صرف کپاس بونا ہی جانتے تھے۔ اور اکثر اپنے دروازوں تک بھی بو دیتے تھے۔ میں نے ان حبشیوں کی جھونپڑیوں میں ساٹھ ساٹھ ڈالر کی کپڑا سینے کی کلیں اور بارہ بارہ چودہ چودہ ڈالر کی گھڑیاں رکھی ہوئی دیکھیں۔ لیکن سب سے عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی کہ ایک دفعہ میں ایک مکان میں اُس گھر کے چار ممبروں کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جہاں میز پر ۵ آدمی کھانے کے لئے بیٹھے ہیں۔ صرف ایک کانٹا موجود ہے مگر وہیں سامنے کے کونے میں ساٹھ ڈالر کا قیمتی باجہ رکھا ہے۔ ادھر ضروریات میں کفایت شعاری کا تو یہ عالم کہ آدمی پانچ اور کانٹا ایک۔ اس پر شوقینی کی یہ حالت کہ ۶۰ ڈالر کا باجہ موجود!

یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ سینے کی مشینیں عموماً بیکار پڑی رہتی تھیں اور گھڑیاں بھی بہت کم درست وقت دیتی تھیں۔ بلکہ ۹۰ فیصدی تو ایسے موجود تھے جنکو گھڑی میں وقت دیکھنا بھی نہ آتا تھا۔ اور باجے بھی بالعموم بجانے والوں کی نایابی کے سبب یونہی پڑے رہتے تھے۔

عموماً عورتیں صبح کو اُٹھ کر گوشت کو دیگچی میں ڈال کر آگ پر دھر دیتیں اور دس دس پندرہ منٹ میں جوش دے کر اُتار لیتیں۔ ان کے خاوند اپنا حصہ لے کھیتوں کی راہ لیتے اور راستے میں کھاتے جاتے اور عورتیں اُسی دیگچی میں یا رکابی میں ڈال کر ایک طرف بیٹھ کر کھا لیتیں۔ اور بچے ہاتھ میں گوشت لئے ہوئے صحن میں کھیلتے اور کھاتے پھرتے۔ جس موسم میں گوشت گراں ہوتا کھیت پر کام کرنے والوں کے سوا اور کسی کو نہ دیا جاتا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر سارا کنبہ کپاس کے کھیت کی طرف چلا جاتا۔ ہر ایک بچہ جو کدال اُٹھا سکتا تھا کام پر لگا یا جاتا تھا۔ دوپہر اور رات کا کھانا بھی صبح کے کھانے کی طرح ہوتا تھا۔ سنیچر اور اتوار کے سوا باقی دن اسی طرح گزرتے تھے۔ سنیچر کا آدھا اور کبھی سارا دن شہر میں جاکر خرید و فروخت میں گزارتے تھے۔ لیکن یہ خرید و فروخت اس قسم کی ہوتی تھی کہ اگر آدمی چاہے، تو دس منٹ میں کر سکتا ہے۔ تاہم گھر کے سب آدمی گلی کوچوں میں ادھر اُدھر گھومتے پھرتے یا کسی جگہ بیٹھ کر سگرٹ پیتے یا ہلاس سونگھتے اور اسی طرح دن پورا کر دیتے اور اتوار کو عموماً کسی بڑے جلسے میں شامل ہوتے تھے۔ دیہات میں عموماً دیکھنے میں آیا کہ فصلیں رہن ہیں اور بہت سے حبشی قرضدار بھی ہیں۔ سرکار سے ان دیہاتوں میں اسکول قائم نہ ہو سکے تھے اور گرجاؤں اور جھونپڑیوں ہی میں مدرسے ہوتے تھے۔ موسم سرما میں اسکول کے کمروں کو گرم رکھنے کا کوئی انتظام نہ

ہوتا تھا۔ ان اسکولوں کے استاد بھی چنداں ہوشیار نہ تھے۔ اوران کا چال چلن بھی کچھ ایسا درست نہ ہوتا تھا اسکولوں میں تین سے پانچ مہینے تک پڑھائی ہوا کرتی تھی۔ کسی اسکول میں تختۂ سیاہ کے سوا اور کوئی سامان نہ ہوتا تھا۔ بعض بعض مقام پر ایک ہی کتاب پر چار چار پانچ پانچ طلبہ اپنا سبق یاد کیا کرتے تھے۔ گرجاگھروں اور پادریوں کا بھی بعینہ یہی حال تھا جیسا کہ مذکور ہوا۔

ایک دفعہ میں نے ساٹھ برس کے ایک بوڑھے حبشی سے اس کے حالات دریافت کئے۔ اُس نے جواب دیا۔ کہ ورجینیا میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۴۵ء میں ایلابامہ میں جاکر بکا۔ میں نے پوچھا۔ کتنے آدمی ایک دفعہ بکے تھے۔ اُس نے جواب دیا۔ "ہم پانچ تھے۔ میں، میرا بھائی اور تین خچر"

میں یہ بات اپنے ناظرین کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں، کہ جو حالات میں نے بیان کئے ہیں اُن میں بعض حوصلہ افزا مستثنیات بھی تھیں جو کچھ میں نے دیکھا ہے، بمن وعن صاف صاف الفاظ میں لکھ دیا ہے۔ تاکہ آگے چل کر ان تبدیلیوں کی طرف آپکی توجہ مبذول کر سکوں، جو اُن لوگوں میں نہ صرف ٹسکیگی کے اسکول سے بلکہ دیگر اسی قسم کے اسکولوں کے ذریعے وقوع میں آئیں۔ (باقی)

کوائف جامعہ

جمعہ، ۲۵ راپریل ۱۹۳۰ء کو مولوی شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی مع اپنے دو ساتھی انور خانصاحب اور کنگ چندر ڈیکا کے تحریک ستیاگرہ میں حصہ لینے کی غرض سے جامعہ سے بالکل علیحدہ ہوگئے۔ آپ کو الوداع کہنے کے لئے طلبہ اور اساتذہ کا "خاکسار منزل" میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں عزیز مہمانوں کی فواکہ اور شربت سے خاطر کی گئی اور ہر ایک کے گلے میں محبت اور عقیدت کے ہار ڈالے گئے۔ الوداع کہتے وقت جناب شیخ الجامعہ نے ہر سہ حضرات کو مبارکباد دی کہ انھوں نے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا اور عزیزوں اور دوستوں کی رفاقت کا کچھ خیال نہ کیا اور انھیں چند مناسب نصیحتیں فرمائیں جو انکی آیندہ زندگی کے لئے شمع راہ کا کام دینگی۔

---

۱۰ اپریل کو جامعہ کے سالانہ ورزشی کھیلوں کا آخری مقابلہ تھا اوراسی دن تقسیم انعامات کا جلسہ بھی تھا۔ کوئی ہفتہ بھر سے صبح وشام برابر ورزشی کھیلوں کے مشق ومقابلے جاری تھے۔ آج اس کا آخری مقابلہ تھا جس میں بعض بعض کھیل نہایت دلچسپ تھے اور جو دیکھنے والوں کے لئے انتہائی مسرت ودلچسپی کا باعث ثابت ہوئے۔ ان کھیلوں میں سب سے دلچسپ چیز اساتذہ کی دوڑ تھی، جس میں شیخ وشاب سب نے حصہ لیا اگرچہ انعام کا مستحق صرف شیخ جامعہ کو قرار دیا گیا۔ آخر میں جناب بیگم صاحبہ مولانا محمد علی نے انعامات تقسیم فرمائے۔

اپریل کے آخری ہفتہ میں مولٰنا ابوالکلام صاحب اپنی کسی ضرورت سے دہلی تشریف لائے ہوئے تھے اس سلسلہ میں آپکو ایک روز طلبائے کالج نے جامعہ تشریف لانے کی بھی تکلیف دی اور انجمن اتحاد کے ماتحت ایک جلسہ منعقد کیا تاکہ طلبہ واساتذہ میں سے جو صاحب چاہیں مولٰنا سے موجودہ تحریک کے متعلق تبادلہ خیال کریں بعض حضرات نے اپنے شکوک وشبہات رفع کرنے چاہے۔ اس کے بعد خود مولٰنا نے موجودہ تحریک میں شرکت کے متعلق اپنے قیمتی خیالات کا اظہار فرمایا۔

وفد بھوپال و حیدرآباد

جسکے وسیع حلقۂ اثر اور انتھک کوششوں کی بدولت جامعہ کو ان دو بڑی علم پرور اسلامی ریاستوں سے یہ عطیئے موصول ہوئے ہیں

(دائیں سے بائیں کی جانب)۔(۱) ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری امیر جامعہ (۲) ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب شیخ الجامعہ (۳) مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو (۴) عبدالمجید خواجہ صاحب سابق شیخ الجامعہ

بغداد

(بہشت آباد، دارالسلام، مدینۃ السلام، ام الدنیا، سیدۃ البلاد)

ہے زیارت گاہِ مسلم گو جہان آباد بھی
اس کرامت کا مگر حقدار ہے بغداد بھی

یہ چمن وہ ہے کہ تھا جس کے لئے سامان ناز
لالہ صحرائے یثرب، یعنی تہذیب حجاز

خاک اس بستی کی ہو کیونکر نہ ہمدوش ارم
جس نے دیکھے جانشینان پیمبر کے قدم

جس کے غنچے تھے چمن ساماں وہ گلشن ہے یہی
کانپتا تھا جن سے روما ان کا مدفن ہے یہی (اقبال)

بغداد کا نام کس نے نہیں سنا؟ غوث اعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح کا مدفن، خلفائے عباسیہ کا پایہ تخت اور اسلامی تہذیب و تمدن کا شاندار مرکز، بغداد کسی زمانے میں دنیا کا سب سے زیادہ عظیم الشان اور سب سے زیادہ پر رونق شہر تھا۔

ہندوستان کے مغربی ساحل سے لیکر جزیرہ نمائے عرب کے کناروں تک جو وسیع سمندر موجزن ہے اس کا ایک گوشہ ایران اور عمان کے سواحل کو قطع کرتے ہوئے تقریباً ۰۰ میل تک شمال میں چلا گیا ہے۔ پانی کا یہ قطعہ جو ابتدا میں بحر عمان اور آگے چلکر خلیج فارس کے نام سے موسوم ہے دنیا میں موتیوں کا سب سے بڑا مخزن ہے۔ جہاں خلیج فارس کی شمالی حد ختم ہوتی ہے وہیں دجلہ وفرات کا دہانہ ہے جو سمندر میں گرنے سے پہلے ایک دوسرے سے ملجاتے ہیں اور اس طرح ایک دریا بن کر شط العرب کہلاتے ہیں۔ شط العرب کے کنارے کنارے ایک نہایت ہی سرسبز اور شاداب میدان قائم ہے جس کا سلسلہ مشرق میں ایران کے جنوب مغربی پہاڑوں اور مغرب میں عرب کے مشرقی صحراؤں سے ملگیا ہے۔ دہانہ شط العرب سے ٹھیک ۰ ۷ میل شمال میں دجلہ وفرات کا سنگم ہے جہاں سے مغربی ایشیا کا وہ مشہور دوآب شروع ہوتا ہے جس کی شمالی حد جبال کردستان اور سلسلۂ طارس کی جنوبی شاخوں پر ختم ہو جاتی ہے۔

علماء کا خیال ہے کہ دنیا میں تہذیب و شائستگی کی ابتدا سب سے پہلے اسی خطے میں ہوئی یہیں دنیائے قدیم کا سب سے بڑا شہر بابل آباد ہوا۔ قدیم سومری بابلی، اشوری اور کلدانی تمدن اسی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے اور یہیں کیانی اور اشکانی قدیم ایرانی قومیں، یونان و روما کے شمشیرزن قیصر و کسرے اور بادیہ نشینان عرب دنیا کی حکومت کے لئے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوئے۔ میسوپوٹیمیا، عراق اور الجزیرہ، ارض نہرین، ارض فرات اور ارض بابل سواد، کلدانیہ اور اسیریا اسی عظیم الشان قطعہ ارضی یا اس کے کسی ایک حصہ کے مختلف نام ہیں۔

ظہور اسلام کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے دنیا کی حکومت مسلمانوں کو عطا کی اور انکو تمام روئے زمین کا وارث ٹہرایا تو سب سے پہلے انکا قبضہ جن علاقوں پر ہوا ان میں سے ایک عراق تھا اور دوسرا شام۔ عراق اور شام عربوں کی دو نہایت ہی محبوب سرزمینیں ہیں جن کو وہ اپنے خشک اور بے آب و گیاہ ریگستانوں کے مقابلے میں "جنت ارضی" کے نام سے تعبیر کرتے تھے۔ زمانۂ قدیم ہی سے عراق کے سرسبز مرغزار اور شام کی دلفریب وادیاں انکو اپنی طرف کھینچتی تھیں۔ اسلام نے نہ صرف ان کی اس تمنا کو پورا کیا بلکہ خلفائے راشدین کے آخری عہد میں جب مسلمانوں میں باہم طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور خلافت راشدہ کی بجائے بنو امیہ کی حکومت قائم ہوئی تو مسلمانوں کا دارالحکومت بھی بدل گیا اور امیر معاویہ نے مدینہ منورہ کی بجائے دمشق کو اپنا پایہ تخت قرار دیا۔ لیکن بنو امیہ کی سلطنت بہت دیر تک قائم نہیں رہی۔ ابھی ایک صدی بھی گذرنے نہیں پائی تھی کہ حکومت میں انقلاب ہوا اور دنیائے اسلام میں عباسی خلافت کا دور شروع ہوا۔

اگر عراق اور شام کا باہم مقابلہ کیا جائے تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ دونوں میں کون بہتر ہے۔ جہاں تک حسن مناظر اور آب و ہوا کا تعلق ہے شام کا درجہ یقیناً عراق سے بڑھ کر ہے لیکن کثرت پیداوار اور شادابی اور زرخیزی کے اعتبار سے شام کو عراق سے کوئی نسبت نہیں۔ عراق میں کوئی ایسی وادی

نہیں جو غوطۂ دمشق کی دلفریبیوں کا مقابلہ کر سکے ۔ نہ عراق میں اونچے اونچے کوہستانوں کی برف آلود چوٹیاں ہیں نہ انکے سر سبز اور پر فضا دامن ۔ نہ وہاں سمندر کا کوئی خوبصورت کنارا ہے نہ اس کی فرحت بخش اور معتدل ہوائیں۔ عراق کی آب و ہوا بھی کچھ بہت اچھی نہیں، بعض حصے نہایت گرم ہیں اور بعض نہایت سرد۔ یہ صحیح ہے کہ عراق کی چھوٹی چھوٹی سر سبز پہاڑیوں کے نشیب و فراز، دجلہ اور فرات کے ایچ پیچ اور کھجوروں کے جھنڈ، ارباب ذوق کے لئے اچھے خاصے دلکش مناظر پیدا کر دیتے ہیں لیکن یہاں وہ سرد اور مصفے چشمے اور میووں اور پھولوں کے باغات کہاں جن کو شام میں قدم قدم پر دیکھکر جنت الفردوس کی یاد تازہ ہوتی ہے ۔ بایں ہمہ عراق کی تاریخی وسعت، عراق کی دولت اور پیداوار اور عراق کی تاریخی اہمیت شام سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے ۔ عباسی یوں بھی اپنے حالات سے مجبور تھے کہ وہ اسی سرزمین کو اپنا مستقر بناتے۔

بغداد کی بنا اور اسکی توسیع

بغداد ایک ایرانی لفظ ہے جس کے متعلق مورخین نے طرح طرح کی روایات بیان کی ہیں ۔ البتہ جہاں تک شہر بغداد کا تعلق ہے یہ امر مسلمہ ہے کہ ظہور اسلام سے بہت پہلے ایران کے قدیم دار السلطنت مدائن سے ۳۰ میل شمال کی جانب دریائے دجلہ کے کنارے ایک چھوٹی سی بستی موجود تھی جہاں ایرانی آبادی کے علاوہ ایک مسیحی دیر بھی قائم تھا اور جس کی عمدگی ہوا اور صفائے آب کی ہر شخص تعریف کرتا تھا چنانچہ ۷۶۲ء میں جب دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر المنصور کو ایک ایسے مقام کی ضرورت محسوس ہوئی جو صحیح معنوں میں دولت عباسیہ کا پایۂ تخت بن سکتا تو اس کی نظر انتخاب بھی بغداد ہی پر پڑی ۔ عراق میں بڑے بڑے شہروں کی کمی نہیں تھی لیکن بابل و سلوقیہ پہلے ہی سے مٹ گئے تھے ۔ مدائن کی عظمت کا آفتاب غروب ہو چکا تھا اور کوفہ، بصرہ اور واسط نو تعمیر عربی شہر نہ موقع کے لحاظ سے بہت زیادہ موزوں تھے نہ وہاں کے باشندوں کو عباسیوں سے کوئی خاص ہمدردی تھی بلکہ کوفہ اور اہل کوفہ سے تو انکو ہمیشہ خطرہ رہتا تھا ۔ انبار اور ہاشمیہ جہاں اس اثنا میں عباسیوں کا قیام رہا اپنے اندر کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے ، لیکن بغداد عراق کے قدیم مراکز تمدن یعنی بابل، سلوقیہ اور مدائن کے جوار میں ایک ایسے مقام پر آباد تھا جہاں سے بیک وقت عرب اور ایران دونوں کی حفاظت ہو سکتی تھی اور جو دنیائے اسلام کے عین وسط میں ایک اعلیٰ درجے کے تجارتی شاہراہ پر واقع تھا یہی وجہ ہے کہ جب اس مختصر سی بستی کو اس اولو العزم اور بلند نظر قوم کی سکونت کا شرف حاصل ہوا جو اپنے زمانے میں دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور، سب سے زیادہ دولتمند، سب سے زیادہ پر شوکت اور سب سے زیادہ مہذب، شائستہ ذی علم اور ذی ہنر قوم تھی تو بغداد بھی ایک چھوٹے سے قصبے کی بجائے دنیا کا سب سے بڑا شہر بن گیا ۔ اپنے زمانہ عروج میں بغداد تمام دنیائے اسلام کا سیاسی مرکز، اقوام عالم کا زیارت گاہ، تہذیب و تمدن کا گہوارہ، علم و حکمت کا سرچشمہ اور دولت و تجارت کا مخزن تھا ۔ اس کی شہرت اقصائے عالم میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور لوگ اس کو دار السلام، بہشت آباد، ام الدنیا، سیدۃ البلاد الزوراء (بل کھاتا ہوا) اور طرح طرح کے شاندار القاب سے یاد کرتے تھے ۔

سب سے پہلا سلسلۂ عمارات جو عربوں نے سرزمین بغداد میں تعمیر کیا وہ مستدیر، گول، شہر تھا جس کا سنگ بنیاد خود خلیفہ منصور نے ان الفاظ کیساتھ رکھا "بسم اللہ والحمد للہ والارض للہ یورثہا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین" اور جو آگے چلکر مدینۃ المنصور کے نام سے موسوم ہوا ۔ مدینۃ المنصور دجلہ کے مغربی کنارے پر واقع تھا اور اسکی قطع یہ تھی کہ ایک مدور قطعہ زمین پر یکے بعد دیگرے تین فصیلیں قائم ہوئیں جن کے باہر ایک گہری خندق موجود تھی ۔ ان فصیلوں میں ایک دوسرے کے مقابل چار دروازے بنائے گئے جن کے جلوخانوں میں ہر وقت پہرہ داروں اور محافظین کے دستے موجود رہتے تھے۔ ان چار دروازوں کے نام یہ ہیں ۔ باب کوفہ ، باب بصرہ ، باب خراسان اور باب شام۔ ہر دروازے کے سامنے ایک پل تھا اور ہر دروازے سے مقابل کے دروازے کو ایک سیدھی سڑک گئی تھی جس سے پورا شہر چار ربع دائروں میں تقسیم ہو گیا ۔ ہر ربع دائرے میں فصیلوں کے ساتھ ساتھ رعایا کے مکانات اور بازار تعمیر ہوئے لیکن وسط میں ایک نہایت وسیع میدان چھوڑ دیا گیا جس کے ارد گرد دفاتر حکومت اور امرا کی حویلیوں کی بنا پڑی ۔ وسطی رقبہ ایوان خلافت کے لئے مخصوص تھا جہاں خلیفہ منصور نے جامع بغداد کے علاوہ وہ مشہور قصر تیار کیا جو باب الذہب یا قبۃ الخضرا کے نام سے مشہور ہوا قبۃ الخضرا "یعنی سبز گنبد" اس لئے کہ اس عظیم الشان قصر پر جو گنبد تعمیر ہوا اس کا رنگ سبز تھا۔ قبہ خضرا پر ایک عرب سوار کا مجسمہ بھی تھا جو گویا اپنے ہاتھ میں تلوار لئے چار دانگ عالم میں عباسیوں کے جاہ و جلال اور ان کی عظمت و سطوت کا

اعلان کرتا تھا۔

ابتک منصور کا ارادہ صرف یہ تھا کہ وہ اپنے لئے ایک نہایت ہی مستحکم دارالحکومت تیار کرے لیکن مدینۃ المنصور کی تکمیل کے بعد آبادی کی یہ کثرت ہوئی کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد خود خلیفہ منصور نے دجلہ کے مشرقی کنارے پر ایک اور قصر یعنی قصر الخلد تعمیر کیا۔ لیکن منصور کی تعمیرات یہیں ختم نہیں ہوگئیں ۷۶۸ء میں اس نے ولیعہد حکومت شہزادہ محمد المہدی کے ساتھ ملکر قصر خلد کے قریب قصر رصافہ کی بنا رکھی یہ گویا بغداد کی وسعت اور ترقی کی ابتدا تھی۔ اس لئے کہ اب برامکہ نے قصر خلد اور قصر رصافہ کے درمیان دریا کے کنارے کنارے وہ سلسلہ ایوانات تعمیر کرانا شروع کیا جو آگے چلکر قصر خلافت کے نام سے موسوم ہوا اور جس میں قصر جعفری یا قصر حسنی، قصر تاج اور قصر فردوس نہایت عظیم الشان محل تھے۔ لیکن مشرقی بغداد کی ترقی کیساتھ مغربی بغداد بھی پیچھے نہیں رہا۔ یہاں مدینۃ المنصور کے باہر بغداد کے مختلف حصے یعنی الکرخ، الشرقیہ، قطربل، الحربیہ، القریہ اور مدینۃ العتیق وغیرہ آباد ہوئے۔ اور خلیفہ ہارون رشید نے دار القرار یعنی اپنی مشہور ملکہ زبیدہ خاتون کے لئے ایک نہایت خوبصورت ایوان تیار کرایا۔ بغداد کے ان مختلف حصوں کے ارد گرد اور انکے اندر بے شمار نہریں بہتی تھیں مثلاً نہر طابق، نہر عیسیٰ، نہر الدجاج، نہر الصراۃ، نہر الفضل، نہر الجعفر اور نہر البزازین انکے ساتھ ساتھ بغداد کے ان مضافات کی داغ بیل پڑی جن کو عرب "ارباض" کہتے تھے گویا ایک ہی صدی کے اندر بغداد کا رقبہ میلوں تک پھیل گیا اور اس کی آبادی لاکھوں تک پہنچ گئی جس میں عرب، ایرانی، رومی، ترک، کرد، ارمن، سندھی، ہندی، چینی، زنگی، حبشی ہر قسم کی مخلوق موجود تھی۔

بغداد کا عروج و زوال

عربی قصص کی مشہور کتاب الف لیلہ بغداد کی عظمت و شوکت کی نہایت صحیح تصویر ہے۔ جب ہم الف لیلہ کے افسانوں میں اس عجیب و غریب شہر کے حالات پڑھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی خیالی دنیا کی سیر کر رہے ہیں لیکن حیرت ناک امر یہ ہے کہ ہماری تمام تاریخی معلومات سے بھی انہی تعجب خیز افسانوں کی تائید ہوتی ہے۔ ایک جرمن مورخ کا قول ہے کہ بغداد کی زندگی کے مطالعہ میں ہم جس پہلو پر غور کرتے ہیں ہمیں ایسی چیزوں سے سابقہ پڑتا ہے جن کو ہم اپنے زعم میں عہد جدید کا نتیجہ سمجھتے ہیں، ایک دوسرے مورخ نے لکھا ہے "اس زمانے میں بغداد کو علم و حکمت اور تہذیب و تمدن سے وہی نسبت تھی جو اب یورپ کو ہے۔" اس میں کوئی شک نہیں کہ اسوقت آج کل کی بہت سی مفید اور نادر ایجادات موجود نہیں تھیں لیکن اگر لندن اور پیرس کے جگمگاتے ہوئے تماشا گاہوں اور موٹروں اور ٹریم گاڑیوں کے ہجوم سے قطع نظر کر لیجائے یا ہم یورپ و امریکہ کے ان عظیم الشان کارخانوں کا خیال نہ کریں جن کو دیکھکر انسان کی عقل دنگ رہجاتی ہے تو پھر دنیا کا کوئی شہر بغداد کا مقابلہ نہیں کرسکیگا۔ نہ کبھی روما اور قسطنطنیہ یا دنیائے قدیم کے کسی اور شہر کو تنہا مشرق و مغرب کی حکمرانی نصیب ہوئی نہ آج کسی شہر کو یہ فخر حاصل ہے بغداد بجائے خود ایک چھوٹی سی دنیا تھا جس میں سارے عالم کی روح کھنچ آئی تھی۔

مورخین کا بیان ہے کہ بغداد کی آبادی بیس لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ انہوں نے بغداد کی مساجد، بغداد کے ایوان و قصور اور بغداد کے حماموں، کارواں سراؤں اور ہوٹلوں (جن کو عرب خان کہتے تھے) کی تعداد ہزاروں میں بیان کی ہے جب کبھی ہم اس پُر رونق شہر کی بیشمار گذرگاہوں اور لاتعداد عمارات کا خیال کرتے ہیں جو دریائے دجلہ کے بل کھاتے ہوئے کناروں کے ساتھ ساتھ ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور جن میں تھوڑے تھوڑے فاصلے کے درمیان دار الخلافہ اسلام کے سر بفلک ایوانات، عالیشان مساجد اور بڑے بڑے وسیع کتب خانوں، خانقاہوں اور شفاخانوں کے ہزار ہا کنگورے، گنبد اور مینار آسمان سے باتیں کرتے ہوئے نظر آتے تھے تو ہمارے دل پر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ انسان تصور نہیں کرسکتا کہ کس طرح بغداد کے پُرفضا باغات اور اس کی دلکش نزہت گاہوں میں وہاں کے خوش مذاق اور بذلہ سنج شہریوں کا جمگھٹا رہتا ہوگا۔ بغداد کی وسیع شاہراہیں جو دنیائے اسلام کے دور دراز حصوں کو گئی تھیں ہمیشہ قافلہائے تجارت سے پُر رہتی تھیں۔ اس کے لاانتہا بازاروں اور آراستہ پیراستہ دکانوں پر دنیا بھر کے تاجر جمع رہتے تھے۔ شہر کا ہر بازار کسی ایک تجارت کے لئے مخصوص تھا۔ ایک بازار میں چینی مصنوعات بکتی تھیں، ایک میں سمور ریشم، مچھلی کی ہڈیوں، چرمی سامان، موم، تیر اور اسلحہ کی خرید و فروخت ہوتی تھی، کہیں دیبا، حریر، جواہرات اور آئینوں کی تجارت ہوتی تھی۔ کہیں غلاموں کی منڈی

تھی۔ شہر کے ہر حصے میں طرح طرح کے کارخانے موجود تھے۔ شکر سازی، شیشہ سازی، دھات کا کام، جھاڑ اور فانوس، شیشے اور پتھر کے برتن، زربفت مخمل رشمین کپڑا، مشجر، تصاویر اور مجسمے، کاغذ، عطریات، قالین، گھڑیاں مختلف قسم کے آلات اور ساز سب بغداد ہی میں تیار ہوتے تھے اس کے پیچ در پیچ گلی کوچوں اور بلووں ریائے دجلہ پہ تین چوبی پل قائم تھے ان میں دن رات خلقت کا اژدہام رہتا تھا۔ عورتیں بھی بلا تکلف گھروں سے باہر نکلتی تھیں۔ لوگ یا تو پیدل چلتے تھے یا خچروں پر سوار ہوتے تھے یا پھر کشتیوں میں بیٹھکر راستہ طے کرتے تھے۔ دریائے دجلہ میں چھوٹے بڑے ڈونگے، جنگی اور تجارتی سفینے اور امرا کے تفریحی مراکب ہمیشہ موجود رہتے تھے۔ انہیں میں خلیفہ امین کی وہ پانچ اعجوبۂ روزگار کشتیاں بھی تھیں جن میں سے ایک کی شکل شیر کی سی تھی ایک کی ہاتھی، ایک کی سانپ، ایک کی گھوڑے، اور ایک کی عقاب کی سی۔

دیوان اعظم یعنی بارگاہ خلافت کی شان و شوکت انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ یہاں دنیا بھر کے ارباب سیاست، امرا، وزرا، قاضی اور مفتی، فقیہہ اور محتسب اپنا اپنا درباری لباس پہنے شب و روز معاملات حکومت میں منہمک رہتے تھے خلفاء کے جاہ و ثروت اور انکے درباروں کی شہرت ساری دنیا میں پھیلی ہوئی تھی لیکن بغداد کی شان و شوکت کچھ اس کی عشرت گاہوں پر ہی موقوف نہیں تھی یہ صحیح ہے کہ بغداد کی موسیقی، بغداد کا ذوق جمال، بغداد کے رقص و سرود اور بغداد کی شعر و شاعری کی نظیر کہیں دنیا میں نہیں ملتی تھی لیکن بغداد علم و فضل کا گہوارہ اور ہدایت و ارشاد کا سرچشمہ بھی تھا۔ دنیائے اسلام کے بڑے بڑے فقیہہ محدث، صوفی، متکلم، سائنسدان اور فلسفی بغداد ہی کی خاک سے پیدا ہوئے اور یہ بغداد ہی کی درگاہیں اور بغداد ہی کے زاویے اور تکیے تھے جہاں سے علم و حکمت کی شعاعیں نکلکر ساری دنیا میں پھیلیں۔

افسوس ہے کہ دنیائے اسلام کی یہ سب سے بڑی یادگار دیکھتے ہی دیکھتے مٹ گئی۔ ٹھیک ۵۰۰ سال کی عظمت و جلال کے بعد خون آشام تاتاریوں کا وہ سیلاب اٹھا جس کو مسلمانوں نے قیامت صغریٰ کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ ۱۲۵۸ء میں ہلاکو خاں ایک مختصر سے محاصرے کے بعد بغداد میں داخل ہوا اور اس کے بے درد اور سفاک ہمراہیوں نے بغداد کے گلی کوچوں میں خون کے دریا بہا دیئے۔ عباسی خلافت مٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے عروج و اقبال کا خاتمہ ہو گیا۔

اس منحوس ساعت کے کچھ دنوں بعد تاتاری مسلمان ہو گئے، اور خود بغداد بھی ترکوں کے قبضے میں آ گیا لیکن اس کی وہ کھوئی ہوئی عظمت پھر زندہ نہ ہو سکی۔ موجودہ بغداد دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر آباد ہے اور اس کے ارد گرد چند ٹوٹی پھوٹی عمارتوں اور خشت و سنگ کے ایک ڈھیر کے سوا اور کچھ نہیں۔ خیر یہ جو کچھ تھا غنیمت تھا لیکن غضب یہ ہوا کہ ۱۹۱۴ء میں جب ترک اتحادیوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوئے تو دو ڈھائی سال کی بدلتی ہوئی کامیابیوں کے بعد بغداد بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس المناک حادثے کی خبر ہندوستان میں پہنچی تو مولانا حسرت نے برجستہ ایک شعر کہا جس نے گویا بلبل شیراز کے مرثیہ بغداد کی تکمیل کر دی مولانا کہتے ہیں۔

شاہ جیلاں سے یہ حسرت عرض ہے اسلام کی
یوں نہ ہونا چاہیئے تھا فیصلہ بغداد کا

قصے کہانیاں

آدمی کی کہانی
ایک ستارہ کی زبانی

رات کو جب بدلی اور کہرہ نہ ہو تو نیلے نیلے آسمان میں چھوٹے بڑے تارے کیسے جھلکے ہوتے ہیں اور کس مزہ سے چم چم، چم چم کرتے ہیں۔ یوں تو معلوم ہوتا ہے کہ سب کے سب کسی جوہری نے ایک خوبصورت نیلے رنگ کے گنبد میں جڑ دئے ہیں۔ مگر لوگوں نے پتہ چلا لیا ہے کہ ان میں سے کوئی ہم سے نزدیک ہے کوئی دور۔ مگر نزدیک والے بھی ہم سے اتنے دور ہیں کہ اگر میلوں کوسوں میں انکا فاصلہ بتایا جائے تو سمجھ میں نہیں آتا اور جو دور ہیں انکا تو کہنا ہی کیا۔ غرض کھربوں پدموں کوس تک ستاروں کی یہ آبادی چلی گئی ہے اور سب اپنی بلندی سے ہر وقت ہمارا حال دیکھتے ہیں۔ ہماری آواز تو شاید ان تک نہیں پہنچتی ہوگی مگر دیکھتے دیکھتے انہیں ایسی اٹکل ہوگئی ہے کہ ہمارے چلنے پھرنے اور ہمارے ہونٹوں کی حرکت سے یہ ہمارا سب حال سمجھ جاتے ہیں اور ہمارے دل تک کی باتیں جان جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کو تو دنیا کا تماشا، ہمارا کھیل کود، ہمارا کام کاج، ہماری لڑائی بھڑائی دیکھنے میں ایسا مزہ آنے لگا ہے کہ اگر کبھی تھوڑی دیر کو بھی اسے نہیں دیکھ پاتے تو بے چین ہونے لگتے ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ برسات کے بادل کئی دن سے ہماری زمین پر چھائے ہوئے تھے۔ اُدھر ستاروں کا ایک جھنڈ جس میں بہت سے ننھے ننھے تارے بھی تھے ہمارا تماشا دیکھنے کو بیتاب تھا۔ جب کئی دن تک بادل نہ چھٹے تو ان سب ننھے ننھے تاروں نے مل کر اپنی نانی اماں سے جو ایک کونے میں بیٹھی چرخہ کات رہی تھیں کہا "نانی اماں، نانی اماں اب تو یہاں جی گھبراتا ہے۔ دیکھو کتنے دن سے ان چھوٹے چھوٹے دو پاؤں والوں کا تماشا بھی نہیں دکھائی دیتا۔ نانی اماں کوئی کہانی ہی سنائیے جو وقت کٹے" نانی اماں بولیں "اچھا بچو، اچھا۔ میں ذرا دو پونیاں کات لوں۔ پھر کہانی سناتی ہوں"۔ "نہیں نہیں، نانی اماں، تم جانے دو پونیاں کتنی دیر میں کات پاؤگی۔ اب گھڑی گھڑی تو تمہارا دھاگا ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے۔ نانی اماں، کاتتی بھی جاؤ اور کہانی بھی کہتی جاؤ"۔ بڑی بی نے کہا "بیٹا، ایسی بھی کیا بے صبری۔ میں ابھی دم بھر میں یہ دونوں پونیاں کات لونگی۔ اور پھر کہانی شروع کردوں گی"۔ "نہیں نانی اماں نہیں" سب چلائے "ہمارا تو جی گھبراتا ہے"۔ نانی اماں مسکرائیں اور کہا "اچھا تمہاری خوشی۔ تو پھر میں کاتتے جاؤں گی اور کہانی بھی کہتی جاؤں گی۔ مگر سن لو ابھی سے میری نگاہ ذرا ٹھیک نہیں رہی ہے نئی پونی سے دھاگا نکالنے میں یا تو تار ٹوٹ جاتا ہے یا زیادہ بل کھا جاتا ہے۔ اس میں مجھے ذرا دیر لگتی ہے۔ تو تم ہی جانو۔ کہانی اتنی دیر رک جایا کرے گی۔ پھر نہ چلانا کہ نانی اماں رک گئیں"۔ سب نے کہا "ہاں ہاں اتنی دیر کو رک جایا کرنا ہم چپ رہیں گے۔ مگر نانی اماں یہ تو بتاؤ کونسی کہانی سناؤگی؟" نانی اماں نے کہا "اچھا آج تمہیں ان دو پاؤں والوں کی کہانی سناؤں جو اس چھوٹے سے گولے پر ادھر ادھر پھدکتے پھرتے ہیں۔ اس کہانی کا نام ہے 'آدمی کی کہانی'"۔ "ہاں، ہاں ضرور نانی اماں سچ سچ بتاؤ تو، یہ ہیں کون لوگ اور یہ چھوٹا سا گولا جس پر یہ بستے ہیں کیا ہے" نانی اماں نے کہا "اچھا سنو۔ یہ جو گولا تمہیں چھوٹا سا نظر آتا ہے یہ اتنا چھوٹا نہیں جتنا تم سمجھتے ہو۔ ہم لوگ اس سے بہت دور ہیں اس لئے یہ اتنا ننھا سا لگتا ہے۔ دیکھو میری جو یہ بڑی بڑی پونیاں ہیں ان میں سے ایک پونی سے میں ..۰ میل لمبا تاگا نکالتی ہوں۔ ایسے اسی ۵۰ تار پچاس پونیوں سے نکالوں تب کہیں اتنا بڑا تاگہ بنے کہ اس گولے کے اردگرد لپیٹ سکیں۔ تم اتنا حساب تو جانتے ہی ہو پانچ پانچ سو

میل کے لمبے تار ملاؤ تو پچیس ہزار میل لمبا تار بنے گا۔ ہاں تو اس گولے کے چاروں طرف ۲۵ ہزار میل کا تاگہ لپٹ سکتا ہے اور میری پرنانی کہتی تھیں کہ ایک دفعہ ہمارے بڑوں کے ایک جن کو غصہ آیا تھا تو اس نے اس گولہ پر ایک بہت بڑا تیر چلایا تھا ایسا کہ زمین کے بیچ سے آرپار ہوا ایک سرا ادھر ہوا ایک اُدھر۔ پرنانی کہتی تھیں کہ وہ تیر کوئی ۸ ہزار میل کا تھا۔ تو جس گولے کے گرد ۲۵ ہزار میل کا تیر بالم گذر پائے وہ خاصہ بڑا گولہ ہوا۔ اس پر ننھے ننھے سے دو پانوں والے پھرتے ہیں۔ ان میں سے کروڑوں تو ایسے ہیں جو اپنے گھر دس پانچ کوس سے زیادہ ادھر اُدھر نہیں گئے۔ اور دوسرے بہت گئے تو دو چار ہزار میل۔ اب کہیں پچھلے دنوں میں ان میں سے بعض نے بہت چلنا پھرنا شروع کیا ہے تو بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے سارے گولے کی سیر کر لی ہے۔ ہاں تو یہ ذرا ذرا سے لوگ سمجھا کرتے تھے کہ ہماری زمین ایک چپٹا سا میدان ہے جس کے گرداگرد سمندر کا پانی ہے۔ مگر اب انہیں بھی پتہ چل گیا ہے کہ ان کی زمین گول ہے اور دوسرے بہتیرے سیاروں کی طرح بڑے سے سورج کے گرد گھومتی ہے۔ پرنانی بتاتی تھیں کہ زمین اور سورج کے بیچ میں کوئی نو کروڑ میل کا فاصلہ ہے۔ زمین جیسے ۱۱ ہزار گولے ملا ملا کر رکھو تو کہیں جا کر زمین سے سورج تک پہنچ سکو۔ اور ہم تم تو، کیا بتاؤں ان لوگوں سے کتنے دور ہیں۔ ہمارا تو انکے سورج تک سے کوئی واسطہ نہیں، ہمارا اپنا سورج ہی الگ اور ہماری ساری دنیا ہی اور ہے۔ اور ایسی ایسی نہ جانیں کتنی کروڑوں اربوں دنیائیں ہیں۔ البتہ ہمارا سورج ان زمین والوں کے سورج سے جتنا نزدیک ہے اور کسی دنیا کا سورج اتنا قریب نہیں۔ پھر بھی تم جانتے ہو ہم ان لوگوں سے کتنے دور ہیں؟

”نہیں نانی اماں ہم کیا جانیں۔ تم بتاؤ!“ چھوٹے تاروں نے کہا ”دیکھو میں نے تمہیں سورج اور زمین کا فاصلہ تو بتا دیا نہ۔ جتنا فاصلہ زمین اور زمین والوں کے سورج میں ہے۔ ویسے ویسے ۲۵ لاکھ فاصلے ہم میں اور ان میں ہیں! اور ہم ان سے اور دنیاؤں کے مقابلہ میں سب سے نزدیک ہیں۔ جو حکمت اور قدرت والا ان کی، ہماری اور ساری ان گنت دنیاؤں کی دیکھ بھال کرتا ہے جو خود ہمیں بھی اس بلندی سے دکھائی نہیں دیتیں اس لئے اس چھوٹے سے گولے، زمین پر ان دو پاؤں والے جانوروں کو بسایا ہے کہ اس پر چلیں پھریں اور اسکے احکام بجا لائیں۔“

ہمارا سورج سے سب سے قریب
دوسرا سورج

تقریباً ۲ پدم پچاس کھرب میل

سعیدہ کی امّاں

سعیدہ کی ماں بہت دنوں سے بیمار تھی۔ بخار، کھانسی، کبھی ہاتھ پاؤں میں درد، کبھی پیٹ میں، کبھی پیٹھ میں۔ بہت دنوں تک حکیموں کا علاج ہوتا رہا۔ کسی نہ کسی چیز کو تو فائدہ ضرور ہوتا تھا لیکن بیماری کا سلسلہ تھا کہ چلا جاتا تھا۔ ایک چیز جاتی دوسری رہ جاتی۔ کمزوری بہت ہوگئی تھی۔ چہرہ ایسا پیلا پڑ گیا تھا جیسے پیلی کلی کا پھول۔ حکیموں نے کھانا بس یوں ہی سا کر کے بند ہی کر دیا تھا۔ گرمی اچھی خاصی تھی لیکن جن حکیم جی کا علاج تھا وہ ہوا سے بہت ڈرتے تھے۔ اس لئے ایک چھوٹے سے کمرے میں انہیں رکھوایا تھا اور سب کھڑکیاں اور کواڑ بند رکھنے کی تاکید کر دی تھی۔

جب کمزوری برابر بڑھتی گئی تو عزیزوں، پڑوسیوں نے کہا کہ بھائی ڈاکٹر انصاری صاحب کا علاج کراؤ۔ مانا ان کی فیس زیادہ ہے۔ نسخہ میں دوائیاں بھی بہت مہنگی لکھتے ہیں، مگر جان ہے تو جہان ہے۔ سعیدہ کی ماں بیچاری غریب عورت تھی۔ اسی لئے ڈاکٹر صاحب کا علاج شروع سے نہ کیا تھا مگر جان بہت پیاری ہوتی ہے۔ کہا اچھا کچھ گہنا بیچوں گی اور ڈاکٹر صاحب ہی کا علاج کروں گی۔

ڈاکٹر صاحب کئی دن کے انتظار کے بعد آئے۔ کوئی آدھ گھنٹہ تک حال سنا اور دیکھا بھالا اور نسخہ لکھکر چلے گئے۔ سعیدہ کی خالہ نے پوچھا "اور ڈاکٹر صاحب کھانے کو؟" ڈاکٹر صاحب نے کہا جو انکا جی چاہے کھلاؤ۔ پھلکا، شوربہ، دودھ، اَنار کا عرق، انگور کا عرق۔

سعیدہ اندر سے پان لے کر آئی، چوکھٹ میں ٹھوکر لگی تو پان کی تھالی وہ جا کر گری۔ سعیدہ زور زور سے رونے لگی۔ ڈاکٹر صاحب نے سعیدہ کو اٹھا لیا اور چلنے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ سعیدہ کی خالہ نے اندر سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب ذرا تشریف رکھئے اور پان بھیجتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا میں تو پان کھاتا ہی نہیں ہوں۔ آپ پان کی تکلیف نہ کریں البتہ یہ جو آپ اس کوٹھری میں مریضہ کے ساتھ بند ہیں اور نہ معلوم آپ کے ساتھ کتنے تیماردار اسی ڈبہ میں قید ہیں، یہ ٹھیک نہیں۔ انہیں بڑے کمرے میں رکھئے، کھڑکیاں سب کھلی رہیں اور ۸ بجے سے ۹ بجے تک انہیں باہر دھوپ میں تکیہ کی ٹیک دے کر بٹھایا کیجئے۔ روز۔ دیکھئے بھولیے گا نہیں یہ دوا سے زیادہ ضروری ہے۔"

ڈاکٹر صاحب یہ کہکر چلے گئے۔ گھر میں اڑوس پڑوس کی نہ جانے کتنی بڑھیاں ہر وقت جمع رہتی تھیں۔ انمیں ایک سے ایک بقراط۔ کوئی کہتی ہے یہ موئے ڈاکٹر کیا جانیں۔ ہوا میں بٹھانے کو کہہ گئے۔ کھانسی کا یہ حال اور دروازے کھلے رکھو۔ بخار روز آتا ہے، دھوپ میں بیٹھو۔ سعیدہ کی ماں کو یہ بحث اچھی نہیں لگتی تھی۔ دو ایک مرتبہ ان کے ماتھے پر کچھ شکنیں پڑیں۔ پھر کراہ کر اس نے کروٹ بدل لی۔ لیکن بڑھیاں ڈاکٹر صاحب اور ان کے فن کے متعلق باتیں کئے گئیں اور برابر بستر کے پاس بیچ بیچ پیکیں تھوکتی رہیں۔ آخر سعیدہ کی ماں سے نہ رہا گیا۔ اس نے پھر کروٹ لی اور بولی "اب میں چاہے مروں چاہے جیوں۔ ڈاکٹر صاحب نے جو کہا ہے وہی کروں گی۔ بہن اب تم بڑے کمرے میں میرا بستر لے چلو اور صبح سے دھوپ میں ایک چارپائی بچھا دیا کرو۔" بہن نے فوراً بڑے کمرہ کا انگڑ کھنگڑ ہٹانا شروع کیا۔ اور شام تک بستر اس کمرے میں پہنچ گیا۔ کھڑکیاں اور دروازے کھلے رہے۔ سعیدہ کی ماں کو خوب نیند آئی۔ اور صبح اٹھی تو طبیعت ہلکی ہلکی سی تھی۔ اب ۸ بجے کا انتظار شروع ہوا لیکن خدا کا کرنا، ۸ بجے ہی سارے آسمان پر بادل چھا گئے۔ اور سارے دن دھوپ نہ نکلی۔ دوسرے دن بھی یہی حال رہا۔ سعیدہ کی ماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "یا اللہ کیا میری وجہ سے اب تیرا سورج بھی نہ نکلے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے دھوپ میں لیٹنے کو کہا ہے، دھوپ ہی نہ نکلے گی تو میں کیسے اچھی ہوں گی؟"

سعیدہ بھی کہیں پلنگ کے پاس اپنی گڑیا کو لئے کھڑی یہ باتیں سن رہی تھی۔ مگر بس سن لیا اور کچھ نہیں اپنے کھیل میں لگ گئی۔ اس دن سہ پہر کو دھوپ نکلی تو سعیدہ آنگن سے دوڑی ہوئی آئی اور برآمدہ ہی

سے چلائی کہ" اماں اماں - دیتو - دوپ - نتلی "۔ سب کو بڑی حیرت ہوئی کہ دیکھو ذرا سی بچی اور اتنا دھیان! مگر شام کے وقت ڈاکٹر صاحب نے سعیدہ کی ماں کو باہر بٹھانے کو کہا نہ تھا۔ اس لئے لوگوں نے چارپائی نہ نکالی۔ سعیدہ نے بار بار دھوپ نکلنے کا اعلان کیا اس کے اصرار سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ چاہتی ہے کہ لوگ اس کی ماں کی چارپائی دھوپ میں ڈالدیں۔ لیکن اس مطلب کو ادا نہیں کرسکتی۔ لوگ اپنے اپنے کام میں لگ گئے اور سعیدہ پھر آنگن میں جاکر کھیلنے لگی لیکن کچھ اداس اداس سی رہی۔ تھوڑی دیر میں اپنی گڑیاں دہیں زمین پر ڈال یہ مٹی ہی پر لیٹ گئی۔ سورج ڈوبنے کا وقت آگیا تھا سامنے والے آم کے پیڑ کی چوٹی پر سورج کی کرنیں کھیل رہی تھیں۔ سعیدہ کی نظر اسی چوٹی پر جمی تھی ایک زبان ہے جسے بڑے نہ سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں لیکن بچے اسے خوب جانتے ہیں اور آپس میں یہ پیڑوں، پھولوں، جانوروں سورج چاند اور تاروں بلکہ کوئی کوئی تو کہتا ہے کہ اللہ میاں تک سے باتیں کرلیتے ہیں۔ اسی زبان میں سعیدہ نے سورج کی اس کرن سے جو سب سے آخر تک آم کی چوٹی پر کھیلتی رہی باتیں کیں کہ بہن کل صبح ضرور آنا۔ اماں کے لئے دھوپ کردینا۔ نہیں تو اماں کیسے اچھی ہونگی "۔ کرن نے سعیدہ سے وعدہ کرلیا کہ "میں ضرور آؤں گی تو اداس مت ہو"۔

دوسرے دن جب کوئی چار بجے سے سورج کی کرنوں نے دنیا میں آنے کے لئے بننا سنورنا شروع کیا تو سورج نے کہا "چلو آج بھی چھٹی ہے، آج پھر یہیں آسمان میں رہنا ہوگا۔ دنیا کا راستہ بادلوں کی فوج نے بند کر رکھا ہے"۔

کرنوں کو یہ بات اچھی تو نہ لگی کہ یہیں آسمان میں بند رہیں اور دنیا کی سیر کو نہ جائیں مگر کیا کرتیں چپ ہوگئیں۔ مگر وہ کرن جس نے ایک دن پہلے سعیدہ سے باتیں کی تھیں ذرا آگے کو بڑھی اور بولی "اور میں اب کیا کروں میں تو کل سعیدہ کو زبان دے چکی ہوں کہ صبح ضرور آؤنگی اور تیری اماں کے لئے دھوپ کردوں گی۔ نہیں تو وہ اچھی کیسے ہونگی۔ ڈاکٹر نے کہا ہے ڈاکٹر نے۔ یہ کمبخت بادلوں کی فوج ختم ہی نہیں ہوتی۔ روز ادھر سے ادھر۔ روز ادھر سے ادھر۔ میرا بس چلتا تو سب کا سہ توڑ کر زمین کو جاتی!"۔ بھلا اکیلی ایک کرن کیسے بادلوں کی فوج میں سے آتی۔ دوسری بہنوں کو بھی خیال ہوا۔ کہ اس کرن کی بات ہیٹی نہ ہو۔ سعیدہ کیا کہے گی کہ اب آسمان کے لوگ بھی جھوٹ بولنے لگے۔ سب کی سب سورج سے لپٹ پڑیں، کہ آج تو ضرور دنیا کو جائیں گے، آج تو ضرور"۔

سورج نے کہا اچھا تمہاری خوشی۔ چلو۔ مگر بادلوں کی فوج میں تمام کیچڑ موتی ہے تمہارے سارے کپڑے ناس ہوجائیں گے "۔ مگر کرنیں پھر کہاں سنتی تھیں۔ سب نے کہا ہم کپڑے بچالیں گے۔ نہیں تو جلدی سے لوٹ کر دوسرے بدل لیں گے"۔ خیر یہ کہکر انہوں نے زمین کا رخ کیا۔ یہ ننھی کرنیں بادلوں کی فوج کو بھلا کیا ہٹاتیں مگر ان میں گرمی تھی تو ہوتی ہر ایک جگہ بادلوں کی فوج کے ایک ٹکڑے پر برابر گھنٹہ بھر جو چمکیں تو فوج کا یہ دستہ مارے گرمی کے گھبرا اٹھا اور ایک طرف کو ہٹ گیا۔ بس کیا تھا کرنوں کو راستہ مل گیا اور یہ دیکھتے دیکھتے دنیا کو پہنچ گئیں۔ اور سیدھی سعیدہ کی ماں کے آنگن میں اتریں۔ سعیدہ صبح کے بادلوں کو دیکھتی تھی اور اداس بیٹھی تھی۔ کسی سے کچھ کہتی بھی نہ تھی۔ اب جو کرنوں کی سواری پہنچی تو اسکا چہرہ باغ باغ ہوگیا۔ اور یہ پھر چلائی " اماں اماں دیتو۔ دوپ - نتلی"۔ بچی کی اس بات سے ماں پر بڑا اثر ہوا اور اس کی آنکھوں میں محبت سے آنسو بھر آئے۔ سعیدہ کی خالہ نے آنگن میں ہارسنگھار کے پیڑ کے پاس دھوپ میں چارپائی ڈلوائی۔ کوئی گاؤ تکیہ تو گھر میں تھا نہیں کئی چھوٹے چھوٹے تکئے اور دو بستر ایک جگہ کرکے سعیدہ کی ماں کی پیٹھ سے لگا دئے اور یہ گھنٹہ بھر تک دھوپ میں بیٹھی رہی۔ ہفتوں بعد بند جھوٹے سے کمرہ سے نکلکر دھوپ اور تازہ ہوا میں نکلی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ نئی دنیا میں آگئی ہو چہرہ پیلا تھا لیکن اتنا اداس نہ تھا۔ آنکھوں میں نئی روشنی سی آگئی تھی۔ سعیدہ بھی معمول سے زیادہ خوش تھی۔ پٹی کے پاس آکر کھڑی ہوتی تھی، ماں نے ایک دفعہ اسے گود میں اٹھالیا اور خوب چومے لئے۔ ہوا کے جھونکے سے اس وقت ہارسنگھار کے بہت سے پھول سعیدہ کی ماں کی گود میں گرے۔ دیوار پر قمری نے حق سرہ کا گیت گایا۔ اسی دن سے سعیدہ کی ماں کی طبیعت اچھی ہونے لگی اور اب وہ اچھی چنگی بھلی ہے۔

راقمہ رقیہ ریحانہ

بندر اور مگر کی کہانی

کسی سمندر کے کنارے ایک جامن کا درخت تھا جس میں ہمیشہ جامن لگے رہتے تھے۔ اسی درخت پر ایک بندر بھی رہتا تھا۔ ایک بار اس درخت کے نیچے ایک مگر سمندر کے پانی سے نکلکر نرم ریت میں آبیٹھا۔ اس کو دیکھ کر بندر نے کہا "آپ ہمارے مہمان ہیں۔ آپ ہمارے لذیذ جامن کے پھل کھائیے۔ کیونکہ دور سے تھک کر آئے ہوئے مہمان کی خدمت کرنے سے مرنے کے بعد بہت اجر ملتا ہے"۔

یہ کہہ کر بندر نے اس کو جامن کے کچھ پھل دیے۔ مگر ان کو کھاکر کچھ دیر تک باتیں کرتا رہا پھر اس کے بعد اپنے گھر کو چلا گیا۔ اس طرح ہر روز بندر اور مگر جامن کے سایے تلے بات چیت کرتے اپنا وقت گزارا کرتے تھے۔ اور کھانے سے جو جامن بچ رہتے تھے ان کو بندر اپنی بیوی کے لئے لے جایا کرتا تھا۔ ایک بار اُسکی بیوی نے پوچھا "یہ لذیذ جامن آپ ہر روز کہاں سے لاتے ہیں؟" وہ بولا "ایک بندر میرا دوست ہے وہ مجھکو ہر روز پھل دیدیا کرتا ہے"۔ تب اُس نے کہا "جو ہمیشہ ایسے لذیذ پھل کھاتا ہے، وہ خود بھی کتنا اچھا ہوگا۔ پس اگر تم مجھ کو اپنی بیوی سمجھتے ہو تو اسکا دل لاکر مجھے دو تاکہ اسے کھاکر میں بڑھاپے اور موت سے ہمیشہ کیلئے نجات حاصل کروں۔ اس نے کہا "ایسا مت کہو! وہ غریب ہمارا بھائی ہے۔ وہ ہر روز ہمیں میٹھے پھل دیتا ہے۔ تم اس فضول ضد کو چھوڑ دو۔ بعض عقلمندوں نے کہا ہے کہ "ماں ایک حقیقی بھائی پیدا کرتی ہے۔ بات چیت اور گفتگو دوسری قسم کے بھائی پیدا کر دیتے ہیں، اکثر بات چیت اور گفتگو سے پیدا شدہ بھائی حقیقی بھائی سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے"۔

یہ سُنکر بیوی نے کہا "اگر تم مجھ کو اسکا دل نہ لاکر دوگے تو تم مجھ کو زندہ نہ دیکھوگے"۔ اس کا یہ ارادہ دیکھ کر مگر سوچنے لگا کہ کیا کروں کس طرح سے اس بندر کو ماروں اور اس کا دل لاکر بیوی کے دل کو خوش کروں" وہ انھی خیالات کو سوچتا ہوا بندر کے پاس گیا اسکو دیکھتے ہی بندر بولا "میرے پیارے دوست! آج تم دیر سے کیوں آئے؟ اور تم غمگین کیوں ہو؟ اچھی طرح سے کیوں نہیں بولتے"؟ مگر بولا "کیا بتاؤں، مجھکو تمہاری بھابھی نے آج یہ دھمکی دی ہے کہ اگر تم اپنے دوست کو اس کے احسانات کا بدلہ دینے کے لئے گھر نہ لے آئے تو تم مجھکو دوسری دنیا میں دیکھوگے اسی وجہ سے آنے میں دیر ہوئی۔ اب تم میرے ساتھ گھر چلو"۔ بندر نے کہا "دوست! تمہاری بیوی نے ٹھیک کہا ہے مگر ہم جنگل کے پھرنے والے، اور تم پانی میں رہنے والے۔ ہمارا تمہارا ساتھ کیسے ہو سکتا ہے۔ اور میں وہاں کسطرح جا سکتا ہوں ایک کام کرو تم اپنی بیوی کو یہیں لے آؤ۔ مجھ سے جو کچھ خدمت ہو سکیگی بجا لاؤں گا" وہ بولا "دوست! سمندر کے اُس پار کنارے پر ایک نہایت خوب صورت جگہ میں ہمارا گھر ہے۔ آپ میری پیٹھ پر چڑھ کر وہاں چلیں" بندر یہ سُنکر خوشی سے بولا "اگر ایسا ہے تو دیر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جلدی کرو۔ میں تمہاری پیٹھ پر چڑھتا ہوں" مگر کو پانی میں جاتے ہوئے دیکھکر بندر بولا "بھائی! ذرا آہستہ آہستہ چلو۔ پانی کی لہروں سے میرا دل بیٹھا جاتا ہے"۔ یہ سُن کر مگر سوچنے لگا کہ اب تو اتنے گہرے پانی میں آکر بندر میرے قابو میں آگیا ہے۔ اب یہ ایک تل بھر اپنے اختیار سے نہیں چل سکتا۔ اس سے اپنا مطلب کہہ دینا چاہیئے۔ مگر اس سے بولا "دوست! میں تم کو اپنی بیوی کے کہنے سے تمہاری جان لینے کے لئے یہاں لایا ہوں"۔ وہ بولا "بھائی! میں نے تمہارا یا اسکا کیا نقصان کیا ہے، جو تمہارا ارادہ ایسا ہو رہا ہے"۔ مگر نے کہا "دوست تمہارے دیئے ہوئے لذیذ پھلوں کا رس چکھ کر اس نے تمہارے دل کو کھانیکا ارادہ کیا ہے"۔ یہ سُن کر وہ چالاک بندر بولا "بھلے آدمی

اگر ایسا ہی تھا تو تم نے وہیں مجھ سے کیوں نہ کہہ دیا؟ میں نے اپنا دل جامن کی کھوکھلے میں بہت دنوں سے چھپا رکھا ہے۔ وہ تمہاری عورت ہی کی نذر کر دیتا۔ میرا دل یہاں نہیں ہے۔ تم مجھے ناحق یہاں لائے؟" یہ سنکر مگر بولا" اگر ایسا ہے تو اپنا دل مجھکو لادو تاکہ میں اُسے اپنی بیوی کو لے جاکر دیدوں۔ میں تم کو وہاں لئے چلتا ہوں" یہ کہکر مگر خشکی کی طرف لوٹا بندر بھی جیسے تیسے کنارے پر پہنچتے ہی چھلانگ مار کر جامن کے درخت پر چڑھ گیا اور وہاں بیٹھکر اپنے دل میں کہنے لگا کہ "چلو جان بچی، لاکھوں پائے"

ادھر تو بندر یہ سوچ رہا تھا۔ ادھر مگر نے کہا" دوست! اس دل کو مجھے دے دو تاکہ میں اسے لیجاکر اپنی بیوی کو دوں اور وہ اپنی قسم اُتار دے" یہ سنکر بندر ہنسا اور غرا کر بولا" اے بیوقوف دغاباز! کیا کسی کے دو دل بھی ہوتے ہیں۔ تجھ پر تف ہے۔ جا اس درخت کے نیچے اب کبھی مت آنا۔ ایک بار روٹھے ہوئے دوست سے جو پھر ملنے کی خواہش کرتا ہے وہ اپنے سے اپنی موت کو بلاتا ہے"۔

یہ سن کر مگر شرم سے پانی پانی ہو گیا اور اپنے دل میں کہنے لگا" ہائے میں نے اپنے دل کی بات کیوں اس سے کہدی اب اگر پھر کسی طرح یہ اعتبار کرلے تو اچھا ہے" یہ سوچ کر وہ اس سے بولا "میرے دوست! میں نے ہنسی ہنسی میں تمہارا امتحان لینا چاہا تھا۔ دراصل میری بیوی کو تمہارے دل سے کچھ غرض نہیں ہے تم میرے مہمان بن کر چلو" بندر نے کہا" ارے پاجی! جا! میں اب تیرے پھندے میں نہیں آنے کا۔ کسی نے سچ کہا ہے:۔

بھروسہ نہ کرنیوالے کا بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ اور بھروسہ کرنیوالے کا بھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ بھروسہ سے پیدا ہوا نقصان برباد کر دیتا ہے۔ آج میری پیدائش کا نیا دن ہے"۔

میر اصغر علی۔ جماعت ابتدائی چہارم (رباعیہ)

سمندر کی شہزادی

ایران کا بادشاہ اپنے بڑے کمرے میں بیٹھا تھا۔ وہاں بہت آگ جل رہی تھی اس لئے کہ سردی کا موسم تھا۔ سمندر کے کنارے پہاڑی پر گھر تھا۔ بادشاہ وہاں سے اٹھا اور کھڑکی پاس آیا اور وہ رات ایک بڑی خوفناک رات تھی۔ بارش ہو رہی تھی اور پہاڑی کے نیچے سمندر میں بہت شور ہو رہا ہے۔

جس وقت وہ وہاں کھڑا تھا اس نے ایک رونے کی آواز سُنی" اے بادشاہ کھول۔ دروازہ کھول" بادشاہ دروازے کے پاس گیا اور اسے کھولدیا اس نے ایک شخص دیکھا جسکی آنکھیں نیلی تھیں ایسی جیسی کہ سمندر اور جب وہ بولا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہ سمندر کا شور۔ اس نوجوان کے ساتھ ایک لڑکی تھی۔ اسکا چہرہ ایسا تھا جیسے کہ سمندر کے پانی سے دھلا ہوا پتھر۔ اس آدمی نے کہا" اے بادشاہ یہ میری بہن ہے۔ میں اسے اس لئے لے آیا ہوں کہ تیرے ہاں نوکر رکھوا دوں" اس نے یہ کہا اور رات کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

اس کے جاتے ہی بارش ہونے لگی۔ بادشاہ نے اپنے دروازے پر ایک چھوٹی لڑکی کو کھڑے ہوئے دیکھا۔ اس نے کہا" تم میری نوکر بننا چاہتی ہو؟" لیکن وہ کچھ نہ بولی۔ اس نے پوچھا" اچھا تم کون ہو" لیکن وہ پھر کچھ نہ بولی۔ تب وہ اس کو گھر کے اندر لے آیا۔ اور وہ اسکی نوکر ہو گئی۔ وہ بہت زیادہ کام کرتی تھی لیکن وہ کبھی بولتی نہ تھی۔ کچھ عرصہ بعد لڑکی بڑی ہو کر ایک خوبصورت عورت بن گئی تب بادشاہ اس کے ساتھ بہت زیادہ محبت کرنے لگا۔ اور ایک دن اس نے اس سے کہا" اب تم نوکر نہیں ہو بلکہ ایک شہزادی ہو۔ کیونکہ تمہارا چہرہ ایسا سفید ہے جیسے کہ سمندر سے دھلا ہوا پتھر۔ تم مجھ سے شادی کر لو اور میری ملکہ بن جاؤ" وہ کچھ نہ بولی بلکہ اپنے ہاتھ سے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پس بادشاہ نے شادی کر لی اور وہ اس کی ملکہ بن گئی۔

تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ملکہ کے ایک بچہ ہوا وہ ایک ننھا سا بچہ تھا۔ بادشاہ نے کہا "اب میں خوش ہوں۔ صرف ایک بات کا رنج ہے کہ تم بولتی نہیں ہو۔ کیا تم اب اپنے بچے سے بھی نہ بولوگی؟"

تب ملکہ نے اپنا بچہ گود میں لیا اور پہاڑی کے نیچے سمندر کے کنارے چلی گئی۔ بادشاہ بھی اس کے ساتھ گیا سمندر کے کنارے پہنچکر اس نے کچھ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لکڑی کے چنے اور آگ جلائی۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا سونے کا بکس تھا اس نے کچھ سفوف بکس کے اندر سے نکالا اور اس آگ میں ڈالدیا۔

تب بادشاہ نے بڑا شور سنا سمندر کھلا اور بہت سے آدمی سمندر سے نکلے۔ ان میں سے ایک آدمی ملکہ کے پاس آیا۔ اسکی آنکھیں ایسی تھیں جیسے کہ نیلا سمندر۔ اور جب وہ بولا تو ایسے جیسے سمندر کا شور۔ اس نے ملکہ سے مخاطب ہوکر کہا "میری شہزادی کیا اب تم سمندر میں واپس نہ آؤگی تم سمندر کے بادشاہ سے شادی کرلو اور سمندر کی ملکہ بنجاؤ" تب ملکہ نے جواب دیا "اے میرے بھائی! میں نے اس بادشاہ سے شادی کرلی ہے اور میں کبھی واپس نہیں آسکتی۔"

ملکہ کے بھائی نے کہا "اے فارس کے بادشاہ! ایک وقت تھا جب کے دوسرے ملک کے سمندر کے لوگ اس کو مجھ سے لینے کے لئے آئے تھے۔ میں ڈر رہا تھا کہ وہ میری بہن کو مار ڈالیں گے میں جانتا تھا کہ تم ایک اچھے بادشاہ ہو۔ پس میں اسکو تمہاری نوکر بننے کے لئے لایا تھا۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ میں تمکو واپس لیجاؤنگا اور جب تک میرا ملک میرے قبضہ میں نہ آجائے۔ اسوقت تک بات مت کرنا جب میں دوبارہ آؤں تب بولنا۔ اب میرا ملک میرا اپنا ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ تم واپس آجاؤ۔"

مگر ملکہ نے جواب دیا کہ "نہیں، میں کسی طرح واپس نہیں آسکتی۔"

تب ملکہ کے بھائی نے بچہ اس کی گود سے لے لیا اور سمندر کے اندر کود گیا، پانی اسکے سر سے اوپر آگیا۔ اور وہ اسکو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے انتظار کیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آیا۔ اور اس نے ملکہ کی گود میں بچہ دیدیا۔ اور کہا کہ یہ سمندر کا بچہ ہے یہ سمندر کا بچہ ہے یہ سمندر میں رہتا ہے۔ اور بالآخر یہ تم کو سمندر میں واپس لائے گا۔"

اس کے بعد ملکہ کے بھائی اور تمام آدمی سمندر میں چلے گئے

بہت زمانہ گزر گیا۔ فارس کا بادشاہ بہت خوش خوش رہنے لگا۔ اس کی ملکہ اب اس سے بولنے لگی۔ اور وہ اس سے بہت زیادہ محبت کرنے لگا۔ آخرش بادشاہ بوڑھا ہوگیا۔ وہ بیمار پڑا۔ ایک دن صبح کا وقت تھا۔ ملکہ اس کے پاس بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولکر اس طرف دیکھا اور کہا میں ضرور اب جاؤنگا۔ اس کے بعد اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور وہ اس سے رخصت ہوگیا۔

ملکہ نے سنا کہ پہاڑی کے نیچے سمندر میں ایسا شور ہو رہا ہے جیسے کہ گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ پس اس نے اپنے لڑکے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور دونو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے سمندر کے اندر چلے گئے۔

مسعود حسین خاں۔ طالب علم ابتدائی چہارم (جامعہ

پڑھو اور ہنسو

دو دوست چلے جارہے تھے۔ راستہ میں ایک روپیہ پڑا پایا۔ ایک دوست دوسرے سے کہنے لگا "یہ میرا ہے"

دوسرا "اس کا کیا ثبوت؟ شاید کسی اور کا ہو"

پہلا (اپنی پھٹی ہوئی جیب دکھاکر) "یہ دیکھو میری جیب پھٹی ہوئی ہے۔"

ایک مسافر "کیا میں ساڑھے پانچ کی گاڑی میں سوار ہوسکونگا"

شریر قلی "جناب یہ آپ کی تیز رفتاری پر منحصر ہے۔ کیونکہ گاڑی کو روانہ ہوئے تین منٹ ہوچکے"

نبی احمد انصاری۔ طالب علم۔ جامعہ دہلی

کھیل کا کھیل اور ڈرائنگ کی ڈرائنگ

ہندسوں کا ہاتھی

"پیام" بھائیو۔ آج میں تمہیں ایک ایسا کھیل بتانا چاہتا ہوں جو کھیل کا کھیل ہے اور سبق کا سبق۔ نیچے کی شکل کو دیکھو، یہ ایک ہاتھی کی تصویر ہے اس میں عجیب بات یہ ہے کہ یہ صرف ایک سے لیکر نو تک کے ہندسوں سے بنایا گیا ہے اچھا اس کے بنانے
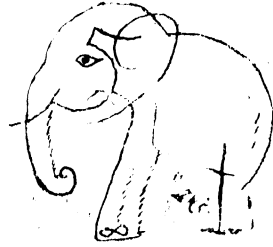
کی ترکیب سنو سب سے پہلے ایک 3 کا ہندسہ بناؤ۔ یہ ہاتھی کا سر اور کمر کا کام دیگا۔ اب 3 کے سرے پر 6 کا ہندسہ لگاؤ۔ یہ سونڈ بنگئی۔ اب ٹانگ بنانے کے لئے 2 کا ہندسہ استعمال کرو اور پاؤں دکھانے کے لئے 8 بناؤ۔ دوسری ٹانگ 4 سے بناؤ اور نیچے 7 کا ہندسہ لگا دو۔ کان وغیرہ بنانے کے لئے 9 اور 5 کے ہندسے استعمال کرو۔ نمائشی دانت بنانے کے لئے 1 کا ہندسہ لگاؤ۔ اب صرف تمہیں آنکھ بنانی رہ گئی ہے وہ اپنے سے بنا دو۔ بس دم کی کسر ہے ورنہ تمہارا ہاتھی تیار ہوگیا۔

نبی احمد انصاری

متعلم ثانوی اول ۔ جامعہ۔

لکیروں اور نقطوں کا کھیل

اکثر بچے چھٹی کے دنوں میں بیکار اپنا وقت ضائع کرتے ہیں اس بیکاری کے وقت میں کھیلنے کے لئے ہم تمہیں ایک کھیل بتائیں جو کھیل کا کھیل ہوگا اور کام کا کام۔

ہر ایک لڑکا اپنے اپنے ہاتھ میں ایک ایک پنسل اور کاغذ لے اور

ان میں سے ایک لڑکا ایک، دو، تین کہے اور تین کے لفظ پر سب لڑکے اپنے اپنے کاغذ پر کوئی ٹیڑھی بیڑھی لکیر بنا دیں، اسکے بعد ہر لڑکا اپنا اپنا کاغذ اپنے دائیں بازو والے لڑکے سے بدل لے اور کوشش کرے کہ کاغذ کی اس بے معنی لکیر سے کوئی شکل پیدا کر دے۔ مثال کے طور پر اس شکل کو دیکھو۔ اس بے معنی لکیر سے کیسی اچھی مینڈک کی تصویر بن گئی ہے۔

دوسری صورت نقطوں کی ہے۔ کچھ نقطے لو اور انھیں باہم اس طرح ملاؤ کہ کوئی شکل بنجائے، دیکھو ان پانچ نقطوں سے کون کہہ سکتا ہے کہ ایسا اچھا بندر بن جائے گا۔

گھر بیٹھے سینما

بچوں کو دن میں کھیلنے کے لئے تو بہت سے کھیل مل جاتے ہیں لیکن جب وہ اپنے بستروں پر سونے کے لئے جاتے ہیں تو وہ یہ چاہتے ہیں کہ جب تک نیند نہ آئے اس وقت تک کوئی مشغلہ ہو تو اچھا ہے۔ اکثر بچے اپنا وقت قصے کہانیوں میں صرف کرتے ہیں اور نیند آنے کے وقت یہ مشغلہ جاری رہتا ہے۔
لیکن ہم ایک ایسا کھیل پیام بھائیوں کو بتاتے ہیں جسے وہ

ہیں جو برقی روشنی سے پردہ پر ڈالی جاتی ہیں، اور حرکت کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اب تم بھی چاہو تو گھر بیٹھے سینما دیکھ سکتے ہو۔ ایک چراغ لو اور اس کے ذریعہ سے اپنے ہاتھوں کا سایہ دیوار پر ڈالو مگر دیوار بالکل ہموار ہو اس لئے کہ دیوار اگر ہموار نہ ہو گی تو سایہ ٹھیک نہیں پڑے گا۔ سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ تمہارے ہاتھ ہمیشہ چراغ اور دیوار کے درمیان ہوں اگر چراغ ہاتھوں کے مقابل میں ہوگا تو سایہ لمبا ہو جائے گا

۱۔ ہاتھی

۲۔

۳۔ اونٹ

۵۔ خرگوش

۶۔ بیل

۴۔ کتا

رات کو کھیل سکتے ہیں اور قصے کہانیوں سے زیادہ لطف اٹھا سکتے ہیں
ان تصویروں سے تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ ہاتھ کے عکس یا سائے ہیں۔ اور ان سے مختلف شکلیں بنجاتی ہیں۔ پیام بھائیوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ عکس یا سایہ بہت ہی اہم چیز ہے۔ میرا خیال ہے کہ سینما وغیرہ بھی اسی سے بنایا گیا ہے۔ سینما میں بھی صرف تصویریں ہی تصویریں

اس لئے ہاتھ چراغ اور دیوار کے درمیان رہیں۔ بعد اپنے ہاتھوں اور انگلیوں کے ملانے سے مختلف شکلیں حرکت کرتی ہوئی معلوم ہوں۔ تم اپنی انگلیوں اور ہاتھوں کو حرکت دو۔ کہ جانور کھا رہا ہے کان ہلا رہا ہے اسکے علاوہ جانور کی شکل تم نے بنائی ہے اسکے ساتھ تم

انعامی معمے

پہلا معمّا

دائیں سے بائیں

۱۔ مہاتما گاندھی کا وطن
۷۔ ندی
۸۔ چہرہ
۱۰۔ گیارہ
۱۱۔ آتش پرست
۱۲۔ نس
۱۴۔ اوپر
۱۵۔ ایک پھل
۱۶۔ لینا بشکل ماضی
۱۷۔ پانی
۱۸۔ سانس
۲۰۔ 'د' لگا دینے سے مندر کے معنی۔
۲۲۔ فرانس کا دارالسلطنت
۲۴۔ جنوبی ہندوستان کی ایک مشہور پہاڑی تفریح گاہ ہے۔

اوپر سے نیچے

۱۔ شمال۔
۲۔ حرکت جو کھینچ کر پڑھی جائے۔
۳۔ اقبال کی ایک مشہور کتاب کے نام کا نصف آخر۔
۴۔ آنا بشکل ماضی
۵۔ دہرا دو تو باپ کا نام ہو جائے
۶۔ دھبہ
۹۔ حضرت عیسیٰ کی ماں کا نام
۱۳۔ کھویا ہوا
۱۴۔ ایک سکنڈ کا ساٹھواں حصہ
۱۵۔ اڑنا کا ماضی
۱۸۔ چراغ۔
۱۹۔ ایک مرکز بڑھا دو تو موت کے معنی دے۔
۲۱۔ پیار
۲۲۔ کواڑ۔ ۲۳۔ زہر

دوسرا معمّا

ہدایات

یہ ایک مصرعہ ہے جو اس دائرے کے اندر تصویروں کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے۔ بتاؤ کہ وہ مصرعہ کیا ہے؟

شرائط

(۱) ہر ایک معمے پر ڈھائی ڈھائی روپے کا انعام ہے اور دونوں کے صحیح آنے پر ۵ کے انعام کا مستحق ہوگا۔
(۲) ہر حل کے ساتھ ۱ کا ٹکٹ آنا ضروری ہے اور دونوں کے ساتھ ۱ کے ٹکٹ آنے چاہئیں
(۳) ایک سے زاید حل آنے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی ہوگا
(۴) ہر دو معموں کا حل ن۔م بتوسط ایڈیٹر صاحب "پیام تعلیم" کے پاس ۲۰ جون ۳۸ء تک پہونچ جانا چاہئے۔

---

۱۵ چھٹیوں میں یکم جون لغایتہ ۱۳ جولائی ۳۸ء ایڈیٹر سے متعلق تمام مراسلت مندرجہ ذیل پتہ پر ہونی چاہئے۔
سعید انصاری بی۔ اے (جامعہ) آصف گنج۔ اعظم گڈھ

پیام تعلیم کے انعامات

انعامی مضامین کا فیصلہ

اعلان پیام تعلیم مورخہ ۷ر جولائی ۱۹۲۹ء کے مطابق حسب ذیل اشخاص کو بہ تفصیل ذیل انعامات دیئے جانیکا فیصلہ ہوا ہے۔

۱۔ مذہب میں پانچ روپے کا انعام "اسلام - اصولی حیثیت سے" اور "اسلام عملی حیثیت سے" کے مضمون پر دیا جانا قرار پایا ہے لیکن افسوس ہے کہ مسودہ پر صاحب مضمون کا نام و پتہ کچھ نہیں درج تھا جن صاحب کا یہ مضمون ہو وہ دفتر پیام تعلیم سے ۵ر کی کتابیں وصول کر سکتے ہیں۔

۲۔ سائنس میں انعام کے قابل سید نصیر احمد صاحب دہلی کا مضمون قرار دیا گیا ہے جو خادمہ تجلی کے عنوان سے تین نمبروں میں شائع ہوا ہے، لیکن موصوف چونکہ شرائط کے خلاف کالج کے طالب علم ہیں، اس لئے شاید وہ ان انعامات کو قبول کرنا پسند نہ فرمائیں۔

۳۔ تیسرا انعام دنیا کے کسی بڑے مفتش کے حالات بہترین انداز میں لکھنے پر تھا۔ اس عنوان پر سوائے سید نصیر احمد صاحب، دہلی کے اور کسی نے نہیں لکھا آپ کا مضمون "کولمبس" پر تھا جو اگرچہ معیار کے کچھ بہت مطابق یا اس پایہ کا نہیں ہے جو انھوں نے سائنس پر لکھا ہے پھر بھی اگر موصوف پسند فرمائیں تو دونوں مضامین کے عوض ایک انعام پانچ روپیہ کا دیا جا سکتا ہے۔

۴۔ تاریخی موضوع پر افسوس ہے، کوئی اچھا مضمون مقابلہ میں نہیں آسکا جو ان کی نظر میں اگر کوئی مضمون قابل انعام قرار پایا تو وہ "اکابرین ہند" کے سلسلہ میں سے تھا جو سعید انصاری صاحب اس زمانہ میں نکل رہے تھے لیکن شرائط کے مطابق نہونیکی وجہ سے اس پر کوئی انعام نہیں دیا جا سکتا۔

۵۔ نتیجہ خیز کہانیوں میں سب سے بہتر کہانی "افتخار" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے جو انوار خاتون صاحبہ کی ہے افسوس ہے کہ عزیزہ بہن کا پتہ ہمارے پاس محفوظ نہیں ہے۔ بہن موصوفہ کو دفتر پیام تعلیم سے پانچ روپیہ کا انعام طلب کرنے پر بھیجا جا سکتا ہے۔

آیندہ ششماہی کے انعامات

"پیام تعلیم" کی نویں جلد ختم ہونے پر ہم نے ارادہ کیا ہے کہ اپنے تمام مضمون نگاران کی عنایات و خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں قیمتی انعامات دیں، لہذا اعلان کیا جاتا ہے کہ "پیام تعلیم" کے ہر ہر شعبہ میں جن صاحب یا صاحبہ کے مضامین بہتر اور سب سے زیادہ تعداد میں وصول ہونگے، ان میں سے علیحدہ علیحدہ ہر ایک کو پانچ پانچ روپے کے انعامات دیے جائیں "پیام تعلیم" کے شعبے یہ ہیں۔

(۱) والدین اور اُستادوں کا صفحہ (۲) مذہب (۳) سائنس (۴) تاریخ (۵) جغرافیہ (۶) نظم (۷) افسانے (۸) بچوں کیلئے قصے کہانیاں۔

نوٹ:۔ مواد اور زبان دونوں کے اعتبار سے پیام تعلیم کے معیار کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ مضامین معیار سے نہ بہت بلند ہوں اور نہ پست۔

نتیجہ انعامی معمے مورخہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۰ء

پہلے معمے کا انعام جن صاحب کو ملا ہے، ان کا نام و پتہ موجود نہیں ہے، لہذا جن جن صاحبوں نے اس معمے کا حل بھیجا ہے وہ اپنے اپنے نام و پتہ سے دوبارہ مطلع فرمائیں۔

دوسرے معمے کے کل ۲۰ حل وصول ہوئے جنمیں اول انعام کے مستحق شیخ عبدالحکیم ولد شیخ عبدالحفیظ صاحب ساکن پرتاب گڑھ اور دوم انعام کے مستحق عبدالمجید صاحب ساکن بمبئی قرار پائے ہیں۔ انعامات ہر دو صاحبان کو بھیجدیئے گئے ہیں۔

نظم

دعا

ش۔ ب صاحبہ "فیضی" "پیام تعلیم" کی جید معاونین میں ہیں، آپ نے یہ منظوم دعا ہمارے پرچہ کے لئے عنایت کی ہے جسے ہم شکریہ کے ساتھ اس خاص نمبر میں شائع کرتے ہیں۔

توہی اول، توہی آخر　　توہی باطن، توہی ظاہر
توہی واحد، توہی جامع　　توہی ذاکر، توہی سامع
غفار ہے تو، ستار ہے تو　　جبار ہے تو، قہار ہے تو
رحمان توہی، رحیم تو ہے　　منان تو ہے، کریم تو ہے
ہر ذرے میں تیری ہی چمک ہے　　ماہ مبیں میں تیری ہی دمک ہے
تجھ سے پھولا پھلا ہر گلشن　　تجھ سے اختر سارے روشن
قادر تو ہے میں عاجز انساں　　تو دانا ہے میں ہوں ناداں
تو حاکم میں بندی تیری　　تو آقا میں چیری تیری

میرے آقا رحمت والے　　میرے مولا برکت والے
یارب سیدھی راہ چلا تو　　شرک سے ہر دم مجھکو بچا تو
ایسی دکھا تو راہ ہدایت　　پاس بھٹکنے پائے نہ بدعت
فخر رسل کے جاؤں میں قرباں　　جن پہ ہوا ہے نازل قرآں
حشر میں یارب انکی شفاعت　　فضل سے اپنے کیجو مرحمت
نزع میں جس دم جان ہو جاتی　　تیرا ہی کلمہ لب پہ ہو جاری
اسلام کی دولت مجھکو عطا کر　　کونین میں عزت مجھکو عطا کر
جی بیکل ہو یارب کل دے　　راحت سے کلفت کو بدل دے

فیضی کی دعا ہے میرے مولیٰ
ہر سمت بجے اسلام کا ڈنکا

جس وقت آخری کاپی پریس میں جا رہی تھی کہ جامعہ کی ایک سب سے بڑی محسن ذات علیا حضرت سلطان جہاں بیگم سابق فرمانروائے بھوپال کے ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جانے کی روح فرسا خبر پہونچی۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون

خدائے تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحومہ کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور قیامت تک رحمت نازل کرتا رہے۔

آمین ثم آمین

فہرست مضامین

جلد ۹	۲۱ر جون سنہ ۱۹۳۰ء	نمبر ۴

نمائیس یوم تاسیس

جسمیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈرائنگ جغرافیہ و تاریخ کے شعبوں نے اپنے اپنے کام کے بہترین نمونے جامعہ کو پیش کئے تھے

ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے

چونکہ مسٹر جے۔ وی۔ پٹیل نے مجلس مقننہ کی صدارت سے استعفا دیدیا ہے اس لئے گورنر جنرل نے صدر کے انتخاب کی تاریخ ۹؍ جولائی مقرر کی ہے۔

سرحدی میدان کی دوسری جانب جہاں حاجی ترنگزئی کا لشکر مقیم ہے انگریزوں نے ہوائی تاخت کی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حاجی صاحب کا لشکر ایک حد تک محفوظ رہا۔

اطلاع موصول ہوئی ہے کہ محرم کی تعطیلات کے بعد امرتسر میں بجلی گھر کا دفتر کھلنے پر بل ادا کرنے والوں کا بے حد ہجوم تھا ہر ایک شخص جلد سے جلد اپنا بل ادا کرنا چاہتا تھا۔ اسی کشمکش میں کھڑکیوں کے شیشے وغیرہ ٹوٹ گئے۔ بجلی گھر والوں نے پولس کی امداد طلب کی۔ پولس نے آکر ہجوم پر لاٹھیوں سے حملہ کیا کئی آدمی زخمی ہوئے۔ زخمیوں کا شہر میں جلوس نکالا گیا۔

محرم کے جلوس کے دوران میں ویلور میں ہندو مسلم فساد ہو گیا جس پر پولس نے گولی چلائی۔ دو اشخاص مارے گئے۔ لیکن رہنماؤں کی کوشش سے سمجھوتا ہو گیا۔

سردار سرول سنگھ جنکا مقدمہ لاہور میں چل رہا تھا انکے خلاف فرد جرم عائد کردی گئی ہے۔ سردار صاحب اپنا تحریری بیان عدالت میں پیش کرینگے۔

کلکتہ میں پچپن رضا کار ویسرائے کے جاری کردہ انسداد تخویف کے آرڈیننس کے ماتحت گرفتار کرلئے گئے تھے۔ ان میں سے سولہ رضا کارو کو بڑے بازار میں کپڑے کی دکانوں پر پکٹنگ کرنے کے الزام میں ایک ایک ماہ قید محض کی سزادی ہے۔

دہلی میں حال ہی میں جو خوفناک آتشزدگی ہوئی تھی اور کئی دوکانیں جل گئی تھیں اسکے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ کل نقصان تقریبا ۲۰ لاکھ کا ہوا ہے۔

سائمن کمیشن کی رپورٹ کی جلد اول شایع ہو گئی ہے۔ اس پر مخالفت اور موافقت میں خوب خوب تبصرے ہو رہے ہیں۔

اطلاع موصول ہوئی ہے کہ لائل پور میں ۸؍ جون کو ایک جلسہ ہو رہا تھا جس میں مقامی افسر موجود تھے۔ جلسہ گاہ میں ایک بم پھٹا لیکن کوئی زخمی نہ ہوا۔ پولس نے چوبیس آدمیوں کو گرفتار کر لیا ہے۔

لکھنؤ میں تمام باغات اور پارکوں میں فوج نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ ہر روز پانچ چھ رضا کاروں کا جلوس نکلتا ہے جو گرفتار کر لیا جاتا ہے۔

کانگریس کی مجلس عاملہ نے فیصلہ کیا ہے کہ کانگریس کا پروپگنڈا کرنے کے لئے تمام اخبارات شایع ہو سکتے ہیں۔ اور یہ کہ کسی اخبار پر پکٹنگ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ان فوجیوں کے خلاف مقدمہ شروع ہو گیا ہے جنہوں نے پشاور میں گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا۔ تمام ملزموں نے اپنا ایک متفقہ تحریری بیان دیا ہے۔

لاہور میں شراب کی دکانوں پر پکٹنگ شروع ہو گیا ہے

کوائف جامعہ

مدرسے کے سالانہ امتحانات ۷ مئی سے شروع ہوکر ۱۶ مئی ۱۹۳۰ء کو ختم ہوگئے۔ ۲۰ مئی کو نتیجہ سنادیا گیا اور اس سے اگلے دن چھٹیاں ہوگئیں اب جامعہ دو ماہ کے بعد ۲۰ اگست کو کھلے گی۔

جناب حافظ فیاض احمد صاحب مسجل مندرجہ ذیل اطلاع دیتے ہیں:۔
جامعہ کے امتحانات منعقدہ مئی ۱۹۳۰ء میں مفصلہ ذیل طلبا کامیاب ہوئے ہیں۔

جامعہ جونیر (میٹرک)

آزاد اسلامیہ ہائی اسکول اتمان زئی۔ ضلع پشاور

درجہ دوم:۔ عبدالغفور۔ عبدالحلیم

〃 سوم:۔ نورالحق۔ مقرب خاں۔ عبدالسلام۔ عبدالخالق۔ بشیر افضل خاں۔ غلام فاروق

مدرسہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ۔

درجہ دوم:۔ نذیر حسین احمد

〃 سوم:۔ سراج الہدیٰ

جامعہ سینیر

درجہ دوم:۔ بدرالدین چینی

〃 سوم:۔ مرزا عزیز اللہ بیگ

کمپارٹمنٹ:۔ عبدالواحد سندھی کو تاریخ ہند میں ضمنی امتحان دینا ہوگا۔

بی۔ اے

درجہ دوم:۔ عبدالکریم خاں۔

کمپارٹمنٹ:۔ ایم عبدالستار پشاوری کو انگریزی میں ضمنی امتحان دینا ہوگا۔

کھیل کی خبریں

آج کل آسٹریلیا کی کرکٹ ٹیم انگلستان کا دورہ کررہی ہے۔ اور مختلف ٹیموں سے میچ کھیل رہی ہے۔ ابھی تک اس ٹیم نے کہیں بھی شکست نہیں کھائی۔ ۱۳ جون کو ان کا پہلا میچ انگلستان کی منتخب ٹیم سے ہوگا چونکہ دنیا میں جہاں تک کرکٹ کا تعلق ہے صرف یہی دو ٹیمیں ٹکر کی ہیں۔ اس لئے اس کا انتظار بڑی شدت سے ہورہا ہے۔

ہر سال یورپ میں ٹینس کا ٹورنامنٹ ہوتا ہے جس میں دنیا کے تمام ممالک حصہ لیتے ہیں۔ امسال ہندوستان کی ٹیم جاپان سے ہار گئی۔ اور آسٹریلیا کی ٹیم نے انگلستان کو شکست دی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ آخری مقابلہ آسٹریلیا اور جاپان کے مابین ہوگا۔

کلکتہ میں ہر سال فٹ بال کے میچ ہوتے ہیں جن میں ہندوستانی اور فوجی ٹیمیں حصہ لیتی ہیں۔ بنگالی ان میچوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھتے ہیں اس سال عورتوں نے فٹ بال کے میدانوں پر بھی پکٹنگ شروع کردیا۔ اور ہندوستانی کھلاڑیوں سے درخواست کی کہ وہ فوجی اور انگریزی ٹیموں سے کوئی میچ نہ کھیلیں۔ ہندوستانی ٹیموں نے مجبوراً لیگ سے علیحدگی اختیار کرلی ہے۔

اس سال ہندوستان کا مشہور کرکٹ ٹورنامنٹ ——— کواڈرینگلر کرکٹ ٹورنامنٹ ——— ستمبر کے مہینہ میں پونا میں ہوگا۔

انگلستان کی منتخب کرکٹ ٹیم میں ہندوستان کے ایک مشہور کھلاڑی دلیپ سنگھ جی کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ دلیپ سنگھ جی نے سال ہی میں ایک ٹیم کے خلاف ۳۳۳ دوڑیں بنائی تھیں۔

اُستادوں اور والدین کا صفحہ

ریاضی کا جدید طریقۂ تعلیم

ریاضی کو جو اہمیت نصاب تعلیم میں حاصل ہے اسکا لحاظ کرکے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ماہرین تعلیم اور اساتذہ کرام نے خاص طور پر اس پر توجہ کی ہو گی۔ لیکن افسوس کہ جسقدر بے اعتنائی اس سے برتی گئی وہ اظہر من الشمس ہے۔ اساتذہ بجائے اسکے کہ اسکی اہمیت طلبہ کو بتلائیں اور شوق دلائیں تاکہ وہ ریاضی میں کسی اور مضمون سے کم دلچسپی نہ لیں انہوں نے اسکو مشکل بتا بتا کر انکو بددل کر دیا اور انکے دماغوں میں یہ خیال جما دیا کہ ریاضی بالکل خشک اور مشکل مضمون ہے۔ اس کو عملی دنیا سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ صرف چند ترتیب دئے ہوئے قاعدے ہیں جن کا رٹ لینا ریاضی جاننے یا یوں کہنا چاہئے کہ امتحان پاس کرنیکے لئے کافی ہے۔

اساتذہ کی اس بے راہ روی سے طالبعلموں نے سمجھ لیا کہ ریاضی ایسا مضمون ہے جسکے لئے کسی خاص دماغ کی ضرورت ہے جسکو خدائے تعالیٰ نے اسی مقصد کے لئے دنیا میں بھیجا ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طلبہ ذرا بھی دلچسپی ریاضی سے نہیں لیتے اور اسکو بوجھ سمجھتے ہیں جو انکی مرضی کے خلاف ان پر ڈالدیا گیا ہے۔ اساتذہ کرام نے اس خیال کو بجائے کم کرنیکے اور بڑھانا شروع کیا اور اسکا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا یعنے ریاضی میں طلبہ تمام مضامین سے کمزور رہنے لگے! اور انکا وقت اسکے حاصل کرنے کے بجائے دعامیں گزرنے لگا۔ کب اس مضمون سے گلو خلاصی ہوگی لیکن بیچارے چونکہ مجبور ہیں کہ میٹرک تک پڑھیں۔ اسلئے طوعاً و کرہاً انکو سیکھنا پڑتا ہے۔ اور لطف یہ کہ اساتذہ خود اسکے شاکی رہنے لگے کہ طلبہ محنت نہیں کرتے اس لئے وہ کمزور رہتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم نے اس کمزوری کو کبھی دور کرنے کی کوشش بھی کی اور کیا کبھی اسکا خیال کیا کہ جتنا وقت طلبہ کے سامنے ریاضی کو مشکل بتا بتا کر ڈرانے میں صرف کرتے ہیں۔ اس کا آدھا وقت بھی اسکے دلچسپ بنانے میں صرف کیا۔ نہیں کیا اور یقیناً نہیں کیا تو پھر شکایت ہی کس بات کی نظم و ترتیب کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ اسکو اس طریقے سے پڑھایا جاتا ہے کہ گویا کہ اسکو ایک دوسرے سے بالکل تعلق ہی نہیں۔ ایک قاعدے کے بعد دوسرا قاعدہ سکھایا جاتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ ان دونوں میں کوئی گہرا تعلق ہے بلکہ اسلئے کہ یہ دونوں قاعدے ہیں اور ہیں ریاضی ہی کے۔ رہ گیا تعلق کا تلاش کرنا یہ تضییع اوقات ہے۔ علاوہ اسکے ریاضی کا بالعموم اور حساب کا بالخصوص دنیا کے روزمرہ کے کاموں سے بالکل تعلق ہی نہیں رکھا جاتا۔ طالب علم تو طالبعلم استاد خود یہ سمجھتا ہے کہ ان قاعدوں کو روزمرہ کے کاموں سے کیا تعلق۔

حالانکہ جس شد و مد سے ریاضی کے پڑھانے پر اصرار کیا جاتا ہے۔ اور جو اس مضمون کو کچھ جانتے ہیں وہ یہانتک کہنے سے بھی نہیں چوکتے کہ ریاضی تمام مضامین میں بہتر ہے مگر یہ عجیب بات ہے کہ اسکی تشریح نہیں کی جاتی کہ یہ بہتر کس لحاظ سے ہے۔ آیا اس لحاظ سے ہے کہ ہم نے اسکو بہتر سمجھ رکھا ہے۔ یا زندگی کے کسی شعبہ سے کوئی گہرا تعلق بھی ہے جسکو عام آدمی نہیں سمجھ سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ریاضی واقعی اہم ہے اور واقعی ہے تو ضرور ہے کہ ان اسباب کو تلاش کیا جائے جنہوں نے اسکو اہم بنایا ہے اور جہانتک میرا خیال ہے وہ یہ ہے کہ شعبۂ زندگی سے جسقدر ہو سکے تعلق رکھا جائے اور طالبعلم اسکو بجائے اسکے کہ ایک بے کار اور مشکل مضمون اور معمہ سمجھے جو امتحان پاس کرنے کے لئے اسکی بدقسمتی سے ضروری قرار دیا گیا ہے وہ سمجھے کہ اسکا تعلق عام روزمرہ کے حالات سے بہت زیادہ ہے اور اسکے جاننے سے اپنے دماغ کو صرف فرحت نہیں بخشتا بلکہ اپنے عام کاموں میں بھی بہت مدد لیتا ہے۔ وہ حساب صرف اسلئے نہیں سیکھتا کہ وہ ایک امتحان پاس کرے بلکہ اس لئے کہ وہ اس میں اپنا فائدہ سمجھتا ہے۔

ہندوستان جہاں اور چیزوں پر توجہ کم کیجاتی ہے وہاں تعلیم کو بھی بے توجہی سے محروم رکھا جاتا ہے۔ غیر ممالک میں ہزاروں کتابیں تعلیم پر لکھی جاتی ہیں اور یہ کوشش کیجاتی ہے کہ جسقدر ہو سکے ہر مضامین کو آسان سے آسان تر بنا دیا جائے۔ اسکا نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور وہاں لوگ ایک حد تک تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اور ان خشک مضامین میں وہ جدت طرازیاں کہ انکی محنت کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ مشکل سے مشکل مضامین کو اسقدر آسان کر دیا کہ انکو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ مگر ہمارا ہندوستان جہاں ۵۰ برس پہلے تھا وہیں اب بھی ہے۔ اس پر اور کچھ اثر ہوا ہو لیکن تعلیم کے متعلق وہی جمود ہے اور جن

طریقۂ تعلیم کو غیر ممالک کے لوگوں نے فرسودہ اور اچھا نہ سمجھکر چھوڑ دیا ہے اسکو ہندوستانی اختیار کرکے سمجھتے ہیں کہ ہم بھی اوج ترقی پر پہنچگئے۔ یہاں کے ماہرین تعلیم اسکی ضرورت ہی نہیں سمجھتے کہ تعلیم کے لئے انکو کچھ کرنا ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کرتے ہیں کہ طلبہ کے دماغ کی نفسیاتی تشریح کردی اور کہا کہ ان باتوں کا اگر لحاظ رکھا جائے تو طالب علم بہت جلد ترقی کرے گا۔ اس ضمن میں مختلف باتیں بتلاتے ہیں مثلاً مضامین کو دلچسپ طریقے سے پڑھانیکی کوشش کرنا۔ ہر مضمون کے پڑھانے کے لئے آسان سے آسان طریقہ اختیار کرنا وغیرہ۔ مگر بدقسمتی سے وہ اسکے بتلانے کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ وہ آسان طریقہ آخر ہو کیا اور کسی مضمون کو دلچسپ کس طرح بنایا جائے۔ وہ عملاً کسی مضمون کو لے کر ان طریقوں کے بتلانے کی تکلیف گوارا نہیں کرینگے بلکہ وہ ایک عام اصول بیان کردینگے حالانکہ اگر وہ غور کریں اور ذرا اپنے ذاتی تجربہ سے کام لیں تو انکو معلوم ہوگا کہ انھوں نے جتنی باتیں کہی ہیں اسکو ہر شخص جو ذرا بھی تعلیمی معاملہ میں شد بد رکھتا ہے جانتا ہے۔ مگر اس پر عمل کرنے کیلئے کوئی ہدایت نامہ نہیں پاتا۔ مثال کے طور پر کسی مضمون کو لیجئے۔ ہندوستان کے ماہرین تعلیم نے کبھی عملاً اس مضمون کو آسان اور دلچسپ بنا کر دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا اور شاید اور مضامین پر کچھ کوشش بھی کی ہو۔ لیکن کم از کم ریاضی جو زیادہ توجہ کا محتاج تھا انکی اس بے توجہی سے نالاں رہا اور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے طلبہ میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو غیر ممالک کے طلبہ میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ ریاضی کی خصوصیات میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ریاضی سے استخراج نتائج کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ریاضی کے موجودہ طریقۂ تعلیم نے اس خصوصیت کو طلبہ میں پیدا نہیں کیا بلکہ یہ خیال بھی پیدا نہیں ہونے دیا کہ اس سے سوائے دماغی تفریح کے یہ بھی کام لیا جاسکتا ہے۔ غرضکہ اس بے توجہی اور جمود نے ہندوستانی بچوں کو بہت سخت نقصان پہنچایا اور تعلیم کا مطمع نظر امتحان پاس کرلینے تک رہ گیا۔ یہ ضرور ہے کہ حکومت نے اس خیال کو پیدا کرنے میں مدد دی۔ لیکن آخر ہم ایسے بھولے کیوں بن گئے کہ غیر ملکی حکومت ہمارے فائدہ کے لئے وہ تمام کچھ کریگی جسکی ہم کو ضرورت ہے۔ اگر حکومت نے آپ کو آپ کے مقصد حاصل کرنے میں مدد نہ دی تو نہ دے یہ تو آپ کا فرض تھا کہ آپ اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہوں اور آزاد تعلیمی ادارہ قایم کریں اور اسکے ذریعہ سے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کریں

(باقی)

(بقیہ مضمون صفحہ ۵) نمازی یہی تو کرتا ہے کہ پہلے سب دنیا سے قطع تعلق کرکے اس منعم حقیقی کیطرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور دنیا کے سب کام اپنے اوپر حرام کر لیتا ہے پھر ادب سے دست بستہ کھڑا ہوجاتا ہے اور دل کی تعظیم کو زبان پر لاتا ہے اور اپنے خالق سے اپنے دنیوی اخروی سعادت کیلئے کچھ عرض معروض کرتا ہے اور باہم خطاب کا سلسلہ جاری رہتا ہے اسی دوران میں جب اپنے ولی نعمت کے کمال عظمت اس پر ظاہر ہوتی ہے اور بھی زیادہ تعظیم شروع ہوتی ہے۔ اور سر کو اسکے سامنے جھکا دیتا ہے کیونکہ سر کا ملبند ہونا ایک قسم کے تکبر کی علامت اور جھکنا انکساری اور خاکساری کی علامت ہے اور جب جھکے ہوئے زبان پر اسکی عظمت کا تذکرہ خوب زور شور سے ہوتا ہے تو اب دل چاہتا ہے کہ نہایت درجہ کی تعظیم کروں اور اپنی کامل خاکساری کو اسکے سامنے پیش کروں اور سب سے اشرف عضو کو یعنے چہرے اور ہاتھ کو اسکے سامنے زمین پر رکھدوں اور ایک دفعہ پر صبر نہیں بلکہ بار بار رکھنا چاہتا ہے۔ اور دنیا میں بھی بادشاہوں کے دربار میں یہی تین طریقے تعظیم کے برتے جاتے ہیں۔ کبھی خدام خاص دست بسینہ حضوری میں کھڑے رہتے ہیں اور کبھی جھکتے ہیں اور کبھی زمین چومتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ نماز کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے خالق اور محسن کا کامل شکریہ ادا کیا جاوے اور ہر عقل سلیم والا محسن کے شکریہ کو مناسب بلکہ فرض اور لازم تجویز کرتا ہے۔ تو اگر حق تعالے نے ہم پر اپنا شکریہ فرض کیا اور وقتاً فوقتاً ہم سے طلب کیا تو یہ نہایت قرین قیاس اور معقول ہے۔ اور پھر اس نے اپنے شکریہ کا طریقہ اپنے نبی کے ذریعے سے بتلایا تو یہ تو اس کا اور بھی احسان ہے۔ اور اسکا مستقل شکریہ ہونا چاہئے اور اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے۔ دنیا میں پاک اور صاف رہیں اور اپنے آقا کو راضی کریں۔ اور آخرت میں ناشکری اور نمک حرامی کے الزام سے بچیں۔

والحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید
الانبیاء والمرسلین
واٰلہ وصحبہ
اجمعین

مذہب

شاہی دربار میں حاضری

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

(۱) اس میں کوئی شک نہیں کہ حق تعالیٰ کی طرف سے حضرت انسان پر ہزاروں احسان اور انعام کئے گئے ہیں اور وہ اس قدر کثرت کے ساتھ ہیں کہ اگر کوئی گننا چاہے تو گننا مشکل ہو جاوے۔ سب سے پہلی اور بڑی نعمت یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اسکو بالکل نیست سے ہست کیا اور پھر ایسی شکل وصورت دی کہ دنیا کی سب ہستیوں سے بہتر اور برتر ہے۔ اس کی وضع قدوقامت اٹھنے بیٹھنے اور کردار وگفتار پر نظر کیجئے اور دوسرے جانداروں کو بھی ملاحظہ فرمایئے تو معلوم ہوگا کہ اسکی ہر ادا دوسروں سے نرالی اور بہتر ہے اور دنیا میں کوئی جاندار اسکے مقابلہ کا نہیں۔ اور اگر آپ دنیا پر ذرا غور سے نظر ڈالیں گے تو یہ معلوم ہوگا کہ جتنی چیزیں ہیں سب حضرت انسان کے تابع اور اسی کے فائدے کے لئے بنائی گئی ہیں۔ آسمان زمین آفتاب مہتاب، ہوا پانی آگ ان سب کو ہمارے لئے پیدا کیا اگر یہ نہ ہوتے تو ہمارے پھل پھول اور آرام کے لئے رات معاش کیلئے دن یہ سب کہاں سے آتے اور ہماری زندگی کی تمام ضروریات کہاں سے پوری ہوتیں۔ غرضکہ دنیا کی سب چیزیں اسکے لئے بنائی گئی ہیں اور اسکو ان سب کا مالک اور متصرف بنایا گیا ہے اور اگر اسکے پتلے پر نظر ڈالئے تو بہتیرا کام کی چیزیں حق تعالیٰ نے اسکے اندر ودیعت فرمائی ہیں۔ دیکھنے کیلئے آنکھ چکھنے کیلئے زبان سونگھنے کیلئے ناک سننے کیلئے کان سمجھنے کیلئے عقل دی ہے یہ سب بڑی بڑی نعمتیں ہیں صرف آنکھ کو لیجئے اگر نہ ہو تو ساری دنیا گھپ اندھیرا ہو۔ سیاہ وسفید کی تمیز نہ ہو۔ اگر آپ کو اسکے نعمت ہونے میں کچھ تامل ہے تو اندھے سے دریافت کیجئے وہ اقرار کرے گا کہ یہ بہت بڑی نعمت ہے اور اگر زبان کے نعمت ہونے میں کچھ تامل ہے تو گونگے کی حالت کو ملاحظہ کر سکتے ہیں اسکی زبان حال آپکو بتلائے گی کہ یہ بیشک بے مثل نعمت ہے مشہور مثل ہے "قدر عافیت کسے داند کہ بمصیبتے گرفتار آید" اور عقل تو ایسی بڑی نعمت ہے کہ اسکے ذریعہ سے انسان اور حیوانات سے ممتاز ہے۔ اگر یہ نعمت ہم کو عطا نہ ہوتی تو ہم میں اور دوسرے حیوانات میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ ہم میں جتنی قوتیں رکھی ہیں ان سب کی رئیس اور بادشاہ عقل ہے جسطرح انسان کو حق تعالیٰ نے ساری چیزوں پر حکمران بنایا ہے اسی طرح بدن کی ساری قوتوں پر اس کو حاکم بنایا ہے غرضکہ تھوڑے سے سوچ بچار کے بعد آپ کو یقینی طور سے معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ کیطرف سے انسان کو بے شمار نعمتیں ملی ہیں۔

(۲) سب عاقل مسلمان ہوں یا کافر اس پر متفق ہیں کہ احسان والے کا شکریہ ادا کرنا فرض اور ضروری ہے۔ ہر ایک نعمت کے مقابلہ ایک شکریہ ہونا چاہئے۔ اور اگر کسی کو شکریہ کا طریق معلوم نہ ہو کہ نعمت کا شکریہ کس طور سے ادا کروں اور وہ احسان والا اسکو طریقہ بتلا دیوے کہ یوں شکریہ ادا کرو تو یہ اسکی طرف سے ایک اور بڑا احسان ہوگا جس کا اس پر ایک شکریہ الگ واجب ہوگا۔

(۳) اسکے بعد سمجھ لینا چاہئے کہ جتنے عبادات اور فرائض حق تعالیٰ نے ہم پر مقرر کئے ہیں یہ سب اسکے شکریہ کے طریقے ہیں جو کہ اس نے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے ہم کو بتلائے ہیں اور ان میں سب سے بڑا شکریہ نماز کی شکل میں ادا کیا جاتا ہے۔ اور نماز کو ہم نے بڑا شکریہ کیوں کہا۔ اسلئے کہ دنیا میں جب کسی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے تو کبھی تو احسان والے کی زبان سے تعریف کرتے ہیں اور نہایت شستہ الفاظ کے ساتھ یا نظم کی شکل میں اسکی مدح کیجاتی ہے اور کبھی ہاتھ پیر سے نعمت والے کا کوئی کام انجام دیتے اور خدمت کرتے ہیں۔ اور کبھی دل سے ادا کیا جاتا ہے کہ دل کو اسکے اور منقاد کرے اور دل سے اسکے احسان کا اقرار کرے اور دل میں اس کا ادب اور عظمت رکھے۔ تو شکریہ کے کل یہ تین طریق ہیں۔ اب سب سے بڑا شکریہ وہ ہوگا جس میں یہ تینوں طریقے پائے جاتے ہوں جیسے کہ متنبی شاعر کامل شکریہ کا اظہار کرتے ہوئے اپنے احسان والے کو خطاب کرتا ہے ؎

افادتکم النعماء منی ثلاثۃ ؎ یدی ولسانی والضمیر المحجبا

آپکے احسانات نے آپکو میری تین چیزوں کا مالک بنایا یعنی ہاتھ اور زبان اور چھپے ہوئے دل کا

نماز کی حقیقت بھی یہ ہے کہ انسان اپنے دل کو حق تعالیٰ کی عظمت وجلال کے سامنے نہایت منقاد اور ذلیل کرے اور دل سے نہایت تعظیم بجا لائے اور جو تعظیم خداوندی اسکے دل میں بھری ہوئی ہے اس کا اظہار زبان سے بھی کرے اور اس بات کا اقرار کرے کہ سب تعریفیں تجھی کو سزاوار ہیں اور ہاتھ پیر سارے اعضا کو بھی حرکت میں لائے تاکہ پورا شکریہ ادا ہو اور بدن کا ہر ٹکڑا اس میں حصہ دار بنے اور سب کی طرف سے شکریہ ادا ہو۔

(باقی صفحہ ۴ کالم دوسرا)

سائنس

سورج کی کرنیں

سلیم صبح ہی صبح ٹہلنے کے لئے نکل جاتا۔ پانچ چھ میل چلنا اس کا معمول تھا۔ صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے عجیب فرحت پہنچاتی۔ سرسبز کھیتوں کو دیکھتا، باغوں کو دیکھتا اور شاداں و فرحاں مکان واپس لوٹتا۔

ایک دن وہ ٹہلنے کے لئے نکلا ہی تھا کہ اتفاقاً اسکے مدرسہ کے استاد اسے ملگئے سلیم کو نئی نئی باتوں کے پوچھنے کا شوق تھا اور اسے یہ موقعہ بھی اچھا مل گیا تھا۔ لہذا اس نے ماسٹر صاحب سے کہا۔ ماسٹر صاحب آج آفتاب کی کرنوں کے متعلق کچھ بتائیے۔

ماسٹر صاحب سلیم، سورج کی کرنوں کو تم نے بہت دفعہ دیکھا ہوگا کیسی پیاری اور خوبصورت معلوم ہوتی ہیں۔ افسردہ دل انکو دیکھ کر باغ باغ ہوجاتے ہیں۔ سرد ممالک کے لئے تو بالخصوص یہ عجیب نعمت ہیں۔ انگریزی زبان میں کرن خوشی اور چونچالی کا مترادف ہے۔ انگریز جب کسی لڑکی کو چستی و چالاکی سے کام کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ لڑکی تو سورج کی کرن ہے۔ جاہلوں کو تو جانے دو۔ پڑھے لکھے لوگ بھی ایسے بہت کم نکلیں گے جو شعاعوں کی ٹھیک اصلیت بتائیں۔ تمہیں کسی دن اندھیرے منہ علی الصبح اٹھنے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ تم نے آفتاب کی روشنی آہستہ آہستہ پھیلتے ہوئے دیکھی ہوگی۔ پہلے تو تمہیں کمرہ کی بڑی بڑی چیزیں نظر آئی ہونگی۔ وہ بھی کچھ دھندلی دھندلی۔ پھر رفتہ رفتہ تمہیں چھوٹی چیزیں دکھائی دی ہونگی۔ ہے نہ۔ بتاؤ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

سلیم۔ اس لئے کہ سورج طلوع ہوتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھتا ہے

ماسٹر صاحب۔ دیکھو تم نے بھی غلطی کی۔ یہ وجہ نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ زمین گھومتی ہے اور زمین ہی کی گردش رفتہ رفتہ ہمارے اس چھوٹے سے خطۂ زمین کو آفتاب کے سامنے لاتی ہے اور اسکی کرنوں سے فیضیاب ہوتی ہے۔ تجربہ کے لئے ایک چھوٹا سا گلوب لو اور دہلی کے اوپر سیاہ کاغذ کا ایک پرزہ چپکادو۔ اسکے پاس ہی ایک لیمپ روشن کرکے رکھ دو۔ اس گلوب کو آہستہ آہستہ گھماؤ تم دیکھو گے کہ اول تو اس کاغذ پر لیمپ کی وہ شعاعیں پڑینگی جو گلوب کے اس پہلو پر سے ہوکر آئیں گی جو لیمپ کے ٹھیک بالمقابل ہوگا۔ پھر آہستہ آہستہ تمام کاغذ منور ہوجائے گا۔

چونکہ سورج تمام کرنوں کا منبع ہے۔ لہذا میں اسکے متعلق بھی تمہیں کچھ بتادوں۔ اگر سورج ایک تاریک جسم ہوتا اور یہ شعاعیں ہم تک نہ پہنچتیں تو جانتے ہو کیا ہوتا۔ سخت سردی پڑتی۔ ایسی سخت کہ تم خیال نہیں کرسکتے۔ پانی بخارات بنکر نہ اڑتا۔ بارش کبھی نہ ہوتی۔ دریاؤں کی روانی ختم ہوجاتی۔ نہ نباتات میں قوت نمو باقی رہتی نہ حیوانات میں جان۔ سوائے یخ اور برف کے کچھ نہ ہوتا۔ شاید اب تم سورج کی کچھ اہمیت سمجھ گئے ہوگے۔ اچھا بتاؤ تو سورج ہم سے کسقدر فاصلہ پر ہے؟

سلیم۔ بہت دور، اتنا دور کہ میں بتا نہیں سکتا۔

ماسٹر صاحب۔ سردیوں کے موسم میں تو سورج ہمیں بہت دور دکھائی دیتا ہے۔ لیکن گرمیوں میں جب مطلع صاف ہو تو سورج ہمیں بہت قریب دکھائی دیتا ہے۔ بس ایک سیڑھی لگائی اور وہاں پہنچ گئے۔ لیکن یہ سنکر تمہاری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہیگی کہ سورج ہم سے ۹ کروڑ دس لاکھ میل کے فاصلہ پر ہے۔

سلیم۔ اف اتنا فاصلہ۔

ماسٹر صاحب۔ ہاں ذرا سوچو۔ اگر تم تیز ریل گاڑی میں بیٹھو جو ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلے اور کسی اسٹیشن پر بھی نہ ٹھیرے تو تم ۱۷۵ برس میں سورج تک پہنچوگے۔ گویا کہ اگر تم چاہو کہ آج ۲۱ رجون ۱۹۳۰ء کے دن سورج تک پہنچ جاؤ تو تمہیں چاہئے تھا کہ پلاسی کی لڑائی کے فوراً ہی بعد ریل پر سوار ہوجاتے اور آجتک برابر چلتے رہتے۔ مسلمانوں کے زوال پر چار آنسو بہاتے، غدر کے خونچکاں واقعات دیکھتے، اور ہندوستان کی آج کل کی حالت پر تاسف کرتے تو اسوقت منزل مقصود پر پہنچ گئے ہوتے

(باقی)

جغرافیہ

مملکت سیام

دنیا میں مختلف ممالک ہیں اور ہر ملک کے باشندوں کا طرزِ بود و باش الگ الگ ہے۔ کسی ملک میں ریلیں نہیں ہیں اور کسی دوسرے ملک میں انکی اتنی کثرت ہے کہ زمین کے نیچے بھی ادھر اُدھر بھاگتی پھرتی ہیں جس ملک کا آج ہم تمہیں حال سنائیں گے وہاں ایک بھی ریل نہیں اور سارا کاروبار دریا ہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔

ملک سیام کے مشرق اور شمال مشرق میں فرانسیسی ہند چینی، مغرب اور شمال مغرب میں برما اور جنوب میں ملایا واقع ہے۔ سیامی عموماً نہایت سادہ، خوش خلق، کفایت شعار اور مہمان نواز لوگ ہیں۔ یہ اپنے ملک کو "مانگ تھائی" کہتے ہیں۔ جسکے معنے ہے آزاد ملک۔

آج سے چالیس برس پیشتر اس ملک میں سڑکوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔ پکی سڑکیں تو خیر بڑی بات ہے کچی سڑکیں بھی بس نام کو دو تین تھیں۔ موجودہ زمانہ میں بڑے بڑے شہروں میں کچھ سڑکیں بن گئی ہیں۔ لیکن بہت ہی کم۔ سیام میں آمد و رفت کا سب سے بڑا ذریعہ دریائے مینام ہے۔ جو تمام ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ تمام کاروبار دریا اور کشتی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس شہر کو مشرق کا وینس کہتے ہیں۔

کسی اجنبی اور سیاح کیلئے ملک سیام میں سب سے دلچسپ چیز "واٹ" ہے۔ "واٹ" ایک بہت بڑے احاطہ کو کہتے ہیں جسکے چاروں طرف بلند دیواریں ہوتی ہیں۔ اس احاطہ میں مندر اور پجاریوں کے رہنے سہنے کے مکانات کے علاوہ پر فضا باغات بھی ہوتے ہیں۔ دن رات "واٹ" میں بس میلا سا لگا رہتا ہے عورتیں اور مرد صبح ہی صبح مہاتما بدھ کے سامنے چڑھاوا چڑھانے کیلئے چاول اور دوسری چیزیں لاتی ہیں۔ خوش عقیدہ لوگ ہزاروں میل کا پیدل سفر طے کرکے یہاں آتے ہیں اور اپنی مرادیں بیان کرتے ہیں۔ شام کو شہر بھر کے بے فکرے تفریح کیلئے باغات میں جمع ہوتے ہیں۔ کہیں گانا ہوتا ہے کہیں ہنسی مذاق۔ رات ہوتے ہی تمام لوگ عبادت کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ اور اس وقت عجیب سماں ہوتا ہے۔ ان پر فضا اور خوبصورت باغات میں کتے بلیاں اور دوسرے جانور بھی رہتے ہیں کیونکہ بدھ مت میں کسی جاندار کو مارنا منع ہے۔ مندر کے قواعد و قوانین کے مطابق کوئی پجاری بھی استرے سوئی دھاگہ اور کٹورے کے سوا کوئی چیز نہیں رکھ سکتا۔ مندر کے دروازے کے باہر کئی لوگ سبز پتے بیچنے والے ہوتے ہیں۔ ہر ایک جانے والے کو کم از کم ایک سبز پتہ خریدنا ضروری ہے۔ اجنبی اور سیاح بھی اس قاعدہ سے مستثنےٰ نہیں ہیں۔

بنگ کاک سیام کا دار الخلافہ ہے۔ اس شہر کے بازار لانبے چلے گئے ہیں دوکانیں اکثر بانس کی بنی ہوتی ہیں۔ ان بازاروں میں ہر قسم کا سامان ملسکتا ہے۔ چونکہ سیامی بڑے کفایت شعار ہوتے ہیں اس لئے ہر دکان سے آپ کو بیسیوں چیزیں مل جائینگی۔ مثلاً درزی نہ صرف کپڑا سیتے ہیں بلکہ دوسری چیزیں بھی بیچنے کے لئے اپنی دکانوں پر رکھتے ہیں۔ ہر دکان میں مہاتما بدھ کے چھوٹے بڑے مجسمے ضرور ہوتے ہیں۔ اور اگر کسی دکان میں کوئی مجسمہ نہ ہوا تو وہ دوکاندار منحوس سمجھا جاتا ہے۔ سیام میں حجامت کا طریقہ بھی عجیب ہے۔ بال قینچی سے نہیں کاٹے جاتے بلکہ ایک لانبا سا اوزار ہوتا ہے جس سے ایک ایک بال نکالا جاتا ہے۔ اس طریقہ سے بہت سا وقت ضایع ہوتا ہے۔

ملک کا وہ حصہ جس جگہ دریا نہیں ہے وہاں ہاتھی بڑا کام دیتا ہے۔ اسلئے سیامی ہاتھی کو بڑی وقعت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ بنگاک سے چالیس میل کے فاصلہ پر ایک شہر "اتھویا" ہے جو سیام کا قدیم دار السلطنت تھا۔ اس شہر کے قرب و جوار کے جنگلوں میں ہاتھی بکثرت پائے جاتے ہیں جنگلوں، دشوار گزار مقاموں اور ان جگہوں میں جہاں دریا نہیں جاتا یہ ہاتھی بڑا کام دیتے ہیں۔ بڑے بڑے شہتیر اور درخت اپنی سونڈ سے اٹھاتے ہیں اور مسافروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔

سیامی بڑے اچھے تیراک و غواص ہوتے ہیں بچے اور عورتیں تک تیرنا جانتے ہیں۔ مچھلیاں پکڑنے کا انکے ہاں عجیب طریقہ ہے۔ ایک بڑا سا پھیسہ پانی میں لگا دیتے ہیں اور اسمیں جال باندھ دیتے ہیں پھر لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر ڈھول بجاتے اور شور کرتے ہیں مچھلیاں ڈر کر پھیسہ کیطرف آتی ہیں اور جال میں پھنس جاتی ہیں۔

تاریخ

الفرڈ نوبل

نوبل پرائز کا ذکر تو آپ نے اکثر اخباروں میں پڑھا ہوگا لیکن بہت کم بھائیوں کو معلوم ہوگا کہ نوبل کون تھا اور اس نے کیوں یہ انعام مقرر کیا تھا۔

نوبل کا پورا نام الفرڈ نوبل تھا۔ اس کا باپ ملک سویڈن کا رہنے والا اپنے زمانہ کا مشہور انجینیر تھا۔ اس نے کئی اچھی اچھی چیزیں ایجاد کی تھیں لیکن اس پر بھی جب اس کے وطن میں اس کی قدر نہ ہوئی تو وہ تمام خاندان کو ساتھ لے کر روس چلا گیا اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

الفرڈ نوبل بچپن ہی سے کلوں اور مشینوں کو دیکھا بھالا کرتا تھا اور ان کاموں میں بے حد دلچسپی لیتا تھا۔ اس کے باپ نے اسکی یہ دلچسپی اور شوق دیکھ کر اس کو جان ارسکن کے پاس امریکہ بھیج دیا تا کہ الفرڈ نوبل اسکی شاگردی میں رہ کر زیادہ تجربہ حاصل کرے۔ جان ارسکن بھی سویڈن ہی کا رہنے والا تھا اور زمانہ کی ناقدری کا شکار ہو کر امریکہ چلا گیا تھا۔ امریکہ میں جاکر اس نے بڑی شہرت حاصل کر لی تھی۔ امریکہ پہونچکر نوبل بہت جلد شاگردی کا زمانہ ختم کر کے اپنے استاد کو مدد دینے لگا۔ جان ارسکن نے نوبل کے متعلق اخباروں میں مضامین لکھکر اسے بہت مشہور کر دیا۔

چار سال کے بعد الفرڈ نوبل روس واپس لوٹا۔ اس زمانہ میں کوئی ایسی چیز معلوم نہیں ہوئی تھی جو چیزوں کو بھک سے اڑا دیتی۔ الفرڈ نوبل نے اس چیز کو معلوم کرنے کے لئے کئی تجربے کئے آخر ایسی ترکیب نکالی جس سے نائٹرو گلیسرین حاصل ہوئی۔

اس کامیابی کی خبر سنکر سویڈن کی حکومت نے الفرڈ نوبل کو وہاں بلا لیا اس کو وہاں بہت سی زمین مل گئی اور باپ بیٹوں نے ملکر ایک کارخانہ قایم کیا۔ دو سال تک بڑی کامیابی کے ساتھ کارخانہ چلتا رہا۔ لیکن آخر ایک افسوسناک اور خوفناک واقعہ پیش آیا۔ آگ لگ جانے سے سارا کارخانہ بھک سے اڑ گیا۔ کئی آدمی مر گئے۔ الفرڈ نوبل کا باپ اندھا اور اپاہج ہو گیا۔ اس کے چھوٹے بھائی کی جان بھی اسی میں ضایع ہوئی۔ اس پر بھی الفرڈ نے ہمت نہیں ہاری اور کام جاری رکھنے کا عزم کر لیا لیکن اسے کہیں زمین نہیں ملتی تھی آخر الفرڈ نے ایک بڑی سی کشتی بنوائی اور اسے اسٹاک ہوم سے چند میل کے فاصلہ پر ایک جھیل میں باندھکر وہاں کارخانہ قایم کیا اور وہیں ایک دوسری چیز تیار کی جسے دنیا ڈائنامیٹ کہتی ہے! اسکے بعد ہر ملک میں اس نے کارخانے کھولدئے۔ یہ چیز جنگ میں بے حد مفید ثابت ہونے والی تھی اس لئے الفرڈ اب ساری دنیا میں مشہور ہو گیا۔

لیکن اس وقت اسکی زندگی میں ایک واقعہ کی وجہ سے تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اسی زمانہ میں اسٹریا کے ایک جرنیل کی لڑکی نے ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا "ہتھیار کھول ڈالو" اس کتاب میں جنگ کی برائیوں اور تباہیوں کا تذکرہ تھا اور یہ تذکرہ بڑے دردناک الفاظ میں کیا گیا تھا۔ جب نوبل نے اس کتاب کو پڑھا تو اس پر بے حد اثر ہوا۔ جنگ کو خوفناک بنانے کے لئے اس نے دو چیزیں ایجاد کی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ دنیا ان چیزوں کو بھول جائے۔ لیکن دنیا کیسے بھولتی۔ ہر ایک کو انکی ترکیب معلوم تھیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ جتنا نقصان ان دو چیزوں کے ایجاد کرنے سے دنیا کو پہنچا ہے اس کی حتی الامکان تلافی کیجائے اس لئے اس نے اپنی دولت میں سے نوے لاکھ ڈالر دنیا کے اچھے کاموں میں صرف ہونے کے لئے وقف کر دئے۔ یہ دولت پانچ حصوں میں تقسیم کی گئی۔ ہر حصہ کی آمدنی تقریباً چالیس ہزار سالانہ ہوتی ہے۔ سال میں جو اشخاص صلح، علم کیمیا، علم طبیعیات، علم طبابت اور علم ادب کی ترقی کے لئے دوسروں سے بازی لے جاتے ہیں انہیں یہ انعام ملتے ہیں۔ علم ادب کا انعام ہندوستان کے مشہور شاعر ڈاکٹر ٹیگور کو بھی مل چکا ہے۔

قصے کہانیاں

ابّو خاں کی بکری

ہمالیہ پہاڑ کا نام تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ اس سے بڑا پہاڑ دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ ہزاروں میل چلا گیا ہے۔ اور اونچا اتنا ہے کہ ابھی تک اسکی اونچی چوٹیوں پر کوئی آدمی نہیں پہونچ پایا۔ اس پہاڑ کے اندر بہت سی بستیاں بھی ہیں۔ ایسی ہی ایک بستی الموڑہ بھی ہے

الموڑہ میں ایک بڑے میاں رہتے تھے۔ ان کا نام تھا ابّو خاں انھیں بکریاں پالنے کا بہت شوق تھا۔ اکیلے آدمی تھے۔ بس ایک دو بکریاں رکھتے۔ دن بھر انھیں چراتے پھرتے۔ انکے عجیب عجیب نام رکھتے۔ کسی کا کلو، کسی کا منگلیا، کسی کا گوجری، کیسکا حکمہ، ان سے نہ جانے کیا باتیں کرتے رہتے۔ اور شام کے وقت بکریوں کو لاکر گھر میں باندھ دیتے۔ الموڑہ پہاڑی جگہ ہے اس لئے ابّو خاں کی بکریاں بھی پہاڑی نسل کی ہوتی تھیں۔

ابّو خاں غریب تھے بڑے بدنصیب۔ انکی ساری بکریاں کبھی نہ کبھی رسی تڑا کر رات کو بھاگ جاتی تھیں۔ پہاڑی بکری بندھے بندھے گھبرا جاتی ہے۔ یہ بکریاں بھاگ کر پہاڑ میں چلی جاتی تھیں۔ وہاں ایک بھیڑیا رہتا تھا وہ انھیں کھا جاتا تھا۔ مگر عجیب بات ہے نہ ابّو خاں کا پیار نہ شام کے دانہ کا لالچ، ان بکریوں کو بھاگنے سے روکتا تھا، نہ بھیڑیے کا ڈر بس شاید یہ بات ہو کہ پہاڑی جانوروں کے مزاج میں آزادی کی بہت محبت ہوتی ہے۔ یہ اپنی آزادی کسی داموں دینے کو راضی نہیں ہوتے اور مصیبت اور خطروں کے باوجود آزاد رہنے کو آرام اور آسایش کی قید سے اچھا جانتے ہیں

جہاں کوئی بکری بھاگ نکلی اور ابّو خاں بیچارے سر پکڑ کر بیٹھ گئے انکی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ ہری ہری گھاس میں انھیں کھلاتا ہوں چھپ چھپا کر پڑوسیوں کے دھان کے کھیت میں بھی انھیں چھوڑ دیتا ہوں، شام کو دانہ دیتا ہوں، مگر یہ کمبخت نہیں ٹھہرتیں اور پہاڑ میں جاکر بھیڑیے کو اپنا خون پلانا پسند کرتی ہیں۔

جب ابّو خاں کی بہت سی بکریاں یوں بھاگ گئیں تو بیچارے بہت اداس ہوئے اور کہنے لگے اب ایک بکری نہ پالونگا۔ زندگی کے تھوڑے دن اور رہیں بے بکریوں ہی کے کٹ جائیں گے۔ مگر تنہائی بری چیز ہے تھوڑے دن تو ابّو خاں بے بکریوں کے رہے۔ پھر نہ رہا گیا۔ ایک دن کہیں پر ایک بکری خرید لائے۔ یہ بکری ابھی بچہ ہی تھی کوئی سال سوا سال کی ہوگی پہلی دفعہ بیاہی تھی۔ ابّو خاں نے سوچا کہ کم عمر بکری لونگا تو شاید ہل جائے اور لے جب پہلے ہی سے اچھے اچھے چارے دانے کی عادت پڑ جائیگی تو پھر یہ پہاڑ کا رخ نہ کریگی۔ یہ بکری تھی بہت خوبصورت۔ رنگ اسکا بالکل سفید تھا بال لمبے لمبے تھے۔ چھوٹے چھوٹے کالے کالے سینگ ایسے معلوم ہوتے تھے کہ کسی نے آبنوس کی کالی لکڑی میں خوب محنت سے تراش کر بنائے ہوں۔ لال لال آنکھیں۔ تم دیکھتے تو کہتے کہ ارے یہ بکری تو ہم نے لا ہوتی یہ بکری دیکھنے میں ہی اچھی نہ تھی۔ مزاج کی بھی بہت اچھی تھی۔ پیار سے ابّو خاں کے ہاتھ چاٹتی تھی۔ دودھ چاہے تو کوئی بچہ دوہ لے۔ نہ لات مارتی تھی، نہ دودھ کا برتن گراتی۔ ابّو خاں تو بس اس پر عاشق سے ہوگئے تھے اس کا نام چاندنی رکھا تھا اور دن بھر اس سے باتیں کرتے رہتے تھے کبھی اپنے چچا گھسیٹا خاں کا قصہ اسے سناتے تھے، کبھی اللہ بخشے ماموں نتھو خاں کا۔

ابّو خاں نے یہ سوچکر کہ بکریاں شاید میرے گھر کے تنگ آنگن میں گھبرا جاتی ہیں اپنی اس بکری چاندنی کے لئے نیا انتظام کیا تھا۔ گھر کے باہر ان کا ایک چھوٹا سا کھیت تھا۔ اسکے چاروں طرف انھوں نے نہ جانے کہاں کہاں سے کانٹے جمع کر کرکے ڈالے تھے کہ کوئی اس میں آنہ سکے۔ اس کے بیچ میں چاندنی کو باندھتے تھے اور رسی خوب لمبی رکھی تھی کہ خوب ادھر ادھر گھوم سکے۔ اس طرح چاندنی کو ابّو خاں کے یہاں خاصہ زمانہ گذر گیا اور ابّو خاں کو یقین ہوگیا کہ آخر کو ایک بکری تو ہل گئی۔ اب یہ نہ بھاگیگی مگر ابّو خاں دھوکہ میں تھے۔ آزادی کی خواہش اتنی آسانی سے

دل سے نہیں مٹتی۔ پہاڑ اور جنگل میں رہنے والے آزاد جانوروں کا دم گھر کی چار دیواری میں گھٹتا ہے۔ تو کانٹوں سے گھرے ہوئے کھیت میں بھی انھیں چین نصیب نہیں ہوتا۔ قید قید سب ایک سی۔ تھوڑے دن کیلئے چاہے دھیان بٹ جائے مگر پھر پہاڑ اور جنگل یاد آتے ہیں اور قیدی اپنی رسّی تڑانے کی فکر کرتا ہے۔ ابوخاں کا خیال ٹھیک نہ تھا کہ چاندنی پہاڑ کی ہوا بھول گئی ہے۔

ایک دن صبح صبح جب سورج ابھی پہاڑ کے پیچھے ہی تھا۔ کہ چاندنی نے پہاڑ کیطرف نظر کی۔ منہ جوجگالی کیوجہ سے چل رہا تھا۔ رک گیا اور چاندنی نے دل میں کہا:-

"وہ پہاڑ کی چوٹیاں کیسی خوبصورت ہیں۔ وہاں کی ہوا اور یہاں کی ہوا کا کیا مقابلہ۔ پھر وہاں اچھلنا، کودنا، ٹھوکریں کھانا اور یہاں ہر وقت بندھے رہنا۔ گردن میں آٹھ پہر یہ کم بخت رسی ایسے گھر ونمیں گدھے اور خچر بھلے ہی چُگ لیں۔ ہم بکریوں کو تو ذرا بڑا میدان چاہئے۔"

اس خیال کا آنا تھا اور چاندنی اب وہ پہلی چاندنی ہی نہ تھی۔ نہ اسے ہری ہری گھاس اچھی لگتی تھی نہ پانی مزہ دیتا تھا۔ نہ ابوخاں کی لمبی داستانیں اسے بھاتی تھیں۔ روز بروز دبلی ہونے لگی دودھ گھٹنے لگا۔ ہر وقت منہ پہاڑ کیطرف رہتا اور رسی کو کھینچتی۔ اور عجیب درد بھری آواز سے "میں میں" چلاتی۔

ابوخاں سمجھ گئے، کہ ہو نہ ہو کوئی بات ضرور ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ہے۔ ایک دن صبح جب ابوخاں نے دودھ دوہ لیا تو چاندنی نے انکی طرف منہ پھیرا اور اپنی بکریوں والی زبان میں کہا "ابوخاں میاں۔ میں اب تمہارے پاس رہونگی تو مجھے بڑی بیماری ہوجائے گی۔ مجھے تو تم پہاڑ ہی میں چلا جانے دو۔" ابوخاں بکریوں کی زبان سمجھنے لگے تھے۔ چلا کر بولے۔ "یا اللہ یہ بھی جانے کو کہتی ہے یہ بھی" اور مارے صدمے کے مٹی کی لٹیا جس میں دودھ دوہا تھا ہاتھ سے گری اور پاش پاش ہوگئی۔

ابوخاں وہیں گھاس پر بکری کے پاس بیٹھ گئے اور نہایت غمگین آواز سے پوچھا۔ "کیوں بیٹی چاندنی۔ تو بھی مجھے چھوڑنا چاہتی ہے؟"

چاندنی نے جواب دیا۔ "ہاں۔ ابوخاں میاں۔ چاہتی تو ہوں"

"ارے تو کیا تجھے چارہ نہیں ملتا۔ یا دانہ پسند نہیں۔ بنیے نے گھنے دلنے ملادے ہیں۔ میں آج ہی اور دانہ لے آؤنگا۔"

"نہیں نہیں۔ میاں مجھے دانہ کی کوئی تکلیف نہیں" چاندنی نے جواب دیا۔

"تو پھر کیا رسی چھوٹی ہے۔ میں اور لمبی کردونگا"

چاندنی نے کہا "اس سے کیا فائدہ"۔

"تو آخر پھر بات کیا ہے؟۔ تو چاہتی کیا ہے؟"

چاندنی نے جواب دیا! "کچھ نہیں۔ بس مجھے تو پہاڑ میں جانے دو۔"

ابوخاں نے کہا! "اری کم نصیب۔ تجھے یہ بھی خبر ہے کہ وہاں بھیڑیا رہتا ہے۔ وہ جب آئے گا تو کیا کرے گی؟"

چاندنی نے جواب دیا۔ "اللہ نے دو سینگ دیے ہیں۔ ان سے اسے مارونگی"۔

"ہاں ہاں۔ ضرور" ابوخاں بولے "بھیڑیے پر تیرے سینگوں ہی کا تو اثر ہوگا۔ وہ تو میری کئی بکریاں ہڑپ کر چکا ہے۔ انکے سینگ تو تجھ سے بہت بڑے تھے۔ تو تو کلو کو جانتی نہیں تھی وہ یہاں پچھلے سال تھی بکری کاہے کو تھی ہرن تھی ہرن۔ کالا ہرن۔ رات بھر سینگوں سے بھیڑیے کے ساتھ لڑی۔ مگر پھر صبح ہوتے ہوتے اس نے دبوچ ہی لیا اور کھا گیا۔"

چاندنی نے کہا۔ "ارے۔ رے۔ رے۔ بیچاری کلو۔ مگر خیر۔ ابوخان میاں اس سے کیا ہوتا ہے۔ مجھے تو تم پہاڑ میں جانے ہی دو۔"

ابوخاں کچھ جھنجلائے اور بولے۔ "یا اللہ۔ یہ بھی جاتی ہے۔ میری ایک بکری اور اس کم بخت بھیڑیے کے پیٹ میں جاتی ہے..... مگر نہیں۔ نہیں میں اسے تو ضرور بچاؤں گا۔ کم بخت احسان فراموش تیری مرضی کے خلاف تجھے بچاؤں گا۔ اب تو تیرا ارادہ معلوم ہوگیا ہے۔ اچھا بس چل تجھے کوٹھری میں باندھا کرونگا۔ نہیں تو موقع پاکر چلدے گی۔"

ابوخاں نے آکر چاندنی کو ایک کونے کی کوٹھری میں بند کردیا اور اوپر سے زنجیر چڑھادی۔ مگر غصہ اور جھنجلاہٹ میں کوٹھری کی کھڑکی بند کرنا بھول گئے۔ اِدھر انھوں نے کنڈی چڑھادی اُدھر

چاندنی اچک کر کھڑکی میں سے باہر۔ یہ جا وہ جا۔

چاندنی پہاڑ پر پہونچی تو اس کی خوشی کا کیا پوچھنا تھا۔ پہاڑ پر پیڑ اس نے پہلے بھی دیکھے تھے لیکن آج ان کا اور ہی رنگ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کے سب کھڑے ہوئے اسے مبارکباد دے رہے ہیں کہ پھر ہم میں آملی۔ اِدھر اُدھر سیوتی کے پھول مارے خوشی کے کھلکھلا کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ کہیں اونچی اونچی گھاس اس سے گلے مل رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ سارا پہاڑ مارے خوشی کے مسکرا رہا ہے اور اپنی بچھڑی ہوئی بچی کے واپس آنے پر پھولا نہیں سماتا۔ چاندنی کی خوشی کا حال کوئی کیا بتائے۔ نہ چاروں طرف کانٹوں کی باڑھ، نہ کھونٹا نہ رسی۔ اور چارہ! وہ وہ جڑیاں بوٹیاں کہ ابو خاں غریب باوجود اپنی ساری محبت اور شفقت کے نہ لا سکتے۔

چاندنی کبھی ادھر اچھلتی، کبھی اُدھر، یہاں سے کودی، وہاں پھاندی، کبھی چٹان پر ہے، کبھی کھڈ میں۔ ادھر ذرا پھسلی پھر سنبھلی ایک چاندنی کے آنے سے سارے پہاڑ میں رونق سی معلوم ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ ابو خاں کی دس بارہ بکریاں چھوٹ کر یہاں آگئی ہیں

ایک دفعہ گھاس پر منہ مار کر جو ذرا سر اٹھایا تو چاندنی کی نظر ابو خاں کے مکان اور اس کانٹوں والے گھیر پر پڑی۔ انھیں دیکھ کر چاندنی خوب ہنسی اور دل میں کہنے لگی "یہ خدا کوئی دیکھے تو۔ کتنا ذرا سا مکان ہے اور کیسا چھوٹا سا گھیر۔ یا اللہ میں اتنے دن اس میں کیسے رہی؟ اس میں آخر سماتی کیسے تھی؟" پہاڑ کی چوٹی پر سے اس ننھی سی جان کو نیچے کی ساری دنیا ہیچ نظر آتی تھی۔

چاندنی کے لئے یہ دن بھی عجیب دن تھا۔ دوپہر تک اتنی اچھلی کودی کہ شاید ساری عمر میں اتنی اچھلی کودی نہ ہوگی۔ دوپہر ڈھلتے اسے پہاڑی بکریوں کا ایک گلہ دکھائی دیا۔ گلہ کی بکریوں نے اسے خوشی خوشی اپنے پاس بلایا۔ اور اس سے حال احوال پوچھا۔ گلہ میں کچھ جوان بکرے بھی تھے۔ انہوں نے بھی چاندنی کی بڑی خاطر تواضع کی۔ بلکہ اس میں ایک بکرا تھا ذرا کالے کالے رنگ جس پر کچھ سفید ٹپے تھے وہ چاندنی کو بھی اچھا لگا۔ اور یہ دونوں بہت دیر تک ادھر ادھر پھرتے رہے۔

ان میں نہ جانے کیا کیا باتیں ہوئیں اور کوئی تو تھا نہیں۔ ایک چشمہ پانی کا بہہ رہا تھا اس نے سنی ہوں گی۔ کبھی کوئی وہاں جائے اور اس چشمہ سے پوچھے تو شاید کچھ پتہ لگے۔ اور پھر بھی کیا خبر۔ یہ چشمہ بھی شاید نہ بتائے۔

خیر۔ بکریوں کا گلہ تو نہ معلوم کدھر چلا گیا۔ وہ جوان بکرا بھی اِدھر اُدھر گھوم کر اپنے ساتھیوں میں جا ملا۔ چاندنی کو ابھی آزادی کی اتنی آرزو تھی کہ اس نے گلہ کے ساتھ ہو کر ابھی سے اپنے اوپر پابندیاں لینا گوارا نہ کیا۔ اور ایک طرف کو چل دی۔ شام کا وقت ہوا۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ سارا پہاڑ لال سا ہو گیا اور چاندنی نے سوچا او ہو "ابھی سے شام ہ؟" نیچے ابو خاں کا گھر اور وہ کانٹوں والا گھر دونوں کہر میں چھپ گئے۔ نیچے کوئی چرواہا اپنی بکریوں کو باڑہ میں بند کرنے کے لئے جا رہا تھا۔ انکی گردن کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ چاندنی اس آواز کو خوب پہچانتی تھی اسے سنکر اداس سی ہو گئی۔ ہوتے ہوتے اندھیرا ہونے لگا اور پہاڑ میں ایک طرف سے آواز آئی۔ "خو خو"

یہ آواز سنکر چاندنی کو بھیڑیے کا خیال آیا۔ دن بھر ایک دفعہ بھی اسکا دھیان ادھر نہ گیا تھا۔ پہاڑ کے نیچے سے ایک سیٹی اور بگل کی آواز آئی۔ یہ بیچارے ابو خاں تھے جو آخری کوشش کر رہے تھے۔ اسے سنکر چاندنی پھر لوٹ آئی۔ اُدھر سے یہ کہہ رہے تھے "لوٹ آ۔ لوٹ آ" ادھر سے دشمن جان بھیڑیے کی آواز آ رہی تھی۔

چاندنی کے جی میں کچھ تو آئی کہ لوٹ چلے۔ لیکن اسے کھونٹا یاد آیا، رسی یاد آئی، کانٹوں کا گھر یاد آیا۔ اور اس نے سوچا کہ اُس زندگی سے تو یہاں کی موت اچھی۔ آخر کو سیٹی اور بگل کی آواز بند ہو گئی۔ پیچھے سے پتیوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ چاندنی نے مڑ کر دیکھا تو کان دکھائی دئے۔ سیدھے کھڑے ہوئے اور دو آنکھیں جو اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ بھیڑیا پہونچ گیا تھا۔

بھیڑیا زمین پر بیٹھا تھا۔ نظر بیچاری بکری پر جمی تھی اسے اطمینان تھا جلدی نہ تھی۔ خوب جانتا تھا کہ اب کہاں جاتی ہے۔ بکری نے جو اسکی طرف رخ کیا تو یہ مسکرائے اور بولے "او ہو۔ ابو خاں کی بکری ہے

خوب کھلا کھلا کر موٹا کیا ہے"۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی لال لال زبان اپنے نیلے نیلے ہونٹوں پر پھیری۔ چاندنی کو کلّو کا قصہ یاد آیا جو ابو خاں نے بتایا تھا اور اس نے سوچا کہ میں کیوں خواہ مخواہ رات بھر لڑ کر صبح جان دوں۔ ابھی کیوں نہ اپنے کو سپرد کردوں۔ لیکن پھر خیال کیا کہ نہیں اپنا سر جھکایا۔ سینگ آگے کو کئے اور پینترا بدل کر بھیڑیے کے مقابل آئی کہ بہادروں کا یہی شیوہ ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ چاندنی اپنی بساط نہ جانتی تھی اور بھیڑیے کی طاقت کا اندازہ اسے نہ تھا۔ وہ خوب جانتی تھی کہ بکریاں بھیڑیے کو نہیں مار سکتیں۔ وہ تو صرف یہ چاہتی تھی کہ اپنی بساط کے مطابق مقابلہ کرے جیت ہار پر اپنا قابو نہیں۔ وہ اللہ کے ہاتھ ہے مقابلہ ضروری ہے۔ جی میں یہ سوچتی تھی کہ دیکھوں میں کلّو کی طرح رات بھر مقابلہ کرسکتی ہوں یا نہیں کچھ دیر جب گذر گئی تو بھیڑیا بڑھا۔ چاندنی نے بھی سینگ سنبھالے۔ اور وہ وہ حملے کئے ہیں کہ بھیڑیے ہی کا جی جانتا ہوگا۔ دسیوں مرتبہ اس نے بھیڑیے کو پیچھے ریل دیا۔ ساری رات اسی میں گذری۔ کبھی کبھی چاندنی اوپر آسمان کی طرف دیکھ لیتی اور ستاروں سے آنکھوں آنکھوں میں کہہ دیتی کہ کاش اسی طرح صبح ہو جائے۔

ستارے ایک ایک کرکے غائب ہوگئے۔ چاندنی نے آخری وقت میں اپنا زور دوگنا کردیا۔ بھیڑیا بھی تنگ آگیا تھا کہ دور سے ایک روشنی سی دکھائی دی۔ ایک مرغ نے کہیں سے بانگ دی نیچے بستی میں مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ چاندنی نے دل میں کہا اللہ تیرا شکر ہے۔ میں نے اپنے بس بھر مقابلہ کیا۔ اب تیری مرضی۔ مؤذن آخری دفعہ اللہ اکبر کہہ رہا تھا کہ چاندنی بے دم زمین پر گر پڑی۔ اس کا سفید بالوں کا لباس خون سے بالکل سرخ تھا۔ بھیڑیے نے اسے دبوچ لیا اور کھا گیا!

اوپر درخت پر چڑیاں بیٹھی دیکھ رہی تھیں۔ ان میں اس پر بحث ہو رہی ہے کہ جیت کس کی ہوئی۔ سب کہتی ہیں کہ بھیڑیا جیتا۔ ایک بوڑھی سی چڑیا ہے وہ مصر ہے کہ چاندنی جیتی۔

شذرات

گذشتہ پرچہ میں جو انعامی معمہ درج ہوا تھا اس کے پہنچنے کی آخری تاریخ غلطی سے ۳۰ر مئی ۳۸ء لکھی گئی ہے۔ حالانکہ ۳۰ر جون ہونا چاہیے تھا۔ چونکہ اس پرچہ کے پہنچنے تک وقت بہت کم رہ جائے گا۔ اس لئے اسکی آخری تاریخ ۳۰ر جون سے بڑھا کر ۷ر جولائی کردی گئی ہے۔ ناظرین کرام یاد رکھیں۔

علی احمد صاحب بی۔ ایس۔ سی (جامعہ) مدرس اسلامیہ ہائی اسکول رنگون کی خانہ آبادی مدرسہ کی گذشتہ تعطیل کے دوران میں ہوئی۔ جامعہ والے ایسے موقعہ پر جامعہ نہیں بھولتے۔ چنانچہ آپ نے بھی اپنی شادی کے موقعہ پر جامعہ کے لئے مبلغ عنـ۲ـہ مرحمت فرمائے ہم علی احمد صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں اور جامعہ کی طرف سے انکا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

۷ر جون کے پرچہ میں جو نتیجہ امتحان شایع ہوا تھا۔ اس میں عجلت کی وجہ سے بہت سی افسوسناک غلطیاں ہوگئی ہیں۔ چونکہ ان کا تعلق طلبائے جامعہ سے ہے اس لئے امید ہے کہ وہ خود ہی تصحیح کرلینگے۔

ایڈیٹر سعید انصاری بی۔ اے (جامعہ) پرنٹر و پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی۔ جامعہ ملیہ پریس دہلی میں چھپکر دفتر پیام تعلیم سے شائع ہوا۔

رجسٹرڈ ایل
۱۹۶۱
پیام تعلیم
جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا
پندرہ روزہ تعلیمی رسالہ

نرخنامہ چندہ	فہرست مضامین	نرخنامہ اشتہارات
سالانہ دو روپیے ششماہی ایک روپیہ فی پرچہ ۳	۷ جولائی سنہ ۱۹۳۰ء	فی صفحہ ۸ روپیے نصف صفحہ ۵ ″ چوتھائی صفحہ ۳ ″

جلد ۹ — نمبر ۵

دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟

کینیڈا میں اس سال دو کروڑ من شہد تیار ہوگا

امریکہ میں چند اضلاع میں آگ لگ جانے کی وجہ سے سخت نقصان ہوا ہے

انگلستان میں گول میز کانفرنس کی تیاریاں بڑے زور شور سے ہو رہی ہیں

غازی مصطفٰے کمال پاشا موسم سرما میں یورپ کی سیر کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اب ڈرسک کے ضلع میں ماہی گیروں نے ایک دن میں پانچ لاکھ مچھلیاں پکڑیں

ڈرسک

جاپان میں تمام کاشتکاروں اور کسانوں نے چاول کی کاشت شروع کر دی ہے

ہندوستان

سائمن رپورٹ کی جلد دوم شائع ہوگئی ہے ہندوستانیوں کے لئے یہ ہر لحاظ سے ناقابل قبول ہے

ایک ہوا باز کو جو ہسپانیہ اور مراکش کے درمیان ہوائی جہاز پر سفر کر رہا تھا جبل الطارق کے پاس ایک زبردست ٹڈی دل کی وجہ سے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر جانا پڑا

چائل میں ایک آتش فشاں پہاڑ کے پھوٹنے کی وجہ سے بہت سے گاؤں کو نقصان پہنچا ہے

جوہانس برگ میں ایلنڈ کی درگاہ کی طرف سے ایک بہت بڑی رصدگاہ قائم ہونیوالی ہے

امسال نیوزی لینڈ میں بہت ہی کم بارش ہوئی ہے اور بعض حصے تو بالکل خشک پڑے ہیں

نیوزی لینڈ

چین کی دلچسپ خبریں

۲۴ مئی سنہ ۱۹۳۰ء کو محکمۂ تعلیم نے حسب ذیل اعلان شائع کیا ہے :۔

زندہ قوم کے لئے قومی گیت کی سخت کی ضرورت ہے۔ چونکہ چین میں اب تک کوئی ایسا قومی گیت نظم نہیں کیا گیا ہے جس سے قومی زندگی قائم رہ سکے لہذا محکمۂ تعلیم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ بہترین قومی گیت کے لئے ایک اعلان شائع کرے تاکہ قومی گیت کے مقابلہ کرنے والوں کو یہ موقع ملے کہ وہ اپنی اپنی لیاقت کے مطابق بہترین قومی گیت نظم کرنے کی کوشش کرے۔ بہترین قومی گیت بنانے والے کو ایک ہزار ڈالر انعام دیا جائیگا۔

محکمۂ تعلیم نے ۲۰ دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء سے لیکر ۲۳ مئی سنہ ۳۰ء تک جو سارٹیفکیٹ یورپ امریکہ اور جاپان گئے ہوئے طلبا کو دئے ہیں اُن کی تعداد ۳۴۲ ہے۔ ان میں سے ۲۰، طلبا حکومت چین کے وظیفے سے اور باقی طلبا خود اپنے ذاتی اخراجات سے گئے ہیں۔

چین کے ثانوی اسکولوں میں امتحان داخلہ کے وقت غیر زبان کے امتحان کا دستور منسوخ کر دیا گیا ہے۔ یہ کارروائی اس سال کے دوسرے ٹرم سے شروع ہوگی۔ محکمۂ تعلیم کی رائے میں غیر زبان ابتدائی جماعتوں میں کوئی اہم درس نہیں ہے اور غیر زبان کے فارغ التحصیل طلبا کی لیاقت بہت ہی کم ہوتی ہے

اسی خیال کو مد نظر رکھتے ہوئے محکمۂ تعلیم نے ہر صوبہ اور ہر خاص مقام کی تعلیمی کونسل کو حکم دیا ہے کہ وہ تمام ثانوی اسکولوں کو اطلاع دیدیں کہ اس سال کے دوسرے ٹرم سے امتحان داخلہ کے وقت تمام غیر زبانوں کے امتحان کا دستور منسوخ کر دیا گیا ہے۔

کھیل کی خبریں

آسٹریلیا اور انگلستان کا پہلا مقابلہ ۱۲ر جون کو ناٹنگھم میں ہوا۔ انگلستان کی ٹیم نے آسٹریلیا کو ۹۳ رنز سے شکست دی۔ ان کی طرف سے ہابس نے جو دنیا کا بہترین کھلاڑی ہے سب سے زیادہ رنز بنائے اور آسٹریلیا کی طرف سے برڈین نے ایک سو سے زیادہ دوڑیں کیں۔ دلیپ سنگھجی کا نام بارھویں نمبر پر تھا اس لئے وہ کھیل نہیں سکا۔ اب دوسرے مقابلہ میں اس کو کھیلنے کی دعوت دی گئی ہے۔

گزشتہ پرچہ میں اطلاع دی جا چکی ہے کہ آسٹریلیا نے ٹینس میں انگلستان کو شکست دی تھی۔ اب دوسرے میچ میں وہ بالکل غیر متوقع اٹلی کی ٹیم سے ہار گئی۔

ہند جمخانہ بمبئی نے فیصلہ کیا ہے کہ موجودہ سیاسی حالت کو دیکھتے ہوئے وہ کرکٹ سے علیحدگی اختیار کریں گے۔ اس لئے غالباً وہ امسال کواڈرینگلر ٹورنامنٹ میں بھی شامل نہیں ہونگے۔

انگلستان کی ٹیم جو اس سال موسم سرما میں ہندوستان کا دورہ کریگی منتخب ہوگئی ہے۔ اس ٹیم کے کیپٹن مسٹر لائن ہونگے۔

نیوزی لینڈ کی ٹیم رگبی میں سب سے طاقتور شمار ہوتی ہے لیکن انگلستان کی منتخب ٹیم نے نیوزی لینڈ کی منتخب ٹیم کو پہلے مقابلہ میں شکست دی۔ اس میچ کو دیکھنے کے لئے ۲۳۰۰۰ کا مجمع تھا۔

ریاضی

ریاضی کا جدید طریقۂ تعلیم

(گزشتہ سے پیوستہ)

ریاضی میں اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیئے کہ جو سوال پڑھا جائے وہ حقیقت پر مبنی ہو۔ اس کی بنیاد فرضی اور خیالی باتوں پر نہ ہونا چاہئے ورنہ طلبہ کے لیئے یہ ایک الجھن کا باعث بنے گا اور وہ عملی طور پر سمجھنے سے قاصر رہیں گے اور یہ انکی زندگی کے لئے بہت مضر ثابت ہوگا۔ مثلاً ایک سوال یہ ہے کہ ایک کمرہ ۵۰ میل لمبا اور ۲۰۰ میل چوڑا ہے اس کا رقبہ معلوم کرو۔ ظاہر ہے کہ یہ سوال محض خیالی ہے اس کو حقیقت سے کچھ تعلق نہیں ہے یا اسی قسم کے اور سوالات جو بادی النظر میں اچھے معلوم ہوتے ہیں اور اس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس طرح سے طالب علم کو مشکل سے مشکل سوالات کے حل کرنے پر قدرت حاصل ہوجائے گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے طالب علم کا خواہ مخواہ دماغ پریشان ہوتا ہے اور اس میں وہ ایک طرح کی الجھن محسوس کرتا ہے۔ اس لیئے حتی الوسع کوشش کرنی چاہیئے کہ ان غیر حقیقی باتوں سے دور رہیں جو طلبہ کو خواہ مخواہ الجھن میں ڈالتی ہیں۔

حساب کے پڑھانے میں سب سے زیادہ جس کا لحاظ رکھنا چاہیئے وہ ترتیب ہے جو جتنی اچھی ترتیب رکھے گا وہ پڑھانے میں اتنا ہی کامیاب ہوگا۔ ہندوستان میں عام طور پر حساب پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے شاید ہی کوئی ایسی کتاب ملے جس میں ترتیب کا لحاظ کیا گیا ہو۔ اس لیئے صرف کتاب کے بھروسہ پر نہ رہنا چاہیئے بلکہ خود جو ترتیب مناسب سمجھے وہ قائم رکھے اور اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ آسانی سے مشکل کی طرف جائیں۔ یہ نہ کریں کہ جو کتاب میں لکھدیا گیا ہے خواہ کسی طرح لکھدیا گیا ہو اسی کو پڑھانا شروع کردیں اور آسان و مشکل کا کچھ لحاظ نہ کریں۔ مثلاً جمع کو لیجیئے اس میں ہم بجائے اسکے کہ ۳۵ ، ۴۰ ، ۸۵ کو جمع کریں یہ زیادہ اچھا ہوگا کہ پہلے ان اعداد کو جمع کرائیں جن کے مجموعے میں دہائی اور حاصل کی ضرورت نہ پڑے یعنی جن کا مجموعہ ۹ سے زیادہ نہ ہونے پائے مثلاً ۲ + ۳ + ۴ یا ضرب میں پہلے ان عددوں سے کسی عدد کو ضرب دیا جائے جو صفر کے ساتھ ہوں مثلاً ۴۰، ۱۰، ۵۰ وغیرہ۔ عاد اعظم اور ذو اضعاف اقل جسکے سمجھنے سے ابتدائی جماعتوں کے طلبہ ایک حد تک قاصر رہتے ہیں اس کو ثانوی جماعتوں میں شروع کرانا چاہیئے۔ ہاں کسر اس قابل ہے کہ اس کو ہم ابتدائی جماعتوں میں رکھہ سکتے ہیں۔ شاید بعض حضرات کہیں کہ جب ذو اضعاف اقل نہیں معلوم ہے تو ہم کسور کی جمع و تفریق کس طرح کرسکتے ہیں۔ اس کے لیئے حسب ذیل طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔

فرض کیا کہ $\frac{1}{3}$ اور $\frac{1}{4}$ کو جمع کرنا ہے تو ہم یہاں یہ کریں گے کہ $\frac{1}{3}$ کے شمار کنندہ اور نسب نما میں سے ہر ایک کو ۴ سے ضرب دیں گے جو کہ $\frac{4}{12}$ ہوجائے گا اور پھر $\frac{1}{4}$ کے شمار کنندہ اور نسب نما میں سے ہر ایک کو ۳ سے ضرب دیں گے جو اس طرح $\frac{3}{12}$ ہوجائے گا۔ اب ہم $\frac{4}{12}$ اور $\frac{3}{12}$ کو آسانی سے جمع کرسکتے ہیں یعنی یہ $\frac{7}{12}$ ہوجائیگا اسی طرح تفریق بھی کرسکتے ہیں۔ کسور اعشاریہ کو اسکیل کی مدد سے آسانی سے سمجھایا جاسکتا ہے کیونکہ انچ اور خانوں میں ۱ اور ۱۰ کی نسبت پائی جاتی ہے۔ مختلف قسم کے حسابی سوالات کو اکائی کے قاعدہ سے آسانی سے حل کیا جاسکتا ہے۔ سود، کام اور کھیل دوڑ کے سوالات میں بالکل اکائی کے قاعدہ میں صرف فرق یہ ہے کہ ان کا نام الگ الگ رکھ دیا گیا ہے ورنہ ہوتے ایک ہی ہیں۔

ممالک متحدہ امریکہ، انگلستان اور دوسرے ممالک میں اس پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جنمیں کوشش کیگئی ہے کہ ریاضی خصوصاً حساب کو جسقدر ہوسکے آسان بنایا جائے۔ امریکہ میں Individual work - Dalton Plan کے نام سے مختلف چھوٹے چھوٹے حصے مختلف عمر کا لحاظ کرکے لکھے گئے ہیں۔ انمیں یہ کوشش کیگئی ہے کہ اسکو نہ صرف آسان اور دلچسپ بنایا جائے بلکہ طالب علم اس سے دنیا میں کچھ کام لے سکے۔ امریکہ کے اور بہت سے ماہرین فن نے اس کی طرف توجہ کی ہے۔ اس میں خصوصیت سے Thorndike قابل ذکر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حساب دو چیزوں سے اپیل کرتا ہے۔ ایک دماغی تحریکات اور دوسری حصول کی خواہش سے۔ اگر اسکو اچھی طرح پڑھایا جائے تو یہ ابتدائی اسکولوں کے لیئے بہترین کھیل ہے اور یہ اسقدر معین ہے کہ طالب علم جان سکتا ہے کہ کیا کرنا ہے اور کتنا کرنا ہے۔ آگے چلکر یہی مصنف لکھتا ہے کہ "حساب کے پڑھانے کا جو نیا طریقہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں کو ابھارے یعنی اس کو بہت ہی دلچسپ کھیل بنائے"

نظم

گلزارِ وطن

پھولوں کا کنج دلکش بھارت میں اک بنائیں
حبّ وطن کے پودے آہیں نئے لگائیں

پھولیں جس چمن کے ہو بوئے جاں نثاری
حبّ وطن کی قلمیں ہم اُس چمن سے لائیں

خونِ جگر سے سینچیں ہر نخل آرزو کو
اشکوں سے بیل بوٹوں کی آبرو بڑھائیں

ایک ایک گل میں پھونکیں روح شمیم وحدت
اک اک کلی کو دل کے دامن سے دیں ہوائیں

فردوس کا نمونہ اپنا ہو کنجِ دلکش
سارے جہاں کی جس میں ہوں جلوہ گر فضائیں

چھایا ہو ابر رحمت کا شانۂ چمن میں
رم جھم برس رہی ہوں چاروں طرف گھٹائیں

مرغانِ باغ بنکر اُڑتے پھریں ہوا میں
نغمے ہوں روح افزا اور دلربا صدائیں

حبّ وطن کے لب پر ہوں جانفزا ترانے
شاخوں پہ گیت گائیں پھولوں پہ چہچہائیں

چھائی ہوئی گھٹا ہو موسم طرب فزا ہو
جھونکے چلیں ہوا کے اشجار لہلہائیں

سائنس

سورج کی کرنیں

(گزشتہ سے پیوستہ)

ماسٹر صاحب - تم نے یہ تو سن ہی لیا کہ یہاں سے سورج تک جانے میں کتنا عرصہ لگے گا۔ اب یہ بتاؤ سورج ہے کتنی بڑی چیز؟

سلیم - چھوٹی سی چیز معلوم ہوتی ہے۔ ہماری زمین سے چھوٹی ہی ہوگی۔

ماسٹر صاحب - نہیں، سورج بہت بڑی چیز ہے۔ پرانے زمانہ میں یونان کے ایک بہت بڑے عالم نے کہدیا تھا کہ سورج اتنا بڑا ہے جس قدر جزیرہ نما پیلوپونیسس یعنی اس قدر بڑا جتنا کہ لاہور کا ضلع ہے۔ بس پھر کیا تھا لوگ اس کے پیچھے پڑ گئے اور اس کا خوب مذاق اڑایا۔ اگر وہی لوگ اب سنیں کہ سورج لاہور کا ضلع تو ایک طرف رہا ہماری دنیا سے دس لاکھ گنا بڑا ہے تو بہت تعجب کریں گے۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ زمین چھوٹی سی چیز ہے۔ ایک تیز رفتار ریل گاڑی کوئی ایک ماہ میں اس کے گرد چکر پورا کرے گی۔ لیکن اس کی سورج کے سامنے کیا حقیقت۔ ہماری زمین کا قطر کل آٹھ ہزار میل ہے اور سورج کا قطر آٹھ لاکھ باون ہزار میل ہے۔ اگر سورج اور زمین دونوں کو بیچ سے تراش دیں اور نصف سورج کے چپٹے حصہ پر نصف زمین کا چپٹا حصہ رکھدیں تو ایسے ایک سو چھ ٹکڑے نصف سورج کے چپٹے حصہ میں سما جائیں گے۔ اگر تم کسی طرح سورج کو اندر سے کھوکھلا کر دیں اور ایک طاقتور دیو سے کہیں کہ ہماری دنیا کے برابر ایک ہزار دنیا جمع کر لو۔ جب وہ جمع کرے تو اسے حکم دیں کہ اب ایک ہزار دنیا کے انبار کے برابر ایک ہزار انبار اور جمع کرے اور ان سب کو سورج میں ڈال دے تو تم تعجب کرو گے کہ سورج کے صرف تین چوتھائی حصہ پر ہوگا۔

سلیم - اوہو! سورج اس قدر بڑا ہے۔ اتنی بڑی چیز سے گرمی اور روشنی بھی تو خوب نکلتی ہوگی؟

ماسٹر صاحب - ہاں ہاں، گرمی اور روشنی تو خوب نکلتی ہے۔ اس کا اندازہ انسان کر ہی نہیں سکتا۔ البتہ سر جان ہرشل نے سورج کی حرارت اور روشنی کا اندازہ کرنے کے لئے ایک طریقہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

میجک لینٹرن میں ایک قسم کا گولا استعمال کیا جاتا ہے جس کی روشنی کو آکسی ہائیڈروجن روشنی کہتے ہیں۔ یہ گولہ بہت گرم ہوتا ہے انسان اس کی روشنی کے سامنے نہیں آسکتا۔ اگر اس کے شعلوں کو قریب سے دیکھے تو ضرور آنکھ کو نقصان پہنچے گا۔ اگر تم چاہتے ہو کہ سورج کے برابر تیز روشنی پیدا کرو تو آکسی ہائیڈروجن کے ایک سو چھیالیس گولے سورج کے برابر بناؤ تو شاید کچھ کامیابی حاصل ہو جائے یعنی جتنی بڑی ہماری زمین ہے اتنے چودہ کروڑ ساٹھ لاکھ گولے روشن کئے جائیں تو قریب قریب سورج کی روشنی پیدا ہو جائیگی۔

لطف یہ ہے کہ ساری کی ساری کرنیں ہماری زمین پر نہیں پڑتیں۔ اگر تم ایک لیمپ روشن کرو اور اس کے سامنے ایک رائی کا دانہ رکھدو کیونکہ رائی کے دانہ کو لیمپ سے وہی نسبت ہے جو زمین کو سورج سے ہے تو تم دیکھو گے کہ لیمپ کی تمام شعاعیں رائی کے دانہ پر نہیں پڑیں۔ اسی طرح سورج کی تمام کرنیں ہماری زمین پر نہیں پڑتیں۔ یہ جو اتنی حرارت اور روشنی دیکھتے ہو صرف چند ہی کرنوں کا طفیل ہے۔ حساب سے معلوم ہوا ہے کہ کل شعاعوں کا دو اربواں حصہ ہماری دنیا کی تمام ضروریات کو پورا کر رہا ہے۔ اگر سورج کی تمام کرنیں کہیں ہم پر پڑتیں تو ہم جل کر راکھ ہو جاتے لیکن خدا نے ہمارے بچانے کا ایک اور انتظام کر رکھا ہے۔ یہ کام پانی کے ان ذرّوں سے لیا گیا ہے جو سورج کی گرمی کی وجہ سے جدا جدا ہو کر ہواؤں میں پھیل جاتے ہیں۔

(باقی)

جغرافیہ

جزیرۂ فارموسا

کافور تو تم نے دیکھا ہوگا کیسی سفید اور خوبصورت چیز ہوتی ہے۔ اگر اس کا ایک ٹکڑا پانی میں ڈال دیں اور اس کو دیا سلائی سے جلائیں تو برابر جلتا رہتا ہے۔ بعض لوگ یہ تماشا چھوٹے چھوٹے بچوں کو دکھا کر اپنے آپ کو جادوگر ظاہر کرتے ہیں۔ آج ہم تمہیں اس جگہ کا حال سنائیں گے جہاں سے کافور آتا ہے۔

جاپان کا نام تو تم نے سنا ہوگا۔ اس ملک کے پاس ایک جزیرہ ہے جس کا نام ہے فارموسا۔ آج سے چار سو برس پہلے پرتگالی اس جزیرہ پر حکومت کرتے تھے لیکن ۱۶۲۳ء میں ولندیزیوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ابھی ان ولندیزیوں کو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا تھا کہ ایک چینی ڈاکو نے ولندیزیوں کو نکال باہر کیا۔ ۱۸۹۴ء تک اس جزیرہ پر چینیوں کی حکومت رہی لیکن ۱۸۹۵ء میں چین اور جاپان کی جنگ کے بعد جاپانیوں نے فارموسا پر اپنا اقتدار جما لیا۔ اس کی کل آبادی ......۴ ہے جس میں فارموسا کے اصل باشندوں کی کثرت ہے۔

فارموسا میں ایک خصوصیت اور امتیاز یہ ہے کہ یہاں دنیا بھر میں سب سے زیادہ کافور پیدا ہوتا ہے۔ اس عجیب چیز کے یہاں ہزاروں درخت ہیں جن سے جاپانی اب بہت فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ کافور کپڑوں کو حفاظت سے رکھنے کے علاوہ بہت سی دواؤں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

فارموسا کے اصلی باشندے جنگلی اور وحشی ہیں جو اب آہستہ آہستہ تہذیب کی طرف آتے جاتے ہیں۔ ان وحشیوں کا قبیلہ وارانہ نظام ہے۔ ہر قبیلہ کا سردار علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے اور قوانین و ضوابط بھی مختلف ہوتے ہیں۔ دشمن کو مارنا ان کے نزدیک سب سے بڑا ثواب ہے۔ اپنے دشمنوں کے سروں کو یہ بڑی حفاظت سے رکھتے ہیں۔ جس شخص کے پاس سب سے زیادہ سر ہوتے ہیں وہ بڑی وقعت اور عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کی آپس میں ہمیشہ لڑائی ہوتی رہتی ہے۔ ان کے مکان بانس کے بنے ہوتے ہیں جن میں صرف ایک دروازہ اور ایک کھڑکی ہوتی ہے۔ دروازہ اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ جھک کر گزرنا پڑتا ہے۔ ان وحشیوں کا سب سے بڑا پیشہ کاتنا ہے۔ اچھے کاتنے والے کی ہر جگہ عزت ہوتی ہے۔

چاول یہاں بہت پیدا ہوتا ہے۔ تمام باشندے چاول بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی جانور کا بھی گوشت مل جائے تو چٹ کر جاتے ہیں۔ ان خرابیوں کے باوجود ان میں چند خوبیاں بھی ہیں۔ یہ لوگ کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ جھوٹ بولنے والے کی زبان کاٹ لی جاتی ہے۔ مہمان نوازی میں بھی یہ مشہور ہیں۔ جب تک مہمان ان کے ہاں رہتا ہے اس کو کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ وعدے کے یہ لوگ بڑے پکے ہوتے ہیں اور اس کو ایک مذہبی فریضہ جانتے ہیں۔

یہ لوگ بہت سے خداؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد ہر آدمی کو ایک وسیع اور خطرناک پُل سے گزرنا پڑتا ہے۔ جو آدمی جنگ اور لڑائی میں سب سے زیادہ بہادری دکھاتا ہے وہ بلا خوف و خطر اس پل سے گزر کر بہشت میں پہونچ جاتا ہے۔ باقی آدمی پل پر سے گر جاتے ہیں اور کبھی بہشت میں نہیں پہنچتے۔ جب ان پر کوئی آفت ناگہانی نازل ہوتی ہے تو یہ کسی غار میں چلے جاتے ہیں اور وہاں خوب ناچتے کودتے ہیں۔ انکا خیال ہے کہ ایسا کرنے سے وہ آفت ٹل جاتی ہے۔

شادی کرنے کا طریقہ بھی عجیب ہے۔ جو لڑکا کسی خاندان میں شادی کرنا چاہتا ہے وہ اپنے دشمنوں کے سروں کو بطور تحفہ اس گھر میں بھیجتا ہے اور ایک ہفتہ تک برابر ایسا کرتا ہے۔ اگر یہ سر قبول کر لئے جائیں تو سمجھا جاتا ہے کہ معاملہ طے ہو گیا۔

جب یہ لوگ اپنے دشمنوں کے خلاف لڑنے جاتے ہیں تو ان کے خاندان والے ایک بڑے میدان میں آگ جلاتے ہیں۔ یہ آگ اس وقت تک نہیں بجھاتے جب تک کہ وہ لوگ واپس نہیں آجاتے۔ اگر یہ لوگ کامیاب واپس آئیں تو خوب دعوتیں ہوتی ہیں اور برابر ایک ہفتہ تک ہوتی رہتی ہیں۔

جاپانی ان وحشیوں کو آہستہ آہستہ اب تہذیب و تمدن کی طرف لا رہے ہیں۔ جاپانی ان سے لڑتے نہیں بلکہ صلح سے کام لیتے ہیں کیونکہ یہ لوگ م
ہ ایسی دشوار گزار پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں رہتے ہیں جہاں جاپانی فوج انکا کچھ نہیں بگاڑ سکتی بلکہ انہیں اُلٹا نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔

تاریخ

عمرو بن العاصؓ فاتح مصر اور شہر فسطاط کی آبادی

حضرت عمرو بن العاصؓ نامور صحابہ میں سے ہیں۔ اُن کے اپنے بیان کے مطابق اُنکی زندگی کے تین دور ہیں۔ (۱) زمانۂ قبل از اسلام (۲) زمانۂ بعد از اسلام جو رسول اللہؐ کی صحبت میں بسر ہوا اور (۳) زمانہ بعد از خلافت راشدہ جو امیر معاویہؓ کی صحبت میں بسر ہوا۔ حضرت عمروؓ کو سب سے زیادہ بیچ کا زمانہ محبوب تھا۔ جو کچھ ہو وہ تینوں زمانوں میں ایک ممتاز آدمی کی حیثیت اور ایک پیدایشی سردار و رہنما کی صلاحیت و قابلیت کے ساتھ چمکتے ہیں۔ رسول اللہؐ کی تیرہ سالہ مکی زندگی میں وہ مخالفین اسلام کے ایک سردار نظر آتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ "اُسوقت میری سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ کسی طرح قابو پا کر آپ کو قتل کر دوں"۔ اسی دور میں جب کفار مکہ کے ظلم و زیادتی سے تنگ آکر سب سے پہلے کچھ مسلمانوں نے ہجرت کرکے حبش میں پناہ لی تو قریش نے عمرو بن عاص کو رئیس وفد بنا کر بادشاہ حبش یعنی نجاشی کے پاس بھیجا اور مسلمانوں کی حوالگی کا مطالبہ کیا۔ اُس وقت یہ ایسے خونخوار تھے کہ اپنے ملک تو اپنے ملک ایک غیر ولایت میں بھی مسلمانوں کو امن سے رہنے سہنے کے روادار نہ تھے۔ جب نجاشی نے باوجود اُن کی تمام ریشہ دوانیوں اور سازش کے مسلمانوں کو قریش کی درندگی کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تو یہ بہت پیچ و تاب کھاتے ہوئے مکہ واپس آئے اور قریش کے ساتھ مسلمانوں کو ستانے میں پہلے سے زیادہ سرگرمی و بے رحمی کا اظہار کرنے لگے۔ ان ظلموں اور بے رحمیوں کا جب پیمانہ لبریز ہوا اور مکہ کی ہوا میں بندگان خدا کا سانس لینا مشکل ہو گیا تو ہجرت مدینہ شروع ہوئی۔ لیکن اب بھی آپ کو اور آپ کی قوم کو قرار نہیں ہوا۔ ایک بڑے سپہ سالار تو تھے ہی مکہ سے مدینہ پر بار بار چڑھائی کرنے میں اُس کے جوہر دکھانے اور مسلمانوں کو برباد کرنے کا تازہ میدان ہاتھ آیا۔ سات سال سے اوپر حالتِ جنگ قائم رہی اور یہ تقریباً تمام معرکوں میں مسلمانوں کے خلاف پیش پیش رہے۔ آخر صلح حدیبیہ ہوئی اور جنگ کی حالت ختم ہوئی تو اسلام تیزی سے عرب میں پھیلنے لگا۔ اسی زمانہ میں حضرت عمرو بن العاصؓ کو خدا نے ہدایت کی، آپ رسول اللہؐ کی خدمت میں جن کے وہ خون کے پیاسے تھے حاضر ہوئے اور عرض کیا "یا رسول اللہ ہاتھ بڑھائیے میں بیعت کرتا ہوں"۔ آپ نے دست مبارک دراز کیا، مگر پھر عمروؓ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ فرمایا "عمر تجھے کیا ہوا"۔ انہوں نے کہا "ایک شرط چاہتا ہوں"۔ فرمایا "کونسی شرط؟" عرض کیا "یہ شرط کہ میری بخشش ہو جائے"۔ اس پر ہمارے رسولِ کریمؐ نے ارشاد فرمایا "اے عمرو! کیا تجھے معلوم نہیں کہ اسلام اپنے سے پہلے کے تمام گناہ مٹا دیتا ہے؟ ہجرت بھی مٹا دیتی ہے۔ حج بھی مٹا دیتا ہے۔" اس روحانی تسکین بخشنے والی تعلیم کے ساتھ رحمتِ دو عالم یعنی ہمارے پیارے رسولِ اکرمؐ نے اپنی رحمت کی گود میں عمروؓ جیسے کٹر جانی دشمن کو اُٹھا لیا۔ اس عظیم الشان رحمت کا عظیم الشان اثر ہوا۔ عمروؓ کی کایا پلٹ ہو گئی۔ اُن کی بہادری اور سرداری قائم رہی لیکن اُن کے اخلاق اور خیال میں انقلاب ہو گیا۔ اب وہ بہت رحمدل اور پرہیزگار بن گئے اور اپنی جسمانی طاقت و دماغی قوت کو ظلم و غارت گری کے کاموں کی جگہ نیکی کے کاموں میں صرف کرنے لگے۔ اُس دور کا حال خود اُن کی زبان سے سننا چاہیے۔ رسول اللہؐ کے ساتھ اپنے تعلق کو ظاہر کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اسوقت میں نے یہ حال دیکھا کہ نہ تو رسول اللہؐ سے زیادہ کسی کی عزت میری نگاہ میں تھی اور نہ رسول اللہؐ سے زیادہ کوئی انسان مجھے محبوب تھا۔ میں سچ کہتا ہوں، اگر کوئی مجھ سے "آپؐ" کا حلیہ پوچھے تو میں بتا نہیں سکتا کیونکہ انتہائی عظمت و رعب کی وجہ سے میں آپ کو نظر بھر کر دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر اس حالت میں میں مرجاتا تو میرے جنتی ہونے کی پوری اُمید تھی۔

رسولِ کریمؐ کی وفات کے بعد حضرت عمرو بن عاصؓ ایک زبردست "جنرل" ایک زبردست "مدبر" اور ایک زبردست "ناظم" کی حیثیتوں سے نامور ہوئے۔ حضرت عمر فاروقؓ خلیفۂ ثانی کے عہد میں آپ نے مصر اور طرابلس کو اپنی تدبیر اور سپہ سالاری سے فتح کیا اور قبطیوں کے قومی بادشاہ مقوقس کو اپنے حسن سلوک سے دوست بنایا۔ اپنے عمدہ اخلاق سے تمام قبطیوں کو مسلمانوں کا دوست بنا دیا۔ حضرت عمروؓ اور اُن کے ماتحت مسلمان فوجیوں کا سلوک باشندگانِ مصر کے ساتھ ایسا عمدہ اور شفیقانہ تھا کہ وہ دل و جان سے اُن کے حامی و مددگار ہو گئے اور رومیوں کو مصر سے خارج کرنے میں عالمگیر جوش و خروش سے حصہ لیا۔ عربوں کی فتح کے معنی اہلِ مصر نے اپنے ملک اور اپنے قوم کی رُومی غلامی و ظلم سے آزادی کے جانا اور ہر جگہ رومیوں کے خلاف بطور خود رضاکارانہ مدد پہنچائی۔ (باقی آیندہ)

ایک بندر کی عقلیت و انسانیت

ہمارے ایک دوست مشاہدہ او مطالعۂ قدرت کے بڑے شائق ہیں۔ اکثر اس کے لئے جنگلات، کوہستان اور دریا کا سفر اختیار کرتے ہیں۔ آپ نے مجھے فی الحال اپنا ایک عجیب وغریب تجربہ بیان کیا ہے۔ یہ واقعہ سوچنے اور غور کرنے کے لئے جتنا بڑا سامان اپنے اندر رکھتا ہے اُتنا ہی عبرت اندوزی کا سامان بھی رکھتا ہے۔ میں سب سے پہلے اُن کی آپ بیتی اُنھیں کی زبانی پیش کر دیتا ہوں آئندہ کچھ اور لکھوں گا۔

” ایک بار میں تنہا صوبہ بہار کے ایک جنگل میں سفر کر رہا تھا۔ مجھے کچھ عجیب الخواص جڑی بوٹیوں کی تلاش تھی۔ عصر کی نماز میں نے جنگل ہی میں ادا کی۔ میں بہت سرگرداں پھرا لیکن وہ جڑی بوٹیاں ہاتھ نہیں آئیں۔ میں کوشش سے باز نہیں آتا اور ناکامی سے ہمت نہیں ہارتا بلکہ ناکامی میں ایک طرح کی خوشی محسوس کرتا ہوں کیونکہ وہ مزید جد وجہد کا موقع دیتی ہے اور میرے شوق کی آگ کو بھڑکاتی ہے۔ چنانچہ میں سر شام تک مصروف تلاش رہا۔ بارے خدا خدا کرکے میں بہت دیکھ بھال کے بعد جڑی بوٹیوں کے پانے میں کامیاب ہوا۔ مجھے وہی خوشی حاصل ہوئی جو کسی بڑے بادشاہ کو ایک ملک فتح کرنے میں ہوتی ہے۔ میں نے جلدی جلدی اپنا کام ختم کیا کیونکہ اب آفتاب ڈوبنے کے قریب تھا اور گاؤں دور۔ میں تیز قدمی سے روانہ ہوا۔ میں جنگلات میں بے خوف پھرنے کا عادی ہوں اور جنگلی جانوروں کی آمد کو بھانپنے کا ماہر ہو گیا ہوں۔ مجھے دور سے خطرہ کی آہٹ اور آنے والی مصیبت کی بُو مل جاتی ہے۔ میں جان بوجھ کر خطرات میں پڑا کرتا ہوں کیونکہ میں نے جفاکش طبیعت اور ایک بلاجو مزاج پایا ہے۔ لیکن آج میں کچھ سراسیمہ سا معلوم ہوتا تھا۔ مجھے قریب ہی کہیں سے شیر کی بو مل رہی تھی اور چونکہ میں سوائے ایک موٹے ڈنڈے کے اور کچھ اپنے پاس نہیں رکھتا تھا میری سراسیمگی واجب تھی۔ تاہم میں دل مضبوط کئے آگے بڑھتا گیا۔۔۔۔۔

گاؤں کو جانے والی پگ ڈنڈی کے قریب پہونچا تھا کہ میں نے ایک شیر کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا، غور کرنے پر مجھے وہ نوع معلوم ہوا جس کو اہل بہار ”باگھ“ کہتے ہیں یہ لانبے قد کا شیر ایک کینہ ور اور کمینہ جانور ہے۔ اس میں شیر ببر کی شرافت نہیں پائی جاتی کیونکہ یہ بلاقصور بھی آدمیوں پر حملہ کر دیا کرتا ہے حالانکہ ببر ایسا نہیں کرتا۔ میں نے حواس قائم رکھے اور بجائے بھاگنے کی بے کار احمقانہ کوشش کرنے کے ایک بڑے او گھنے درخت پر چڑھ جانا زیادہ مناسب جانا۔ چنانچہ میں درخت کے اوپر چڑھ گیا اور اسکی گھنی شاخوں میں چھپ گیا۔ یہ وقت تھا کہ آفتاب ڈوب رہا تھا، جنگل پر خاموشی و مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے درخت پر چڑھنے کے بعد اپنے آپ کو ایک نئے خطرہ میں پایا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میرے بائیں بازو کی ڈالی پر ایک بڑا خوفناک جنگلی بندر بیٹھا ہے اور داہنے بازو کی موٹی ڈالی پر ایک بڑا ریچھ پڑا ہے۔ درخت پر آنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو محفوظ خیال کیا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ دراصل میں کڑاہی سے نکل کر آگ میں گرا تھا۔ میں خود کو موت کے لئے تیار کرنے لگا اور ساتھ ہی میرا دل مجھ کو اُمید نجات بھی دلا رہا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر خدا کی جناب میں دعا مانگی۔ ابھی میں دُعا سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ میں نے دیکھا کہ شیر درخت کے تنے کے نیچے آگیا ہے اور بڑی خونخواری اور غصّہ کے ساتھ یک بیک میرے غائب ہو جانے پر اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہے۔ اتنے میں بندر نے سر اُٹھا کر چاروں طرف اپنی نگاہ دوڑائی گویا کہ وہ حالات کا جایزہ لے رہا تھا۔ دیکھنے کے بعد اس میں حرکت ہوئی، میں خائف ہوا اور مرنے مارنے کے لئے تیار۔ لیکن میں متعجب ہوا جبکہ بندر نے میری طرف آنے کی بجائے بڑے ریچھ کی طرف رُخ کیا، نہایت ہوشیاری و آہستگی سے آگے بڑھا، اتنی خاموشی سے کہ میری آنکھوں نے سب کچھ دیکھا لیکن میرے کانوں نے کچھ بھی نہیں سنا۔ آخرش بندر ریچھ تک پہونچا۔ جھک کر اس کو خوب غور سے دیکھا، پھر سر سے میری طرف کچھ اشارہ کیا جس کے مفہوم کو میں نے اسوقت کچھ نہیں سمجھا کیونکہ اس عجیب وغریب ڈرامہ کے اس عجیب وغریب ایکٹر نے میرے خوف وہراس کو یکسر حیرت وتعجب سے بدل دیا تھا اور میں اُسکی حرکات کے کچھ معنی نہیں سمجھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک بڑا دھماکا ہوا اور میں نے دیکھا کہ ریچھ کو بندر نے اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ زمین پر جا گرا۔ اب میری خیال میں آیا کہ وہ دراصل سو رہا تھا اور بندر مجھ کو اسکے خواب کی اطلاع دے رہا تھا لیکن میرا دماغ ان خیالات کی کڑیوں کو ملانے میں مشغول تھا کہ میری آنکھوں نے دیکھا کہ شیر نہایت خونخوار غضبناکی کے ساتھ شام کی تاریکی اور بھوک اور غصے کی حالت میں ریچھ کو آدمی خیال کرکے لے اُڑا۔ بندر اپنی جگہ پر آکر فاتحانہ خوشی کے ساتھ شیر اور ریچھ کی چقلش کو دیکھنے لگا۔ جب کچھ دیر ہوئی تو بندر نیچے اُترا اور اشارہ سے بتایا کہ اب مطلع صاف ہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور نیچے اُتر کر گھر کی راہ لی۔ میں نے خیال کیا کہ جانوروں میں سانپ، ریچھ اور باگھ جتنے کمینہ ہیں بندر اُتنا ہی شریف ہے“

اخلاقی قصّے

دروغ گو سے سلوک

ایک مسافر نے اپنے گیسو سنوارے اور اپنے تئیں حضرت علیؓ کے خاندان سے بتایا۔ وہ ایک قافلہ کے ہمراہ شہر کو گیا اور کہا کہ میں حج کرکے لوٹا ہوں۔ وہ بادشاہ کے پاس ایک قصیدہ لے کر گیا اور کہا کہ یہ میں نے خود بنایا ہے۔ بادشاہ کا ایک درباری اسی سال بحری سفر کرکے واپس آیا تھا۔ اُس نے کہا "میں نے اسکو عید الضحٰے کے روز بصرہ میں دیکھا ہے۔ یہ حاجی کیونکر ہو گیا؟" دوسرے نے کہا "میں اسکو جانتا ہوں۔ اس کا باپ ملاتیا کا ایک عیسائی تھا۔ حضرت علیؓ سے اس کا کیا تعلق؟" اس کے قصیدہ کے اشعار دیوان انوری میں پائے گئے۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ "اس کو مار مار کر شہر سے باہر نکال دو۔ اس نے میرے سامنے کتنا جھوٹ بولا ہے" اُس نے جواب دیا "جہاں پناہ! کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ سچ نہ ہو تو آپ جو سزا مناسب سمجھیں مجھے دیں"

بادشاہ نے پوچھا "کیا کہنا چاہتے ہو؟" اُس نے جواب دیا "اگر کوئی غریب آدمی آپ کے لئے دودھ لائے تو دو پیمانہ پانی ہے اور ایک چمچہ اصل ہے۔ اگر آپ اپنے غلام سے کوئی لغو بات سنیں تو افسوس نہ کریں، کیونکہ جہاندیدہ آدمی بہت جھوٹ بولتے ہیں"

بادشاہ نے ہنسکر کہا "تم اپنی زندگی میں کبھی اس سے زیادہ سچ نہیں بولے ہو۔ اس لئے میں تمہیں معاف کر دیتا ہوں" اور پھر اُس دروغ گو کو بیش بہا انعام واکرام دیا۔

بیوقوف عابد

کسی بادشاہ نے ایک بیوقوف عابد کو بلایا۔ اُس نے دل میں سوچا کہ میں کوئی دوا کھالوں اور پہلے سے زیادہ کمزور ہو جاؤں تاکہ میرے بارے میں بادشاہ کی رائے اور بھی اچھی ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ اُس نے ایک دوا کھالی اور وہ اسکے لئے زہر قاتل ثابت ہوئی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ بیوقوف عابد مر گیا۔

جو عابد یا اور کوئی دنیا پر نظر جاتے ہیں وہ قبلہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے ہیں۔ جب تم ایک اپنے جیسے خاک کے پتلے کی پرستش کروگے تو خدا کی نظر عنایت کی توقع نہ کرو۔

عالم اور عابد میں فرق

کسی عابد نے اپنے والد سے کہا "ناصحوں کے رنگین الفاظ مجھ پر مطلق اثر نہیں کرتے کیونکہ میں انہیں اپنی نصیحت کے مطابق عمل کرتے ہوئے نہیں پاتا۔ یہ لوگ دوسروں کو دنیا سے منہ موڑنے کی نصیحت کرتے ہیں مگر خود دنیا کا مال و دولت جمع کرنے میں مصروف رہتے ہیں اس لئے ان کی نصیحت کسی کے دل پر اثر نہیں کرتی۔ ناصح وہ ہے جو خود برا کام نہیں کرتا نہ کہ وہ ساری دنیا کو نصیحت کرے اور اپنی ذرہ بھر بھی پروا نہ کرے۔ دوسروں کو نصیحت اور خود کو فضیحت! قاضی جو عیش و عشرت میں غلطاں رہتے ہیں اور جسم کو موٹا کرتے ہیں، وہ تو خود ہی بھولے ہوئے ہیں وہ اوروں کو کیا راہ دکھائینگے" والد نے جواب دیا "صرف یہ فضول باتیں سوچکر ان کی نصیحت سے مُنہ نہیں موڑنا چاہئے۔ بیوقوفی کی راہ کو اختیار نہیں کرنا چاہئے اور ناصحوں کی بُرائی کرنا نامناسب ہے۔ داناؤں کی تلاش سے بے فکر نہیں رہنا چاہئے اور نہ علم و عمل کی برکات سے محروم رہنا چاہئے۔ تم اُس اندھے آدمی کی مانند ہو جو رات کو کیچڑ میں پھنس کر کہنے لگا 'اے مسلمانو! کم از کم تم تو میرے سامنے ایک چراغ رکھدو' یہ سنکر ایک بازاری عورت نے جواب دیا 'تم چراغ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ اسے لیکر کیا کروگے؟' قاضیوں کی مجلس بزاز کی دوکان ہے۔ جب تک تم دام نہ دوگے اُسوقت تک کچھ نہیں لے سکتے۔ اور جب تک تم ارادہ نہ کروگے اُسوقت تک کچھ بھی لطف نہیں اُٹھا سکتے۔ ناصح کی نصیحت گوش و ہوش سے سنو خواہ اس کے اعمال اس کی نصیحت کے مطابق نہ ہوں۔ مخالف کا یہ کہنا لاحاصل ہے کہ سوتے ہوئے کو سوتا ہوا کس طرح جگائے۔ انسان کو چاہئے کہ اگر نیک نصیحت دیوار پر لکھی ہو تو بھی گوش و ہوش سے سنے۔ ایک عابد ایک خانقاہ سے ایک مدرسے میں آیا تو میں نے اُس سے پوچھا 'عالم اور عابد میں کیا فرق ہے جو تم نے عابد کی راہ ترک کرکے عالم کی راہ اختیار کی ہے؟' اُس نے جواب دیا 'عابد لہر سے صرف اپنا کمبل بچاتا ہے اور عالم ڈوبتے ہوئے کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔'"

قصے اور کہانیاں

ایک باہمّت غریب

پرانے زمانہ میں کسی شہر میں ایک عورت رہتی تھی۔ اُس کے دو جوان لڑکے تھے۔ ان کی ماں بڑے دکھ سے ان کے لئے کھانا مہیا کرتی تھی۔ ایک دن وہ ایک تالاب پر نہانے کی غرض سے گئے اور جب نہا کر فارغ ہوگئے تو ان کی نظر ایک کھمبے پر پڑی جس پر ایک ہاتھ بنا ہوا تھا، وہ اس کھمبے کے پاس گئے تو دیکھا کہ اس پر لکھا ہوا تھا کہ اگر اس طرف جاؤ گے تو بادشاہت مل جائیگی۔ غرض ایک بھائی نے کہا کہ بھائی میں جاتا ہوں خدا حافظ اور خوب گلے مل ملکر روئے اور ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ جو بھائی کہ بادشاہت کی تلاش میں چلا تھا قریب ایک میل کے گیا ہوگا کہ ایک بڑا دروازہ ملا اور وہ اس کے اندر داخل ہوگیا۔ اس دروازے کے اندر اس کو ایک کوٹھری نظر آئی جس کے اندر وہ بلا خوف وخطر داخل ہوگیا۔ تھوڑی دیر ادھر اُدھر نظر ڈالنے کے بعد ایک کنواں نظر پڑا۔ اس نے اس کے اردگرد کئی چکر کئے اس بات کو معلوم کرنے کے لئے کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ یکایک اس کی نظر ایک کاغذ کے ٹکڑے پر پڑی۔ اس نے اسے لپک کر اٹھالیا اور بڑے غور سے دیکھا تو اس پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی کہ اس کنوے میں کود پڑو۔ وہ اُس کنوے میں کود پڑا اور تقریباً پندرہ منٹ اس کنوے میں چلنے کے بعد ایک توپ کے گولے کے چھوٹنے کی سی آواز آئی۔ اُس نے آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو ایک لق ودق صحرا میں پایا۔ غرضیکہ وہ اسوقت جس طرف منہ اُٹھا روانہ ہوگیا۔ جلد ہی وہ ایک ندی کے کنارے پر پہنچ گیا، وہاں اُس نے منہ ہاتھ دھویا اور درختوں میں سے پھل توڑ توڑ کر کھائے۔ اس کے بعد اُس نے دو پرندوں کو یہ باتیں کہتے سُنا کہ اگر کوئی شخص کشتی میں بیٹھ کر چلے اور جہاں کوئے پر مکان ملے اُتر جائے اور اُس کے بعد آگے چلکر ایک درخت پر لکھی ہوئی ہدایات پر عمل کرے تو اُسے بادشاہت مل جائیگی۔ یہ فوراً اُٹھا اور کشتی میں بیٹھ روانہ ہوا۔ راستہ میں جس جگہ یہ کھانے کی خواہش کرتا تو دریا میں سے ایک ہاتھ نکلتا جس پر کھانے کا ایک خوان رکھا ہوا ہوتا، وہ اس کو کھالیتا تو اوپر سے ایک عقاب اس خوان کو اُٹھا لیجاتا تھا۔ جب اس کو کشتی پر چلتے ہوئے دو دن ہوگئے تو دریا کے موڑ پر وہ مکان نظر آیا۔ اس نے وہیں کشتی ٹھیرادی اور کنارے پر اُتر پڑا۔ ذرا ہی آگے بڑھا تھا کہ اُسے وہ ہی درخت ملا جس میں کہ ایک تیر کمان اور ایک خط لٹکا ہوا تھا۔ اس نے اس خط کو پڑھا تو ان سب مہمات کا پتہ چل گیا جو کہ اس کو آگے پیش آنے والی تھیں۔ غرض کہ اُس نے وہ تیر کمان اُٹھائی اور روانہ ہوا۔ ذرا ہی دور چلنے کے بعد اس کو بہت سے بھورے رنگ کے شیر دکھائی دئے جن کے بیچ میں ایک کالا شیر تھا۔ وہ خوف کے مارے ایک درخت پر چڑھ گیا اور خیال کیا کہ جب شیر ادھر اُدھر چلے جائیں گے میں آگے روانہ ہو جاؤنگا۔ لیکن شیروں نے آکر اسی درخت کے نیچے جس پر یہ بیٹھا ہوا تھا ایک گھیرا بنالیا اور کالے شیر نے درخت پر چڑھنا شروع کیا۔ اس نے کمان میں تیر چڑھاکر اس کے ایسا مارا کہ وہ وہیں ختم ہوگیا۔ اس کے مرتے ہی تمام شیر ختم ہوگئے۔ یہ درخت سے اُترا اور آگے روانہ ہوا۔ تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ اُسے ایک محل ملا۔ یہ اُس کے اندر گیا تو اس کے اندر ایک بہت بڑا ہال ملا جس میں ایک تخت شاہی اور کونسل کی بہت سی کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ وہ اس تخت پر بیٹھا تو ایسے زور کا دھماکا ہوا جیسے کہ زمین کے دو ٹکڑے ہوگئے اور اپنے آپ کو ایک بے آب وگیاہ ریت میں پایا اور اسی وقت بڑے زور شور سے گانے بجانے کی آواز معلوم ہوئی۔ یہ ذرا بڑھا تو کیا دیکھتا ہے کہ لاکھوں آدمی ایک جلوس کے ساتھ چلے آرہے ہیں۔ جب یہ اُن کے پاس پہونچا تو ان میں سے ایک بڑا شخص جو خوب قیمتی پوشاک میں ملبوس تھا کہا کہ ہم نے اور اس ملک کی تمام رعایا نے آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلیا ہے کیونکہ ہمارے ملک کا بادشاہ مرچکا تھا اور ہم میں یہ رائے قرار پائی تھی کہ جو شخص ہمارے ملک میں سب سے پہلے داخل ہوگا وہ ہمارا بادشاہ ہوگا۔ لہٰذا آپ ہمارے بادشاہ ہیں۔ اُس نے اُسی وقت نہا دھو کر شاہی پوشاک پہنی اور تخت نشینی کی رسم ادا کی اور کچھ عرصہ بعد ایک دوسرے ملک کے بادشاہ کی لڑکی سے شادی کی اور اپنی ماں اور بھائی کو بلایا اور سب ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

تصویری لطیفہ

کرنل، میرے پاس صرف ایک ٹکٹ ہی۔ تمہارا ٹکٹ کھو گیا ہے۔
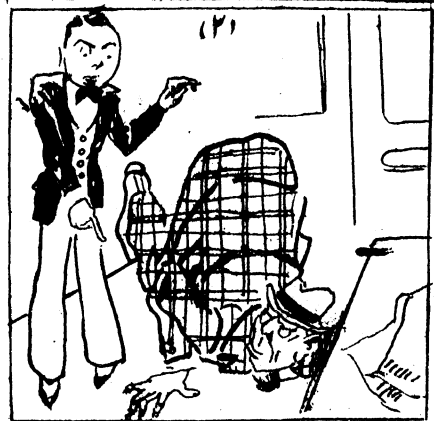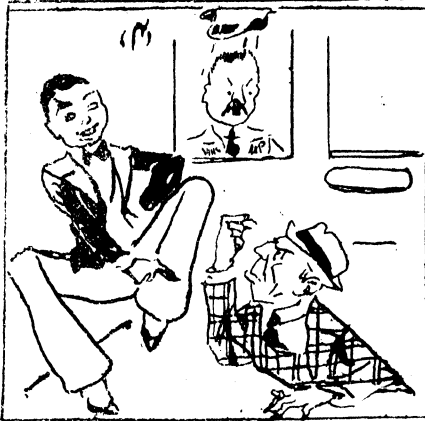
چیکر آرہا ہے۔ تم فوراً بینچ کے نیچے چھپ جاؤ۔

ہیں! دو ٹکٹ! آپ کا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟

وہ بینچ کے نیچے چھپا ہی۔

معمے

انعامی معمہ

شرائط :-

۱- جوابات ۲۰ جولائی سنہ ۳۰ء تک مندرجہ ذیل پتہ پر پہونچ جانے چاہئیں -

"غ - ح - بتوسط ایڈیٹر صاحب "پیام تعلیم"

جامعہ ملیہ اسلامیہ،

قرولباغ - دہلی۔"

۲- ہر حل کے ساتھ دو پیسے کا ٹکٹ آنا ضروری ہے -

۳- ایک سے زیادہ صحیح آنے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی ہوگا -

۴- صحیح حل بھیجنے والے کو ایک روپیہ کا انعام دیا جائے گا -

معمہ یہ ہے :-

۲۹ میں سے ایک کیسے گھٹائیں کہ ۳۰ ہو جائے۔

انعامی معمہ کا نتیجہ

"پیام تعلیم" کے خاص نمبر میں جو دو انعامی معمے شائع ہوئے تھے اُن کے بہت سے حل وصول ہوئے ہیں۔ مندرجہ ذیل اصحاب نے معمہ نمبر ۲ کا صحیح حل بھیجا ہے :-

عبدالقیوم صاحب، مسعود حسین خاں صاحب، محمد معصوم عالم صاحب، عبدالمجید صاحب، صدر مدرس صاحب مدرسۂ تحتانیہ، محمد علیم اللہ صاحب، سید انور علی صاحب، مطیع اللہ صاحب -

مندرجہ ذیل اصحاب نے معمہ نمبر ا کا صحیح حل روانہ کیا ہے:-

محمد عمران صاحب، قدسیہ صاحبہ، شاہ محی الدین صاحب شفیق احمد صاحب، انور جہاں بیگم صاحبہ، ابوالکلام محمد فخر عالم صاحب، اختر تاباں صاحب، مریم بانو صاحبہ، اختر النساء صاحبہ قسیم اعظم صاحب، سید اشراق احمد صاحب، شفیق احمد اثر صاحب، عبدالرشید الور صاحب - عبدالرشید صاحب -

قرعہ اندازی کے ذریعہ سے پہلے معمہ کا انعام سید اشراق احمد صاحب کو اور دوسرے معمہ کا انعام انور جہاں بیگم صاحبہ کو ملا -

انعام کے مستحقین دفتر میں اطلاع کردیں کہ انھیں کس کس کتاب کی ضرورت ہے تاکہ انعام ان کے نام روانہ کردیا جائے۔

ایڈیٹر سعید انصاری، پرنٹر و پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین - جامعہ ملیہ پریس میں چھپکر دفتر پیام تعلیم سے شایع ہوا۔

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۹۶۱

پیام تعلیم

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا پندرہ روزہ
تعلیمی رسالہ

نرخنامہ چندہ

سالانہ عار
ششماہی عہ
فی پرچہ ار

نرخنامہ اشتہارات

فی صفحہ للعہ
نصف صفحہ صہ
چوتھائی صفحہ سے

ایڈیٹر:- سعید انصاری بی اے (جامعہ)

جلد ۹	۲۱ جولائی سنہ ۱۹۳۰ء	نمبر ۶

فہرست مضامین

دنیا میں کیا ہو رہا ہے

کوائف جامعہ

(از نامہ نگار)

آج کل دہلی کا موسم نہایت خوشگوار ہے۔ تقریباً ہر روز بارش ہوتی ہے لیکن اس پر بھی وہ حضرات جو تعطیلات کلاں میں جامعہ ہی میں مقیم ہیں ہر روز شام کو تالاب پر جاتے ہیں اور تیرنے تیرانے کا لطف اٹھاتے ہیں۔

جناب شیخ الجامعہ صاحب ایک دن کے لئے علیگڈھ تشریف لے گئے تھے۔ اب واپس آگئے ہیں۔

مدرسہ شاخ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی ہاکی ٹیم گذشتہ ہفتہ پانی پت میچ کھیلنے گئی تھی۔ مسلم ہائی اسکول والوں نے ٹیم کے ٹھیرنے کا نہایت عمدہ انتظام کیا تھا۔ جسکے لئے ہم جناب ہیڈ ماسٹر صاحب و گیمس کمیٹی کے انچارج صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ جامعہ کے ایک طالب علم حافظ نبی احمد صاحب نے بھی ٹیم کی بہت خاطر تواضع کی۔

امسال جامعہ میں داخلہ کے لئے بہت سی درخواستیں موصول ہونا شروع ہوگئی ہیں۔ اس مطلب کے لئے ابھی سے پُرفضا و دلکش کوٹھیاں کرایہ پر لی جارہی ہیں۔ جامعہ ۲ اگست ۱۹۳۶ء کو کھلے گی۔

گذشتہ اتوار کو مدرسہ شاخ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بزم جمیل کے زیر اہتمام ایک جلسہ ہوا جسمیں حکیم سید عباس علی صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی علیگ نے "سیرۃ رسول" پر تقریباً ایک گھنٹہ تک تقریر فرمائی۔

کھیل کی خبریں

انگلستان اور آسٹریلیا کے دوسرے کرکٹ کے مقابلہ میں اسٹریلیا کی ٹیم نے انگلستان کی ٹیم کو شکست فاش دی۔ انگلستان کی طرف سے دلیپ سنگھ جی نے ۷۳ دوڑیں بناکر ہندوستان کا نام رکھ لیا۔ اسٹریلیا کی طرف سے ان کے کپتان وڈفل نے ۱۵۵ اور بریڈمین نے ۲۵۴ دوڑیں بنائیں۔ بریڈمین اس خوبی سے کھیلتا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اسکے بلے میں کوئی مقناطیسی طاقت کام کررہی ہے۔ جب اس نے دوسو دوڑیں بنائیں تو تماشائیوں نے اس زور سے تالیاں بجائیں کہ آسمان سر پر اٹھا لیا۔ انگلستان کی ٹیم کے تمام کھلاڑی ایک قطار میں کھڑے ہوگئے اور سب نے باری باری بریڈمین سے ہاتھ ملایا۔

رگبی کے دوسرے مقابلہ میں نیوزی لینڈ کی ٹیم نے انگلستان کی ٹیم کو شکست دی۔ اس میچ کو دیکھنے کے لئے ۵۰ ہزار کا مجمع تھا۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ پہلے مقابلہ میں نیوزی لینڈ والے ہار گئے تھے۔

گذشتہ سال کلکتہ ٹینس کلب نے فرانس کی ٹینس ٹیم کو ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی۔ فرانس کے کھلاڑی ہندوستان آئے تھے اور سب سے پہلے کلکتہ میں ایک ٹورنامنٹ میں شرکت کی تھی۔ اسکے بعد انھوں نے لاہور، دھلی اور بمبئی کا بھی دورہ کیا تھا۔ فرانس کی ٹیم کے آنے سے ہندوستانیوں نے بہت کچھ سبق سیکھا تھا۔ اب کلکتہ کلب والوں کا ارادہ ہے کہ امسال انگلستان ٹیم کو ہندوستان آنے کی دعوت دی جائے۔

موجودہ سیاسی حالات کو دیکھتے ہوئے انگلستان کی کرکٹ ٹیم نے جو موسم سرما میں ہندوستان کا دورہ کرنیوالی تھی اپنا ارادہ ملتوی کردیا ہے۔ کرکٹ کے شیدائی اسپر اظہار افسوس کررہے ہیں۔

"کھلاڑی"

دیہاتی تعلیم کی نگرانی

(ماخوذ)

شاہی کمیشن کی رائے میں زمینداروں اور کاشتکاروں کی پس ماندگی کی وجہ انکی جہالت ہے اس لئے موزوں قسم کی تعلیم کا پھیلانا نہایت ضروری ہے۔ جو سکول اسوقت دیہات میں موجود ہیں اول تو انکی تعداد نہایت ہی قلیل ہے۔ دوسرے انکا طریق تعلیم ناقص ہے۔ کچھ عرصہ تک بچے باقاعدہ ان سکولوں میں حاضری دے کر پھر سکول کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ دیتے ہیں۔ جب سکول میں تعلیم پاتے ہیں تو کچھ نہیں سیکھتے اور اکثر فیل ہو جاتے ہیں۔ نصابِ تعلیم، دیہاتی تعلیم کے مطابق نہیں ہوتا۔ انکی کثیر تعداد پہلی جماعت میں ہی پڑی رہتی ہے۔ تعلیم نہایت ادھوری ہوتی ہے اور استاد ناقابل ہوتا ہے۔ استاد کو جس قدر قلیل تنخواہ دی جاتی ہے وہ اس کا بھی مستحق نہیں ہوتا۔ اول تو وہ سند یافتہ نہیں ہوتا اور اگر ٹرینڈ ہو تو اس کی تعلیم نہایت گھٹیا درجہ کی ہوتی ہے بلکہ جو کچھ اس نے حاصل کیا تھا اسے بھلا چکا ہوتا ہے۔ اس کے گرد و پیش کے حالات سے ایک نہایت باقاعدہ اور کامل زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ اسے نئی کتابیں مطالعہ کے لئے نہیں ملتیں۔ اسے کوئی سچا رہنما نہیں ملتا۔ دماغی ترقی کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔ سرکاری انسپکٹر سال میں ایک یا دو مرتبہ معاینہ کرتا اور چند عالم نقص نکال کر اور اپنی رائے کا اظہار کر کے چلا جاتا ہے۔ یہ امر صاف طور پر واضح ہے کہ تعمیری نگرانی کی سخت ضرورت ہے۔ اگر اس پر خاطر خواہ عمل کیا جائے تو روپیہ کی بچت بھی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ایم۔ ایس ہیمین نے "سکول کی نگرانی کی قیمت" میں تجربہ کی بنا پر کہا ہے۔

(ا) مقابلہ کرنے سے یہ ثابت ہوا کہ جن سکولوں کی نگرانی کی گئی ان کے طلبا نے تخمیناً دیگر سکولوں سے ۹ ماہ کے عرصہ میں ۹۴ فیصدی ترقی کی۔

(ب) اس بنیاد کو زیر نظر رکھتے ہوئے اور اس قسم کے تعلیمی مواد کے نمونے کی مجلس قیمت پیش نظر رکھتے ہوئے ایسے نگراں کی خدمات کی قیمت جو اپنے خلقہ زیر نگرانی میں اس نسبت سے نمایاں فرق پیدا کر سکے اس کی ان خدمات کا معاوضہ ۴۰۱۰۲ ڈالر سالانہ ہونا چاہیئے۔ سرکاری رپورٹیں اس بات کی شاکی ہیں کہ جو روپیہ کثیر مقدار میں ابتدائی تعلیم پر خرچ کیا جاتا ہے اس کے نتائج ترقی تعلیم کا لحاظ رکھتے ہوئے نہایت حوصلہ شکن ہوتے ہیں۔ نگرانی کے ذریعے اس قسم کا بہت سا خرچ بچایا جا سکتا ہے۔ میں اپنے ساتھی کارکنوں سے کو مخاطب کر کے یہ سطور لکھ رہا ہوں۔

سب سے پہلے ہم کو یہ بات صاف طور پر سمجھ لینی چاہیئے کہ نگرانی کے کیا معنے ہیں؟ کیونکہ اکثر اوقات ہم جس چیز کو نگرانی خیال کئے ہوتے ہیں وہ دراصل نگرانی نہیں ہوتی اور ہم اس کے غلط معنے ہیں۔ آیئے ہم مل جل کر اس مسئلہ پر غور کریں۔ نگرانی کا مقصد کیا ہے؟ تعلیمی نگرانی کی سہل ترین تعریف استادوں کی تعلیم ہے۔ یعنے انہیں تعلیم دینے کی تعلیم دینا ہے۔ اگر ہمارے معاینہ کے بعد استاد کوئی نئی بات سیکھ نہیں سکے تو اس کے یہ معنے ہے کہ ہم نے نگرانی میں کوتاہی کی ہے۔ نگرانی تعمیری اور دوستانہ فرایض کی ادائیگی کا نام ہے نہ کہ تباہی اور نکتہ چینی کا۔ لیکن یہ کسقدر سچ ہے کہ ہم سکول میں محض معاینہ اور نکتہ چینی کی غرض سے داخل ہوتے ہیں۔ ہم استادوں کی اصل مشکلات اور ان کے مسائل کے حل کی تہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی جاتی ہم چند بری علامات دیکھتے ہیں اور جنہیں ہر ایک آدمی دیکھ سکتا ہے اور ہم انکی شکایت استاد سے کرتے ہیں۔ لیکن ہم انکی وجہ جاننے ان کے اثر اور ان کے علاج کے متعلق کیا کوشش کرتے ہیں؟ کیا ہم محض استاد کو پست ہمت اور شرمندہ کرنے لگتے ہیں یا اسکی حوصلہ افزائی کرنے میں مددگار ہوتے ہیں؟ اسے بہت سی ناکامیوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔

(باقی آئندہ)

مذہب

زکوۃ

یعنی

شاہی دربار میں نذرانہ اور اسکے فوائد

(از مولانا فضل الرحمن صاحب مہاجر کابلی)

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم امابعد۔ ہر چند کہ زکوۃ بنج بنائے اسلام میں داخل اور نہایت ضروری رکن اسلام ہے اور جہاں پر قرآن مجید نے نماز کا حکم فرمایا وہیں پر زکوۃ کو بھی ساتھ ہی ساتھ شامل کیا قرآن میں بہت کم ایسے مواقع ملیں گے جہاں کہ نماز کی فرمائش ہو اور زکوۃ کی نہ ہو۔ اور ایسے مواقع بھی یقیناً کہ جہاں صرف زکوۃ کا تذکرہ ہے اور نماز کا نہیں۔ غرضکہ دونوں حکم نہایت موکد اور ضروری ہیں۔ مگر چونکہ نماز میں بظاہر کچھ خرچ نہیں ہوتا اس لئے اس میں اتنی پس وپیش نہیں کیجاتی مگر زکوۃ چونکہ خرچ کرنے کا نام ہے اور طبیعت کو خرچ کرنا گوارا نہیں اسلئے اسکے ادا کرنے میں تامل کرتے ہیں اور محض بے فائدہ تاوان، جرمانہ سمجھ کر اس سے گھبراتے ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ ہم کو اسکی خوبیاں اور فوائد معلوم نہیں اگر معلوم ہو جاویں تو پھر ممکن ہے کہ تامل اور تردد باقی نہ رہے۔ اسکے متعلق پہلے اس سے کہ کچھ فوائد گن کر بتلائے جاویں اس قدر عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ چونکہ یہ فریضہ زکوۃ منجملہ ان احکام کے ہے جنکو حکیم مطلق نے مقرر فرمایا ہے تو انسان کو چاہئے کہ اسکے متعلق یہی خیال رکھے کہ اس میں ضرور بے شمار خوبیاں اور فائدے ہونگے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کا کوئی کام اور کوئی حکم مصلحت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جب ہم ایک ہوشیار انسان کے کام کو بے فائدہ اور عبث ماننے کے لئے تیار نہیں تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ہم جس ہستی کو تمام عالم کا معبود قرار دیتے ہیں اور مستحق پرستش سمجھتے ہیں اس کا کوئی حکم عبث اور بے فائدہ ہو۔ ہرگز نہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ انسانی سمجھ سے وہ مصلحت اور خوبی بالاتر ہو اور ہم باوجود کوشش کے اسکی مصلحت کو دریافت نہ کر سکتے ہوں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ اس میں کوئی مصلحت اور خوبی نہ ہو۔

اب اصل مقصد پر آتا ہوں اس کی تمام خوبیاں اور فائدے تو مشکل ہے کہ بیان ہوں۔ ہاں جسقدر علما کے بیان سے احقر نے اخذ کئے ہیں وہ ناظرین کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔

اس فریضہ میں انسانی سمجھ کے مطابق دو قسم کی خوبیاں اور فائدے ہیں۔ اول قسم کے وہ فائدے ہیں جو دینے والے کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوئم قسم کے وہ فائدے ہیں جو کہ شہر اور ملک کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ اول قسم کے فوائد ان نمبروں سے آپ کو واضح ہونگے۔

(۱) یہ بالکل مسلم ہے کہ انسانی طبیعت اول درجہ کی لالچی اور بخیل واقع ہوئی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بخل اور لالچ نہایت بری اور قبیح خصلت ہے۔ جس طرح بزدلی اور نامردی کو شجاعت کے مقابلہ میں ایک بُری اور قبیح خصلت سمجھتے ہیں۔ اسی طرح بخل کو سخاوت کے مقابلہ میں قبیح سمجھنا لازمی ہے۔ اب جو طریقہ بھی اس بری خصلت ہم کو نجات دے وہ بے شک مفید اور نافع سمجھا جائیگا اور وہ طریقہ ایک ہی ہے وہ یہ ہے کہ طبیعت کو دینے کی عادت ڈالی جاوے۔ اور اس پر لازمی کیا جاوے کہ اپنی خواہش کے خلاف وقتاً فوقتاً کچھ حصہ مال کا اپنے سے جدا کرتا ہے۔ اور اس صورت سے بخل کی شدت اور تیزی کو مٹایا جائے۔ طبیبوں کے یہاں علاج بالضد مثل کیطرح مشہور ہے یعنے گرمی کا علاج سرد دوا سے کیا جاتا ہے اور سردی کا علاج گرم دوا سے۔

(باقی آئندہ)

سائنس

درازی عمر اور اسکی حقیقت

(از سعید انصاری صاحب)

دودھ کی غذا بہترین غذا ہے

اکثر لوگوں کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ انکی عمر سو سال سے زیادہ ہے۔ لیکن جب ذرا تحقیق کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سو سال کے بھی نہیں۔ عمروں کے متعلق لوگوں کا حافظہ اکثر بہت ضعیف ہوتا ہے اور گھر کے بڑے بوڑھے یا پاس پڑوس کے لوگ عمر کے بتانے میں اکثر غیر معمولی مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ چند سال ہوئے امریکہ میں جان شل نامی ایک شخص کی نسبت لوگوں کا بیان تھا کہ اسکی عمر ۱۳۱ سال کی ہے۔ لیکن جب ذرا تحقیق سے دریافت کیا گیا تو پتہ چلا کہ آپ ۱۰۰ سال کے بھی نہیں ہیں۔

سنہ ۱۹۰۴ء میں ایک روسی اخبار نے ایک عورت کے انتقال کی خبر شایع کی جسکے بارے میں اس نے لکھا کہ وہ ۱۸۰ سال کی ہو کر مری ہے سنہ ۱۹۲۶ء میں ایک دوسرے روسی اخبار نے ذرا کسی قدر خاکساری سے کام لیا تو ایک روسی کسان کے متعلق شایع کیا کہ اس نے ۱۳۸ سال کا ہو کر وفات پائی ہے۔ ایک ہنگری کا کسان ان سب سے بھی بازی لے گیا۔ جسکے متعلق بیان ہے کہ وہ سنہ ۱۷۲۴ء میں ۱۸۵ سال کی عمر میں مرا ہے۔ اور ایسا ہی سنہ ۱۷۸۱ء میں ایک اور شخص کے متعلق بھی مشہور ہے۔

یہ تو خیر سب پرانے قصے ہیں۔ ابھی حال میں ایک فرانسیسی سیاح جارجیہ (روس) کی سیاحت کے لئے گیا تھا جہاں وہ ایک شخص سے ملا جسکی عمر ۱۴۲ اور ۱۴۷ کے درمیان تھی۔ ناظرین "پیام تعلیم" کو اگرچہ ان عمروں کے متعلق یقین نہیں آتا ہوگا۔ پھر وہ اس سے دلچسپی ضرور لے رہے ہونگے

اب ذرا بعض شخصیتوں کی عمر کا حال سنئے جنکے متعلق کسی کو شک و شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا لیکن جب تحقیق و تفتیش کی کسوٹی پر دیکھے گئے کہ وہ کیسے نکلے۔

دنیا کے مشہور ترین معمر لوگوں میں ایک شخص گزرا ہے اولڈ پار (Old Parr) وہ سنہ ۱۴۸۳ء میں انگلستان میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۶۳۵ء میں مرا۔ اس حساب سے اسکی عمر ۱۵۲ سال کی ہوتی ہے۔ وہ اس سن کے پہنچنے تک نہایت محنت اور خندہ پیشانی کے ساتھ ہر قسم کا کام کرتا تھا لیکن ایک شخص اسے نمایش کے لئے لندن اٹھا لے گیا، جہاں کی آب و ہوا اور فضا اسے موافق نہیں آئی اور وہ جان بحق تسلیم ہوگیا۔ اسکے انتقال پر جان ٹیلر نامی ایک شاعر نے اس "ضعیف ضعیف مرد ضعیف" کے مرثیہ میں ایک طویل نظم لکھ ڈالی۔ پار کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے ۱۲۰ سال کی عمر میں شادی کی اور شادی سے کچھ عرصہ بعد ایک بچہ کا باپ ہوا۔ اس بوڑھے شخص کے انتقال کے بعد انگلستان کے ایک مشہور ڈاکٹر ولیم ہاروے نے اس کا طبی امتحان کیا تو معلوم ہوا کہ اسکی عام حالت بالکل درست ہے، صرف دماغ کے مسامات پر کچھ اس کہنگی کا اثر پڑا ہے

بہرحال تو بتانا یہ ہے کہ آیا پار صاحب کی یہ عمر صحیح بھی تھی؟۔

سنہ ۱۸۷۳ء تک لوگوں کو یقین تھا کہ پار کی عمر ۱۵۲ سال ہے لیکن طامس نامی ایک شخص نے جو دار الامرا انگلستان کے کتب خانہ کا مہتمم تھا، اس نے جرأت کر کے اسکی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اسکی عمر سو سال سے کچھ ہی زیادہ ہے اور صرف ۵۰ سال کا اس میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اسی شخص نے دو اور ایسے ہی طویل العمر آدمیوں کی عمروں کو غلط ثابت کیا ہے۔ ایک عورت کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ۱۴۰ سال کی ہے۔ لیکن جب تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس نام کی دو عورتوں کی عمروں کو ایک ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ جن میں سے ہر ایک کی عمر ۷۰، ۷۰ سال کی تھی۔ اس طرح اس نے ۲۲ اشخاص کی عمروں کی تحقیق کی جو سو سال سے زیادہ کے مشہور تھے لیکن پتہ لگانے پر معلوم ہوا کہ ان میں سے ہر ایک کی عمر سو سال کے اندر رہی تھی۔

اس موضوع پر سب سے زیادہ تحقیق کے ساتھ ۱۸۹۹ء میں ٹی آر نیگ نامی ایک شخص نے لکھا ہے اور اپنی اس کتاب میں اُس نے ۲۴ ایسے اشخاص بتائے ہیں جن کی عمریں سو سال سے زائد مسلم ہیں۔ اسکی تحقیق میں زیادہ سے زیادہ عمر صرف ۱۱۱ سال ہے، اس سے ۱۰ سال پیشتر ایک شخص نے ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس نے ۱۲۷ اشخاص کے نام گنائے ہیں جن کی عمریں سو سال یا سو سال سے زائد تسلیم کیجاتی ہیں

ایک اور پروفیسر نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جسمیں اس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ انسان کی اوسط عمر ۱۲۰ سال ہونی چاہیئے۔ اور اوسکی تحقیق میں سب سے طویل العمر شخص ۱۵۰ برس کا ہے جسکے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ زیادہ تر پنیر اور بکری کے دودھ پر اپنی گزران کرتا تھا پروفیسر موصوف نے ایک اور شخص کا ذکر کیا ہے۔ جو ۱۱۰ سال کا ہوکر مرا ہے اسکی غذا کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ زیادہ تر دودھ اور روٹی تھی۔

امریکہ کے ایک اور شہر میساچوسٹس میں ایک شخص کا مجسمہ جو ایک سو سترہ سال کا ہوکر مرا مجسمہ کے نیچے لکھا ہے کہ "یہ شخص ۱۱۰ برس کی عمر میں بلا کسی مدد کے گھوڑے پر چڑھ جاتا تھا" لیکن جب تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اسکی عمر سو سال سے زیادہ نہ تھی۔ بہرحال اس عمر تک بھی پہنچنے کا سبب بتایا جاتا ہے کہ اسکی غذا تھی جسمیں دودھ اور روٹی خاص طور پر شامل تھا۔

سوال یہ ہے کہ آیا درازی عمر پر غذا کا کہانتک اثر ہوتا ہے؟ اس کے متعلق کولمبیا یونیورسٹی (امریکہ) کے معمل الکیمیا میں یونیورسٹی کے پروفیسر دس سال سے سفید چوہوں پر اس کا تجربہ کر رہے ہیں۔ دوران تجربہ میں انھوں نے ۱۰۰ ہم چوہوں کو دودھ ملی ہوئی غذا دی جسکے اثر سے ان کی عمریں دوسرے چوہوں اور چوہیوں سے کہیں زیادہ ہوگیا اس سے انھوں نے یہ دریافت کیا ہے کہ اگر ان کی غذا میں دودھ شامل رہے تو اس کی عمر بہت زیادہ ہوگی اور تاریخ سے بھی یہ ثابت ہے جن لوگوں کی عمریں سو سال یا اس سے زیادہ بیان کی جاتی ہیں، ان کے متعلق اگر دریافت کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ انکی غذا میں دودھ یا اسکی مختلف صورتیں بہت زیادہ شامل تھیں۔

دوسرا اثر نسل کا بھی ہوتا ہے۔ اگر کسی قوم کے آبا و اجداد نے بڑھی بڑی عمریں پاکر انتقال کیا ہے تو انکی اولاد میں بھی، اگر دوسرے ناگوار حالات مثلاً بیماری وغیرہ درپیش نہ آئیں تو وہ بھی طویل العمر ہوں گی۔ لیکن باوجود طویل العمر آبا و اجداد کی نسل سے ہوتے ہوئے اگر غذا کا فرق آپڑا تو ان کی عمروں میں بھی تفاوت ہو جائیگا پروفیسر شرمین نے ایک ہی نسل کے دو چوہوں پر مختلف غذا کا تجربہ کیا تو نتیجہ یہ نکلا کہ جن چوہوں کی غذاؤں میں دودھ کے اجزا شامل رہے، وہ زیادہ عرصہ تک زندہ رہے، بہ نسبت انکے جنکی غذائیں دوسرے اجزا پر مشتمل تھیں۔

چوہوں کو چھوڑ کر ایک ہی ماں کے ایک ساتھ پیدا شدہ دو توام بچوں پر بھی تجربہ کیا گیا ہے اور نتیجہ یہی نکلا ہے کہ جس بچہ کی غذا میں دودھ اور اس سے متعلق زیادہ شامل تھے۔ اسکی عمر زیادہ ہوئی بہ نسبت اسکے جسکی غذا میں یہ اجزا کم تھے۔

غرض موجودہ سائنس نے یہ اچھی طرح ثابت کردیا ہے کہ اگر غذا میں دودھ یا اور اس کی دوسری شکلیں زیادہ سے زیادہ شامل رکھی جائیں تو اوسطاً عمر میں اضافہ ہو گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کے صحت و صفائی، آب و ہوا اور دوسری ان معاشرتی حالات کا لحاظ بھی اسی قدر ضروری ہے، جو عام حالات میں ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔

(ماخوذ از "سائنٹفک امریکن" اپریل ۱۹۳۰ء)

جغرافیہ

تحفۂ نیل

(از سید نصیر احمد صاحب)

اگر تم نقشہ پر نظر کرو تو تم مصر کا عجیب و غریب ملک دیکھو گے جسکے شمال میں بحیرۂ روم، مشرق میں فلسطین اور بحیرۂ احمر، جنوب میں سوڈان اور مغرب میں طرابلس ہے۔ اس کے بیچوں بیچ دریائے نیل ایک تنگ وادی میں سے گزرتا ہے۔ یہ راستہ اس نے صدیوں میں اپنے لئے خود بنایا ہے۔

نیل ابیض بہت سی مٹی اپنے ساتھ بہا کر لاتا ہے اور نیل ارزق جو خرطوم کے پاس نیل ابیض سے مل جاتا ہے بہت سا پانی۔ یہ دونوں دریا ملنے کے بعد دریائے نیل کہلاتے ہیں اور اس میں سال کے ایک حصہ میں اتنا پانی ہو جاتا ہے کہ طوفان آجاتا ہے۔ اور زمین پر قیمتی سیاہ مٹی بچھ جاتی ہے۔ یہ مٹی دریا کے دہانے کے پاس بھی جمع رہتی ہے اور وہاں پنکھے کی شکل کا ایک ڈیلٹا بن جاتا ہے۔ تنگ وادی کو بالائی مصر اور ڈیلٹا کو زیریں مصر کہتے ہیں۔ یہ دونوں حصے ملکر مصر کہلاتے ہیں اور لوگ اسے بجا طور سے تحفۂ نیل بھی پکارتے ہیں۔

مصر کے زمانۂ قدیم کی تاریخ سے سب واقف ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مصر کے باشندے قدیم لوگوں کی نسل سے ہیں یا حملہ آوروں نے ان سب کا خاتمہ کر دیا؟ اسکا جواب یہ ہے کہ ان حملہ آوروں کی وجہ سے بادشاہ، امرا اور نواب تو مٹ مٹا گئے لیکن کاشتکاروں کا گروہ باقی رہا۔ مصر کی آبادی کی اکثریت انہیں کاشتکاروں اور کسانوں کی ہے۔ شروع زمانہ میں مصر کی تقریباً ساری آبادی عیسائی تھی لیکن جب حضرت عمرو بن العاص رض نے مصر کو فتح کیا تو تمام ملک میں سرعت کے ساتھ اسلام پھیل گیا۔ اسوقت مصر میں کوئی نصف لاکھ کے قریب نصرانی ہیں۔ یہ لوگ شہروں میں رہتے ہیں اور یا تو گھڑی ساز ہیں یا درزی۔

مصر میں اگرچہ ریل ہے لیکن اگر کوئی اس ملک کا اچھی طرح مطالعہ کرنا چاہے تو اسے دریا سے سفر کرنا چاہئے جو قدیم شاہراہ ہے۔ دریائے نیل کا رنگ گندمی ہے اور یہی رنگ ان کسانوں کا ہے جو دن بھر کھیتوں میں محنت کرتے اور ہل چلاتے ہیں۔ ان کا ہل اسی قسم کا ہے جیسا کہ انکے آباؤ اجداد کا آج سے چار ہزار برس پیشتر تھا۔ مصر میں کپاس کے علاوہ مکی، گیہوں، گنے، کھجور اور اچھے اچھے پھل بھی ہوتے ہیں۔ گنے اسی طرح بکتے ہیں جس طرح ہمارے ہندوستان میں۔

دریائے نیل کے کنارہ جتنے شہر ہیں وہ کئی لحاظ سے دلچسپ ہیں۔ اسیوط میں شالیں نہایت عمدہ تیار ہوتی ہیں اور انگلستان تک جاتی ہیں۔ قینا میں نہایت نفیس برتن بنتے ہیں۔ لکسور نہایت پر فضا جگہ ہے اور اکثر سیاح اور مسافر یہاں آکر ٹھیرتے ہیں۔ اسی کے پاس کسی زمانہ میں شہر تھیبس تھا۔ جسکے ایک سو دروازے تھے۔

اسوان، شروع میں مشہور شہر رہا ہے۔ یہیں سے شمال افریقہ جانے کے لئے قافلے روانہ ہوتے تھے۔ اور یہیں وہ سرخ پتھر ملتا تھا جو قدیم مصری اپنے مندروں اور مجسموں میں استعمال کرتے تھے۔ اسوقت اسوان میں ایک دلچسپ چیز، وہ بند ہے۔ جسکا طول کوئی سوا میل ہے اور جسکے ۱۸۰ دروازے ہیں۔ جسوقت یہ دروازے بند کر دئے جاتے ہیں تو دریا کا تمام پانی رک کر ایک جھیل کی سی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

تاریخ

عمرو بن العاص رضؓ فاتح مصر اور شہر فسطاط کی آبادی

(گذشتہ سے پیوستہ)

(از جناب راغب احسن صاحب)

رسد یابی کا انتظام کیا۔ پلوں اور سڑکوں کی مرمت کی اور دشمن کی خبر پہونچانے کے لئے اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈالا۔ یہ سب صرف اسوجہ سے تھا کہ حضرت عمرو بن العاص رضؓ نے اپنی عقلمندی ورحمدلی سے اہل مصر کے دلوں کو ملک مصر کی فتح سے پہلے فتح کر لیا تھا۔ پورے ملک کی فتحیابی کے بعد بھی آپ نے عدل وشفقت اور عقل وحکمت کے اصول پر ملک کا انتظام کیا۔ خوشحالی وشادابی سے ملک مالا مال اور قوم شاداں وفرحاں ہوئی۔ مسلمانوں اور قبطیوں کی یہ دوستی جسکو حضرت عمرو بن العاص رضؓ نے قایم کی تھی برابر قایم رہی۔ بڑے بڑے انقلاب ہوئے لیکن ان کی دوستی میں فرق نہ آیا۔ عربوں نے مصر کو ایک عربی ملک بنا دیا اور رفتہ رفتہ سارا ملک مسلمان ہو گیا۔ لیکن قبطیوں کی قلیل آبادی آجتک مسلمانوں کی غالب اکثریت پر اعتماد رکھتی ہے، اور ان کو اپنا ملکی وقومی بھائی بندجانتی ہے۔ مسلمان ان کے مذہب، معیشت اور سیاسی حقوق وآزادی کے ہمیشہ سے محافظ وضامن رہے ہیں اور اسوقت بھی ہیں۔ آج مصر میں ایک مسلم سے قبطی کو پہچاننا مشکل ہے۔ قبطی ملکی پارلیمان ملکی مجالس اور ملکی نظام میں حصہ دار ہیں۔ اسوقت وفد المصری کے نمایندے وزیر خارجہ برطانیہ سے لندن میں اپنے ملک کی آزادی کے مسئلہ پر مذاکرہ کر رہے ہیں۔ اس وفد مصری کے ممتاز رہنماؤں میں قبطی لیڈر شامل ہیں اور قومی آزادی وبہتری کے لئے اپنے مسلم دوستوں کی ویسے ہی مدد کر رہے ہیں جیسے ان کے اسلاف نے حضرت عمرو بن عاص رضؓ کے عہد میں رومیوں کے خلاف مدد کی تھی۔

بیان بالا سے حضرت عمرو بن عاص رضؓ کی رحمدلی وتدبیر اور اسکا عظیم الشان اثر کا حال معلوم ہوا کہ کس طرح آجتک ان کی قایم کردہ دوستی مصر میں مضبوط بنیادوں پر مستحکم عمارت کی طرح کھڑی ہے۔ لیکن ابھی ایک نہایت دلچسپ و معنے خیز واقعہ کا بیان باقی ہے۔ اس واقعہ سے انکی کایا پلٹ کا سب سے روشن ثبوت ملتا ہے۔ مصر کی فتح کے سلسلہ میں دو مقامات پر طویل اور زبردست جنگ ہوئی۔ اول قصر الشمس میں مصر کے قبطی بادشاہ مقوقس سے اور دوم اسکندریہ میں رومیوں سے۔ قصر الشمس ایک مضبوط قلعہ کا نام تھا جو دریائے نیل اور جبل مقطم کے بیچ میں واقع تھا۔ اس کے گرد کف دست میدان تھا۔ یا چراگاہ کوئی آبادی نہ تھی۔ مقوقس اور رومی سات مہینے تک اس قلعہ میں محصور ہو کر مقابلہ کرتے رہے لیکن آخر مسلمانوں نے قلعہ فتح کر لیا۔ مقوقس نے صلح کی درخواست کی۔ حضرت عمرو رضؓ نے نہ صرف اسکی جان بخشی کی بلکہ اسکی ساری قوم کو امان دے دی۔ اس اتحاد ودوستی کو باہمی دعوت و محبت سے زیادہ پائیدار کیا گیا۔ جب اس شکست کی خبر رومیوں کے شہنشاہ ہرقل کو ملی تو اس نے مقوقس کو بہت لعن طعن کیا اور زبردست رومی فوج اسکندریہ میں اتاری تاکہ عربوں سے ملک مصر کو بچائے۔ جب حضرت عمرو بن عاص رضؓ کو رومیوں کی تیاری کی اطلاع ملی تو اسکندریہ کی طرف فوج کو کوچ کا حکم دیا۔ اتفاق سے عمرو رضؓ یعنے سپہ سالار اعظم کے خیمہ میں ایک کبوتر نے گھونسلا بنا لیا تھا۔ خیمہ اکھاڑا جانے لگا تو عمرو رضؓ کی نگاہ پڑی۔ حکم دیا کہ اس خیمہ کو کھڑا رہنے دو کہ ہمارے مہمان کو تکلیف نہ ہونے پائے۔ چنانچہ وہ خیمہ یکہ وتنہا اس میدان کف دست میں چھوڑ دیا گیا تاکہ ایک کبوتر ویران اور خراب نہ ہونے پائے۔

جب اسکندریہ کی فتح کے بعد تمام مصر زیر ہو گیا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ مصر کی اسلامی دار السلطنت کس مقام کو بنایا جائے۔ پہلے اسکندریہ پر نگاہ پڑی کیونکہ وہ ایک بڑا اور تاریخی شہر تھا اور رومیوں کی بنائی ہوئی عمارات اس میں بکثرت موجود تھیں۔ لیکن یہ تجویز رد ہوئی اور حضرت عمر فاروق رضؓ خلیفہ ثانی اور حضرت عمرو بن عاص فاتح مصر کے اتفاق سے قصر الشمس کے مقام پر نئی دار الحکومت کی تجویز ہوئی۔ (باقی آیندہ)

قصے کہانیاں

پنچکی والا

(از رقیہ ریحانہ)

انوپ شہر سے اچھے خاصہ فاصلہ پر ایک گانوں ہے میکھنا۔ گانوں سے کچھ دور نہر کے کنارے ایک پنچکی تھی۔ اس میں میکھنا کے سب کسان شادی بیاہ کے لیے جب بہت اناج پسوانا ہوتا تو گیہوں، جو وغیرہ پسواتے تھے اور روز کے خرچ کے لیے بھی بہت سے لوگ یہاں سے آٹا خرید لیا کرتے تھے۔ اس پنچکی کا مالک بہت ہی کنجوس آدمی تھا۔ اس کا نام ہمیں معلوم ہے مگر تمہیں اسلئے نہیں بتاتے کہ سنا ہے کہ ویسے کنجوس آدمی کا نام صبح صبح لے لو تو روٹی نہیں ملتی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم صبح صبح اس قصہ کو پڑھو اور دن بھر بھوکا رہنا پڑے۔ یہ کنجوس پنچکی والا آٹا ہی نہیں بیچتا تھا بلکہ کسانوں کو سود پر قرض بھی دیتا تھا۔ بونے کی فصل میں بیج بھی ادھار دیا کرتا تھا اور فصل کٹنے پر دونا چوگنا اناج وصول کرتا تھا۔ جس نے اس سے ایک دفعہ روپیہ قرض لے لیا بس اب پھنسا کہ کبھی اسکے قابو سے نکلنا نصیب نہیں ہوا، بہت سے کسانوں کے کھیت اس نے سود بڑھا بڑھا کر خرید لئے اور ان بے چاروں کو اب مزدور بنا کر اسی زمین پر کام لیتا تھا۔ اور ہر وقت اسی فکر میں رہتا تھا کہ اسے پھانسوں اسے پھانسوں۔ گانوں والے سب اس سے جلتے تھے جی ہی جی میں برا جانتے تھے۔ مگر کیا کریں ضرورت بری بلا ہے۔ پھر وقت پڑے اسی کے پاس جاتے تھے۔

ایک روز کا قصہ ہے کہ دن مندے ایک بوڑھا اسکے دروازہ پر آیا۔ اسکی داڑھی بہت لمبی تھی اور سفید جیسے براق۔ اس نے دروازہ پر آکر آواز دی "بابا اللہ بھلا کرے۔ اللہ کے نام پر مانگتا ہوں۔ بھوک بری چیز ہے اللہ نے تجھے بہت دیا ہے۔ غریبوں کو بھی کچھ دے۔ اللہ تجھے دونا دے گا۔" پنچکی والے نے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے میاں، بھوک جتنی تیز ہوتی ہے آٹا اتنا ہی مہنگا ہوتا ہے۔ میرے پاس تو آٹا بیچنے کو ہے۔ بانٹنے کو نہیں۔ میں غریبوں کو دوں، اس سے پہلے تو یہ نہر کا پانی ہی سوکھ جائے گا۔" "اچھا بابا" بوڑھا بولا۔ "اچھا تو یہ بھی ہو جائے گا" یہ کہہ کر بڈھا تو اندھیرے میں جنگل کی طرف چل دیا اور غائب ہو گیا۔ پنچکی والا کچھ بکتا جھکتا اٹھا۔ اٹھ کر دروازہ بند کیا اور یونہیں بڑبڑاتا ہوا جا اپنی ٹوٹی سی کھٹیا پر لیٹ گیا۔ آدھی رات گئے ایسا شور ہوا اور ہر طرف سے سائیں سائیں، زائیں زائیں کی آواز آنا ایسی شروع ہوئی کہ پنچکی والا بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ آندھی کا یہ حال کہ سارا گھر ہل رہا تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ چھت بس اب اڑی تب اڑی دیواریں تک ہل رہی تھیں۔ اور ادھر چکی بند ہو گئی تھی۔ نہر کا پانی غائب تھا پنچکی سے کچھ ہی فاصلہ پر سارا پانی زمین کے اندر غائب ہو گیا تھا۔

پنچکی والے پر یہ اللہ کا عذاب آیا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو اسے سمجھتا اور توبہ کرتا۔ مگر اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا۔ "اچھا اچھا میرے پاس ابھی آٹا ہے۔ چکی بند ہو گئی تو کیا۔ اپنا پانی چھین لیا تو کیا میرا آٹا بھی چھین لے گا۔"

یہ کہہ ہی رہا تھا کہ کھڑکی کے پاس وہی بوڑھا پھر دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر چکی والا اور بھی جھلایا اور بہت ڈانٹ کر پوچھا کہ "اب پھر کاہے کو آیا ہے۔ اب کیا مانگتا ہے"۔ بوڑھا بولا "توبہ کر توبہ کئے پر بھیجا۔ تو نے اللہ سے گستاخی کی۔ اور اسکے بندوں کو ستایا۔ بھوکوں کو آٹا دے۔ اللہ معاف کرے گا۔ نہیں تو جس نے تیری چکی بند کر دی ہے وہ تیرا آٹا بھی چھین سکتا ہے۔"

چکی والے کو یہ باتیں بہت ہی بری لگیں اور بڑے غصہ میں آکر اس نے کہا۔ "اچھا اچھا بس بہت مت بکو۔ اچھا وہ میرا آٹا بھی لے لے۔ مجھے بھی لے لے۔ دیکھوں میں بھی تو اسے دیکھوں" بوڑھا یہ باتیں سنکر چلا گیا۔ لیکن بہت دن نہ گذرے تھے کہ ایک روز رات کو

بڑا سخت طوفان آیا۔ ایسا اندھیرا ہوگیا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں ملتا تھا۔ اور وہ شور وہ شور کہ خدا کی پناہ بادل ایسے گرج رہے تھے کہ کانوں میں انگلیاں دھر و تب بھی دل ہلا جائے۔ بجلی ایسی چمک رہی تھی کہ آنکھیں چندھیائی جاتی تھیں۔ اور کڑک کے مارے زمین ہل رہی تھی۔

ایک دفعہ اس زور سے بجلی چمکی کہ بس دن سا ہوگیا۔ اور ایسی کڑکی ہے کہ الاماں۔ کڑک کر بجلی بن چکی پر گری اور ساری چکی اور مکان اس طرح جلنے لگے جیسے کسی نے بھس میں آگ لگادی ہو۔ آگ کی لپٹ سے اِدھر اُدھر کے پیڑ سب جھلس گئے اور پانی کا نام نہ تھا کہ کوئی بجھاتا اور پانی ہوتا بھی تو کوئی اس آگ میں کیا کرلیتا۔ چکی والا سارے جنگل میں دیوانوں کی طرح بھاگا بھاگا پھرتا تھا کہ لوگو دوڑو۔ لوگو دوڑو۔ مدد۔ مدد۔ مدد۔

یہ اسی طرح بوکھلایا ہوا دوڑ ہی رہا تھا کہ وہی بوڑھا سامنے آیا اور بڑی نرمی سے بولا۔

" بھائی میاں۔ اب میں آخری مرتبہ تمہارے سامنے آیا ہوں۔ اس لئے کہ تم مدد مدد پکار رہے ہو۔ اور میرا کام ہی مدد دینا۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے غرور چھوڑ، توبہ کر توبہ۔ اور اللہ کے بندوں کو ستا مت "

چکی والا یہ باتیں سنکر بس آگ بگولا ہی تو ہوگیا اور چلاکر بولا:۔

" بس بس۔ تیری مدد، تیری توبہ سب جائے بھاڑ میں۔ بے ایمان ہٹ سامنے سے۔ میری چکی لی، میرا آنا جلایا، اب جو میں ننگا بھوکا ہوں تو آئے ہیں مدد کو، بڑے آئے مدد کرنے والے، دور ہو سامنے سے "

بوڑھے نے پھر بہت نرمی سے سمجھایا۔ " میاں ابھی تمہارے پاس بہت کچھ باقی ہے۔ تم ابھی اپنے سارے گناہوں کو معاف کرا سکتے ہو بس ذرا اپنا ڈھیان بدلو۔ نیک بنو۔ نئی زندگی شروع کرو۔ میں بھی تمہاری مدد کرونگا "

چکی والے نے زور سے ایک آواز نکالی نہ جانے چیخ تھی نہ جانے قہقہہ۔ اور کچھ کھسیا کر کچھ روناکچھ غصہ کا منہ بنا کر کہا۔

" بس جا سامنے سے ہٹ۔ اب تجھے میری زندگی کی فکر ہے۔ اسے بھی لے کر بدلنا چاہتا ہے۔ بس چل لمبا ہو۔ میری زندگی میری ہے۔ اور کسی کو اس میں دخل نہیں۔ میں جو ہوں سو ہوں۔ وہی رہوں گا وہی میکھنا کا بن چکی والا "

یہ کہہ کر وہ پھر اِدھر اُدھر مجنوں کی طرح دوڑنے لگا۔ بڈھا غائب ہوگیا۔ صبح میکھنا کے لکڑہارے اور گڈریے جب جنگل کو گئے تو دیکھا کہ چکی والا ایک پیڑ کی شاخ سے مرا ہوا لٹکا ہے۔ اس نے خود اپنا گلا گھونٹ کر جان دے دی تھی۔

گانوں والوں کو خبر ہوئی تو انھوں نے آکر یہیں جنگل میں اسے کہیں گاڑ داب دیا۔ مگر سنا ہے کہ اس غریب کو قبر میں بھی چین نہیں ہے چاندنی راتوں میں کہتے ہیں کہ لوگوں نے اسے اِدھر اُدھر گھومتے دیکھا ہے۔ وہی آٹے سے بھرا ہوا کرتا۔ اور میلی جکیٹ ٹوپی پہنے گھومتا ہے اور راہ گیر اس سے ڈرتے ہیں۔

ایک خوفناک پرندہ

(" ع ")

کوئی سات آٹھ سو سال کا عرصہ ہوا جب لوگ اس قدر ہوشیار اور عقلمند نہیں تھے جیسا کہ آج کل میں ایک گانوں میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک بڑا سا جانور رات کے وقت اتفاق سے ایک امیر زمیندار کے باورچی خانہ میں جا گھسا اور چھت میں ایک جگہ بیٹھ گیا۔ جب صبح ہوئی تو نوکر کسی کام سے باورچی خانہ گیا اور اس جانور کے دیکھتے ہی مارے ڈر کے گر گیا اور جلدی سے اٹھ کر چیختا ہوا اپنے مالک کے پاس پہنچا اور کہا باورچی خانہ میں ایک جانور کہیں سے چلا آیا ہے۔ اسکی دو بڑی بڑی آنکھیں ہیں اگر کوئی اس کے قریب بھی گیا تو وہ کھا لے گا "

" میں جانتا ہوں تم کیسے بزدل ہو۔ تم جنگل میں چڑیوں کا شکار کرنے کے لئے اِدھر اُدھر بھاگ سکتے ہو اور اگر کہیں مری ہوئی مرغی دیکھ لو تو تمہارے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ چلو میں چلتا ہوں "

زمیندار ہمت کر کے دروازہ کے قریب پہنچا۔ لیکن جب اس نے اپنی آنکھوں سے اس خوفناک جانور کو دیکھا تو مارے ڈر کے باہر بھاگا اور اپنے ہمسایوں سے مدد کا ملتجی ہوا۔ آگ کی طرح یہ خبر تمام گانوں میں پھیل گئی۔ اور تقریباً گانوں کل گانوں زمیندار کے گھر جمع ہو گیا۔ لیکن اندر جانے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ دو نوجوان آدمیوں نے ہمت کی لیکن بیہوش ہو کر گر گئے۔ آخر ایک طاقتور سپاہی جو لڑائی میں اپنا نام پیدا کر چکا تھا آگے بڑھا اور کہا۔

"تم سب بزدل ہو۔ کیا صرف دیکھنے سے تم اس خوفناک پرندہ کا خاتمہ کر سکتے ہو۔ لاؤ میری زرہ اور تلوار لاؤ۔ زینہ بھی کہیں سے لاؤ۔"

جب سارا ساز و سامان تیار ہو گیا تو یہ سپاہی زینہ پر سے اوپر پہنچا الو بیچارہ اتنے آدمیوں کی وجہ سے گھبرا سا گیا تھا۔ اس نے جو ایک چیخ ماری تو سپاہی زینہ سے نیچے تھا۔ ڈر کی وجہ سے اسکا چہرہ زرد ہو گیا۔

اب الو کو مارنے کی کوئی تدبیر باقی نہیں تھی کیونکہ گانوں کا سب سے بڑا طاقتور اور بہادر آدمی بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔ آخر گانوں کے بڑے بڑے آدمیوں کا ایک جلسہ ہوا۔ جس میں اس بلا سے نجات پانے کا مشورہ کیا گیا۔ ایک بوڑھے کسان نے یہ رائے دی کہ اس مکان کو آگ لگا دینی چاہئے تاکہ یہ پرندہ اس میں جلکر مر جائے۔ اور گانوں کے سارے باشندوں سے چندہ کر کے اس زمیندار کو دے دینا چاہئے تاکہ وہ نیا مکان بنوائے اگر اس تجویز پر غور نہیں کیا گیا تو سارا گانوں تباہ ہو جائے گا بوڑھے میاں کی تجویز سے سب نے اتفاق کیا اور مکان کو آگ لگا دی گئی۔ جس کسیکو اس کہانی پر یقین نہ آئے وہ اس گانوں میں جا کر اپنی تسلی کر لے۔

(نظم)

حُبِّ وطن

(از حضرت سرور)

اس کنج دلنشیں میں قبضہ نہو خزاں کا
جو ہو گلوں کا تختہ تختہ ہو اک جناں کا
بلبل کو ہو چمن میں صیاد کا نہ کھٹکا
خوش خوش ہو شاخ گل پر غم ہو نہ آشیاں کا
حب وطن کا ملکر سب اک راگ گائیں
لہجہ جدا ہو گرچہ مرغان نغمہ خواں کا
ایک ایک لفظ میں ہو تاثیر بوئے الفت
انداز دل نشیں ہو ایک ایک داستاں کا
مرغانِ باغ کا ہو اس شاخ پر نشیمن
پہنچے نہ ہاتھ جس تک صیاد آسماں کا
موسم ہو جوش گل کا اور دن بہار کے ہوں
عالم عجیب دل کش ہو اپنے گلستاں کا
مل مل کے سب ترانے حب وطن کے گائیں
بلبل ہیں جس چمن کے گیت اس چمن کے گائیں

تصویری لطیفہ

(از سید منیر احمد صاحب)

۱۔ ایکدفعہ کا ذکر ہے کہ ایک آدمی جواہرت کی دکان کے سامنے کھڑا تھا اس آدمی اور چیسٹر میں دشمنی تھی۔ جبکہ چیسٹر کیلئے اس سے اچھا کونسا موقعہ تھا اس نے . . . .

۲۔ ایک نعل اٹھاکر شیشہ پر دے مارا شیشہ ٹوٹ گیا اس آدمی نے جب ٹوٹنے کی آواز سنی اسنے ارادہ کیا کہ جواہرات چرانے کا اس سے اچھا موقعہ کونسا ہوگا۔

۳۔ اتنے عرصہ میں چیسٹر بھاگ چکا تھا۔ اس آدمی نے یہ خیال کرتے ہوئے جواہرت پر چھپٹا مارا اور بہت سے جواہرت لے بھاگا۔

۴۔ وہ ایک کھڑکی کے نیچے جواہرت کو لیکر پہنچا سامنے ہی کانسٹبل رہتا تھا اس کھڑکی کے نیچے کھڑا رہا اتفاقاً یہ کھڑکی چیسٹر کے کھڑکی تھی وہ اوپر سے دیکھ چکا تھا جب اسنے دیکھا کہ کانسٹبل آرہا ہے

۵۔ وہ بھاگ کر اندر گیا اور ڈوہک والی رسیاں اٹھالایا اور نیچے لٹکا دیں جب انسپکٹر اس چور آدمی کے پاس پہنچا تو اس نے . . . .

۶۔ اسکے کوٹ میں ہک اٹھاکر رسیاں کھینچ لیں۔ اسطرح کانسٹبل نے اسکو پکڑ لیا اور چیسٹر کو انعام ملا۔

انعامی معمہ کا نتیجہ

(از اڈیٹر)
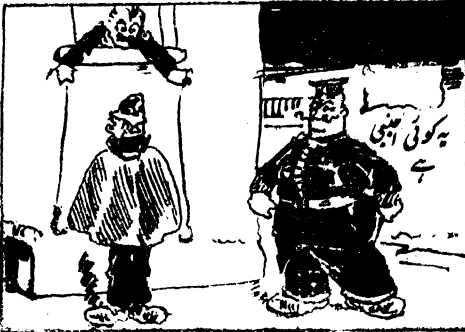
۷ر جون کے پیام تعلیم میں جو انعامی معمہ شایع ہوا تھا اس کا صحیح حل مندرجہ ذیل اصحاب نے ارسال کیا ہے:۔
سید غفور۔ محمد الیاس۔ انوار احمد۔ حمزہ علی۔ محمد خان۔ مجیب الرحمٰن خاں۔ شیخ قاسم۔ امرناتھ۔ عبداللہ خاں۔ الیس عبداللہ۔ سروار سروپ سنگھ۔ احمد امان اللہ خاں۔ عبدالرشید۔ شفیق احمد۔ خواجہ عبدالمجید۔ احسن خاں۔ بشیر احمد۔ محمد سلیم۔ سیٹھ گلاب داس شانتی لال نگینداس۔ اخلاق الرحمٰن قدوائی۔ حبیب الرحمٰن۔ عبدالرحمٰن۔ سید اختر عباس۔ الیاس احمد۔ صدیق شاہ صاحب
بذریعہ قرعہ اندازی انعام اول کے مستحق سید اختر عباس اور انعام دوم کے مستحق خواجہ عبدالمجید ٹھیرے۔ انعامات روانہ کردئے گئے ہیں۔

انعامی مضمون

(از ع)

اس دفعہ ہم انعامی معمہ کی بجائے انعامی مضمون کا اعلان کرتے ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین اس کی طرف بھی متوجہ ہونگے۔

شرایط:۔

۱۔ تمام مضامین ۱۰ر اگست تک مندرجہ ذیل پتہ پر آجانے چاہئے۔ "ع" بتوسط اڈیٹر صاحب پیام تعلیم
جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دھلی۔
۲۔ ہر مضمون پر جلی قلم سے لفظ انعامی لکھا جانا چاہئے۔
۳۔ ہر مضمون کے ساتھ ار کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔
۴۔ مضمون فلسکیپ کاغذ کے دو صفحوں پر ایک ایک سطر چھوڑ کر لکھا جائے۔
۵۔ اس مقابلہ میں صرف ۱۵ سال تک کی عمر کے طلبا حصہ لے سکتے ہیں۔
۶۔ مضمون مندرجہ ذیل ہے:۔

بہادری

بہترین مضمون نگار کو دو روپے کا انعام دیا جائے گا۔

رجسٹرڈ ڈیل ۱۹۶۱
پیام تعلیم
جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا
پندرہ روزہ تعلیمی رسالہ

فہرست مضامین

ایڈیٹر سعید انصاری بی-اے (جامعہ) پرنٹر و پبلشر ڈاکٹر عابد حسین ایم-اے-پی ایچ ڈی

والدین اور اُستادوں کا صفحہ
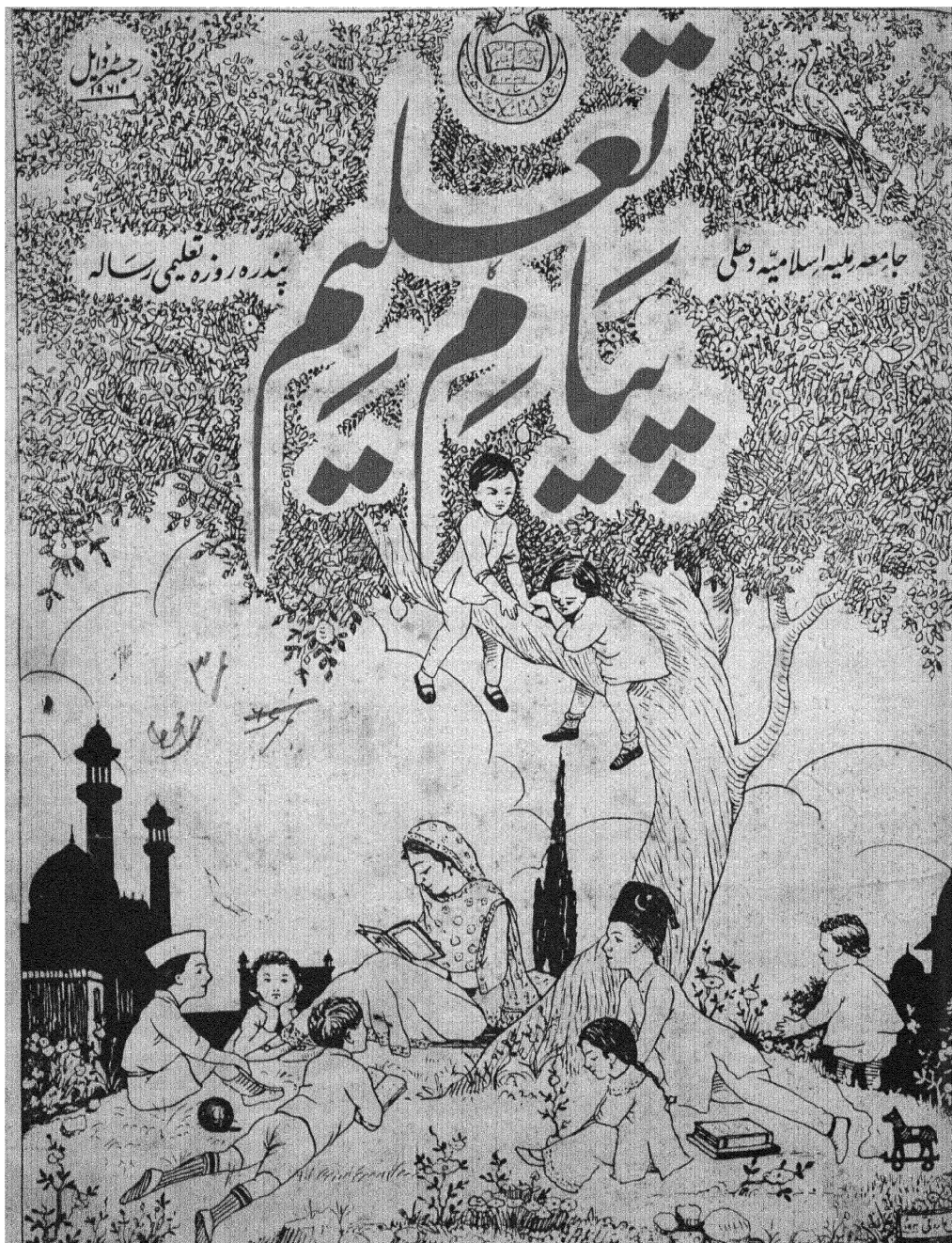
جمہوریت مدرسہ

سید نصیر احمد صاحب ہمارے "پیام تعلیم" کے اُن چند قلمی معاونین میں ہیں جنکے مضامین سے نہ صرف ہمارے چھوٹے بھائی مستفید ہوتے ہیں بلکہ بڑوں کے لئے بھی آپ کے مضامین ویسے ہی دلچسپ اور مفید ہوتے ہیں۔ یہ مضمون آپ نے "خاص نمبر" کے لئے عنایت فرمایا تھا جو کسی قدر دیر میں ملنے کی وجہ سے اس نمبر میں نہ جاسکا۔ اب بہرحال وہ ہدیۂ قارئین ہے۔ (اڈیٹر)

دنیا میں مختلف ممالک ہیں اور ہر ملک میں مختلف قسم کی حکومت ہے۔ دنیا میں دو طرح کی حکومتیں بہت مشہور ہیں۔ ایک تو ایسے ممالک ہیں جن پر بادشاہ حکومت کرتا ہے۔ وہ سیاہ و سفید کا مالک ہوتا ہے، جو جی میں آتا ہے، کرتا ہے۔ اگر بادشاہ اچھا اور قابل ہو تو رعیت خوش رہتی ہے اور ملک ترقی کرتا ہے لیکن اگر بادشاہ نالایق اور ظالم ہو تو رعیت کی حالت بھی بُری ہوتی ہے، دوسرے ایسے ممالک ہیں جنپر خود وہاں کی رعایا حکومت کرتی ہے یعنی تین یا پانچ سال کے بعد اسی ملک کے لوگ اپنے میں سے چند ایسے لوگوں کا انتخاب کرلیتے ہیں جو قابل اور منتظم ہوتے ہیں اور یہی لوگ ملک کا انتظام کرتے ہیں۔ ایسی حکومت کو "جمہوری" کہتے ہیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کہ ہر مدرسہ میں کوئی "بزم" یا "انجمن" ہوتی ہے جس میں طلبہ خود اپنے میں سے نائب صدر، ناظم وغیرہ کا انتخاب کرتے ہیں اور خود ہی قوانین وضوابط بناتے ہیں۔ اگر کوئی عہدہ دار اچھا کام نہ کرے تو اُسے علیحدہ بھی کرسکتے ہیں۔ پس جمہوریت اس طرز حکومت کو کہتے ہیں جسمیں رعیت خود قوانین بناتی اور ان پر عمل کرتی ہے۔

جس طرح ایک بڑے ملک کا نظام حکومت جمہور یعنی عام لوگ بناسکتے ہیں اسی طرح مدرسہ کا نظام جمہور یعنی اساتذہ وطلبا بناسکتے ہیں اس سے آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ "جمہوریت مدرسہ" کسے کہتے ہیں۔ جمہوریت مدرسہ اس نظام کو کہتے ہیں جس میں طلبا واساتذہ قواعد وقوانین بناتے ہیں اور جب کوئی طالبعلم خود اپنے ہی بنائے ہوئے قانونوں کو توڑے تو طلبا ہی تفتیش کرکے اسے سزا دیں۔ امریکہ اور یورپ کے کئی اسکولوں میں اسی قسم کا نظام قائم ہوچکا ہے اور یہ دن بدن ترقی کررہا ہے۔

جنگ عظیم نے لوگوں کی توجہ حکومت کی اصلاح کی طرف کرائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسے ممالک جہاں بادشاہ حاکم ہوتا ہے وہاں رعایا حکام کی غلطیوں پر نکتہ چینی نہیں کرسکتی۔ اس سے نہ صرف رعایا بلکہ حکومت کو بھی نقصان پہونچتا ہے۔ کیونکہ حکومت اپنی غلطیوں سے واقف نہیں ہوتی اور ان کی اصلاح نہیں کرسکتی۔ اسی لئے ہر قوم کو آزاد اور خود مختار ہونا چاہیئے اور اس کے لئے بہترین صورت حکومت جمہوری ہے لیکن یہ صورت ہر حالت میں درست نہیں، خاصکر ایسے ملکوں میں جہاں کے لوگوں میں اسکی صلاحیت نہ ہو۔

آپ خوب جانتے ہیں کہ بغیر سیکھے کوئی کام نہیں چل سکتا۔ حکومت تو ایک طرف رہی، بغیر سیکھے آپ ہاکی اور کرکٹ نہیں کھیل سکتے۔ اسی لئے جن ملکوں میں جمہوری حکومت ہے یہ ضروری نہیں کہ وہاں کی رعیت بھی خوشحال ہو کیونکہ یہ ممکن ہے کہ وہاں کے لوگ حکومت کی طرز سے واقف نہ ہوں اور لائق وقابل نمائندوں کا انتخاب نہ کرسکیں۔

بڑوں کو ہمیشہ یہ شکایت رہتی ہے کہ بچے نظم وضبط (ڈسپلن) قائم نہیں رکھ سکتے۔ ان میں دوراندیشی نہیں۔ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بچوں میں یہ کمزوریاں موجود ہیں لیکن اس کے ذمہ دار بڑے ہیں۔ بچے تو موم کے کھلونے ہوتے ہیں جدھر چاہا موڑ دیا۔ جب بڑوں نے خود ہی ان کی تعلیم وتربیت کی پوری طرح کوشش نہ کی اور انہیں صراط مستقیم پر نہ چلایا تو اس میں اُنکا کیا قصور!

جس طرح خود مختار سلطنت کے بادشاہ اپنے ملک میں آزاد ہوتا ہے اسیطرح مدرسہ میں استاد جو چاہتا ہے کرتا ہے اور رعیت یعنی طلبہ کو حرف گیری کا مطلق حق نہیں ہوتا۔ اگر حاکم یعنی مدرس سخت ہے تو نظام اچھا قائم رہتا ہے ورنہ سخت ابتری پھیل جاتی ہے۔

ان تمام باتوں پر غور کرنیکے بعد امریکہ کے ایک شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مدرسہ کے طلبہ کو کیوں نہ شروع ہی سے جمہوری حکومت کی طرز

سے واقف کیا جائے تاکہ وہ بڑے ہوکر اپنے ملک کی حکومت میں سرگرم حصّہ لے سکیں۔ چنانچہ جب اس نے یہ خیال ظاہر کیا تو اس کی خوب ہنسی اڑائی گئی۔ لوگوں نے کہا "مدرسوں کو کیوں خراب کررہے ہو۔ تمہاری یہ تجویز کبھی پھل پھول نہیں سکتی۔ اس سے مدرسہ میں طوفانِ بے تمیزی پیدا ہوجائیگا کیونکہ بچے فطرتاً شریر ہوتے ہیں۔ ان میں شوخی اور شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اگر انہیں آزاد چھوڑ دیا گیا تو مدرسہ میں قیامت آجائیگی" لیکن اس شخص نے ان باتوں کی کچھ پروا نہیں کی اور برابر کوشش کرتا رہا یہانتک کہ بعض مدرسوں کے ہیڈ ماسٹروں اور منتظموں نے اسی تجویز کا اپنے ہاں تجربہ کرنا منظور کرلیا۔ غرض قوانین بنائے گئے۔ انتخابات ہوئے۔ جمہوریت مدرسہ کے اصولوں کے ماتحت کام شروع کیا گیا۔ لیکن بُرے نتائج پیدا ہونے کی بجائے مدرسہ کے حالات روز بروز اچھے ہوتے گئے اور اخلاقی اور تعلیمی حالت درست ہونے لگی۔

ایک مدرسہ میں ایک صدر، ایک پولیس افسر، ایک جج اور ایک افسر صحت منتخب کیا گیا۔ قواعد و قوانین بنائے گئے۔ ایک انتظامی مجلس قائم ہوئی۔ کثرت رائے سے جو فیصلہ ہوا وہی قانون سمجھا گیا اور سب نے ان قوانین پر کاربند ہونیکا فیصلہ کرلیا۔ اس طرح ایک چھوٹی سی گورنمنٹ قائم ہوگئی۔ اس گورنمنٹ کے متعلق چھوٹے چھوٹے معاملات مثلاً جماعت کی نشست و برخاست، کھیل کود کے میدان کا انتظام، دیواروں، ڈسکوں اور کپڑوں کی صفائی، دھوکا، نقل، فساد اور اسکول سے غیر حاضری وغیرہ تمام جرائم کی اصلاح تھی۔ ان تمام حکام کو چھوٹے پیمانہ پر وہ تمام حقوق حاصل تھے جو اعلیٰ پیمانہ پر حکام سلطنت کو حاصل ہوتے ہیں۔

جمہوریت مدرسہ میں سزائیں بھی مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔ بعض جرائم کی سزا تمام طلبہ کی موجودگی میں دی جاتی ہے۔ یہ صرف اسی وقت ہوتا ہے جب کوئی لڑکا مدرسہ کے نظام میں خلل انداز ہوتا ہے اور جس سے اسکول کی نیکنامی پر دھبہ آتا ہے مثلاً جھوٹ، نقل، کھیل کود کے میدان میں فساد وغیرہ۔ بعض حالات میں مجرم کو ایک خاص مدت کے لئے کھیل کود سے محروم کردیا جاتا ہے۔ کبھی مجرم کو طلبہ کی موجودگی میں معافی مانگنا پڑتی ہے۔ اگر کسی سے کچھ گم ہوجائے تو مجرم کو اسکی تلافی کرنا پڑتی ہے۔ کبھی رائے دینے کے حقوق چھین لئے جاتے ہیں بعض حالات میں طلبائے مدرسہ کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ مجرم سے بات چیت اور میل جول ترک کردیں اور یہ سخت ترین سزا سمجھی جاتی ہے۔ جہاں بھی اس کا تجربہ کیا گیا وہاں ہر اعتبار سے یہ مفید ثابت ہوئی۔ چونکہ قوانین خود طلبا ہی کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے ان کی پابندی کرنا وہ ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی قانون کو توڑتا ہے تو دوسرے طلبا اس کو بری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ جو کوئی قانون کی پابندی نہیں کرتا وہ نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ اپنے مدرسہ کو بھی بدنام کرتا ہے۔

مندرجہ بالا طریقے چھوٹے چھوٹے مدرسوں میں بخوبی عمل پذیر ہوسکتے ہیں لیکن جہاں طلبہ کی تعداد بہت ہو وہاں ہر جماعت یا کمرہ کو اپنا حلقۂ انتخاب علیحدہ بنانا پڑتا ہے اور ہر کمرہ یا جماعت کے طلبا دو یا تین رکن کونسل منتخب کرلیتے ہیں۔ اور ان ارکین کا بورڈ قوانین بناتا ہے۔ تمام مدرسوں کا ایک صدر اور ایک پولیس افسر ہوتا ہے۔ لیکن بڑے بڑے مدرسوں میں کئی جج اور کئی پولیس افسر وغیرہ ہوتے ہیں۔ بڑے مدرسوں میں ایک قومی وکیل بھی ہوتا ہے۔ جب کسی طالبعلم پر کوئی الزام لگایا جائے تو وہ اسکی طرف سے عدالت میں پیش ہوکر صفائی کے ثبوت پیش کرتا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ جمہوریت مدرسہ میں استاد کے اختیارات کہانتک ہیں؛ اسے مدرسوں کے انتظام میں کہاں تک دخل رہتا ہے۔ جمہوریت مدرسہ میں استاد کے اختیار و حقوق میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ فرق صرف اسقدر ہے کہ اب وہ اپنے اختیارات طلبہ کی معرفت کام میں لاتا ہے۔ پہلے تو وہ جمہوریت مدرسہ کے قوانین کو منظور کرتا ہے اور اکثر اوقات ان قوانین میں یہ بات بھی شامل ہوتی ہے کہ استاد کو ضروریات وقتی کے لحاظ سے قوانین میں مداخلت کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

چونکہ قوانین خود طلبہ بناتے ہیں اس لئے ان پر عمل کرنا انہیں گراں نہیں گزرتا۔ وہ انداز حکومت سے آگاہ ہوجاتے ہیں۔ انہیں کثرت رائے کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ وہ افسری و ماتحتی کے فرائض سمجھنے لگتے ہیں اور اس قسم کے کئی فرائض سے آگاہی حاصل کرلیتے ہیں۔ یہ طریقہ دنیا میں بہت سرعت کے ساتھ ترقی کررہا ہے۔ امریکہ، یورپ، جاپان، اور افریقہ میں اس جدید طریقہ کو بہت پسند کیا جارہا ہے۔ دیکھئے ہندوستان اس کی طرف کب توجہ کرتا ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ جامعہ جہاں اور بہت سی مفید باتوں میں پیشقدمی کررہا ہے اس طریقہ کو بھی اپنے ہاں رائج کرکے دیکھے۔

(ماخوذ از کتاب المعلومات)

قصے کہانیاں

آدمی کی کہانی
ایک ستارہ کی زبانی

(گزشتہ سے پیوستہ)

ایک ننھا سا تارہ بیچ میں بولا " اور نانی اماں، یہ لوگ اس پر کب سے بستے ہیں ؟"

" شاباش، یہ بات تونے اچھی یاد دلائی ۔ ان دو پاٗوں والوں کو خود اس بات کی بڑی فکر تھی کہ پتہ چلے کہ ان کی زمین کب سے آباد ہے بہت دنوں تک تو یہ نادان نہ جانے کیوں سمجھتے رہے کہ ان کی زمین کی کل عمر ۶ ہزار برس ہے مگر میری پرنانی کہا کرتی تھیں کہ کوئی ۲ ارب برس سے اوپر ہوئے ہیں نے اس طرف کو جدھر یہ زمین اور اسکے سورج چاند اور زہرہ مشتری، اور جانے کیا کیا نام لیتی تھیں وہ ہیں ۔ اُدھر ایک روئی کے گالے جیسی بے شکل صورت مگر آگ سی دہکتی چمکتی چیز تھی ۔ پھر ان کے دیکھتے دیکھتے اس بے شکلے گالے کے ٹکڑے ٹکڑے الگ الگ ہوگئے اور گول گول سے چھوٹے بڑے گیند بن گئے جو سب کے سب اس خالی جگہ میں بڑی تیزی سے گھومتے تھے ۔ انھیں گیندوں میں یہ زمین بھی تھی ۔ پہلے تو یہ گیند بھی آگ کی طرح دہکتی تھی ۔ مگر ہوتے ہوتے ذرا ٹھنڈی پڑی ۔ پھر بھی کروڑوں برس اس کی گرمی ایسی تھی کہ کوئی جاندار چیز اسپر بھلا کیا ٹھہرتی ۔ روز اندر کی گرمی سے کہیں بڑے بڑے پہاڑ ابھر آتے تھے، کہیں زمین دھنس کر بڑے بڑے غار پڑ جاتے تھے ۔ روز آگ کے پھوٹ نکلنے سے مصیبت رہتی تھی ۔ زلزلے آئے دن کی بات تھے ۔ اس طرح نہ جانے کتنا زمانہ گذر گیا ۔ میری اماں کے وقتوں میں، اسے کوئی دس کروڑ برس ہوئے یہ اتنی ٹھنڈی ہوگئی کہ اس پر زندگی قائم رہ سکے ۔ چنانچہ اللہ میاں نے اس پر ننھی ننھی سی جاندار چیزیں پیدا کر دیں ۔ ان ننھی ننھی چیزوں سے بدل بدل کر اور بڑھ بڑھکر کوئی ۲ ½ لاکھ برس ہوئے میرے سامنے کی بات ہے کہ اس زمین پر پہلا آدمی پیدا ہوا ۔ ان چھوٹی بے شکل جاندار چیزوں سے کروڑوں برس میں آدمی کا بننا یہ خود ایسی کہانی ہے کہ کیا بتاؤں "

وہی ننھا سا تارا جس نے پہلے پوچھا تھا کہ آدمی دنیا پر کب سے بستے ہیں پھر بات کاٹ کر بولا : " تو یہ کیا یہ دو پاٗوں والا جو دن رات ہمیں طرح طرح کے تماشے دکھاتا ہے ننھے ننھے سے بے شکل جانداروں کی اولاد ہے ۔ اور وہ ہزاروں طرح کے جانور، درخت، پھول، سب جو ہم اس گولہ پر دیکھتے ہیں وہ بھی ہیں تو جانوں، اللہ میاں نے انہیں سب کو الگ الگ بنایا ہوگا ۔ ان کے تو سب کے سانچے ڈھانچے الگ ہونگے ؟"

نانی اماں مسکرائیں اور بولیں " بڑا تیز بچہ ہے ۔ اللہ عمر میں برکت دے ۔ ہاں بیٹا ۔ اللہ میاں چاہتے تو انھیں الگ الگ سانچوں سے تیار کر دیتے وہ تو جو چاہتے کرتے اور جو چاہیں کر سکتے ہیں ۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ انہوں نے کیا کیا ۔ وہ چاہتے تو آدمی ہی کو پہلے پیدا کر دیتے ۔ چاہتے تو زمین آجتک دہکتی ہوئی آگ کا گولہ ہوتی جیسے ہم ابتک ہیں مگر اُس نے اپنی قدرت کا یہی تماشا دکھانا چاہا کہ پہلے زندگی کو ذرا ذرا سے بے شکل جسموں میں ڈالا اور اپنی حکمت اور قدرت سے ایسے قانون بنا دئے کہ یہ چھوٹا سا ذرہ ذرہ ترقی کرتے کرتے آدمی بنگیا اور کون جانتا ہے کہ یہ سلسلہ ابھی اور کہاں تک جائے ۔ اس ترقی کا جو ذکر میں نے تم سے کیا اس کا حال کچھ میرا دیکھا ہوا کچھ پرنانی اماں سے سنا ہوا ہے ۔ آدمی کو خود اپنے اس حال کی خبر نہ تھی ۔ اب کچھ دنوں سے اسے اس کا خیال ہوا ہے ۔ جیسے جیسے زمانہ گذرا زمین کی سطح پر کہیں کہیں تہیں جمتی گئیں ۔ اب ان آدمیوں میں سے بعض ایسے ہوشیار نکلے ہیں کہ ان تہوں کی عمر کا پتہ چلا لیتے ہیں ۔ ان تہوں میں پُرانے زمانے کے جانداروں کے نشان، انکی ہڈیاں، نقش وغیرہ ملتے ہیں ۔ اور ان نشانوں سے آدمی خود اپنی کہانی کو ذرا ذرا جان گیا ہے لیکن یہ نشان اُسی وقت ملتے ہیں جب اس زمین پر ہڈیوں کے ڈھانچے والے جانور

پیدا ہوئے، شروع والے بے ہڈی کے جانوروں کا تو اب کوئی نشان پتہ نہیں۔ آدمیوں کو زمین کی تہوں میں جو پچھلے جانور ملے ہیں ان میں سب سے پرانے تو وہ ہیں جن کے ریڑھ کی ہڈی نہیں تھی اور جو سب پانی میں رہتے تھے۔ ان کے بعد ان جانوروں کے نشان ہیں جن کے ریڑہ کی ہڈی تھی۔ جانوروں میں اول بل میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر زندہ چیز اپنے کو اردگرد کی حالتوں کے مطابق بناتی ہے۔ جو چیزیں اس بات میں اوروں سے اچھی ہوتی ہیں وہ پھلتی پھولتی ہیں اور جو اردگرد کے حال سے گھبرا کر اکتا جاتی ہیں وہ ختم ہو جاتی ہیں۔ اردگرد کے حال کے مطابق ہونے میں ہر جانور ہمیشہ تھوڑا تھوڑا بدلتا رہتا ہے اور جب یہ تبدیلیاں لاکھوں کروڑوں برس تک چلتی ہیں تو ایک بالکل نئی شکل کا جانور پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ شروع زمانہ میں اس گولہ کی حالت میں بہت جلد جلد تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ جتنے دن میں یہ سورج کے گرد گھوم جاتا تھا وہ مدت بدل گئی، یہ خود اپنے محور پر جتنے گھنٹے میں گھوم لیتا تھا وہ بدل گئی، سب ہی کچھ بدلا گیا۔ کبھی سمندر کا پانی گھٹا، کبھی بڑھا۔ کبھی سخت گرمی پڑی کبھی سخت سردی۔ غرض بڑی بڑی تبدیلیاں رہیں اور ان تبدیلیوں کی وجہ سے جانوروں کی شکل صورت میں بھی تبدیلی ہوتی رہی۔

سمندر میں کچھ مچھلیوں کو اس زمین کی کھلی ہوا اور سورج کی روشنی اتنی بھائی کہ جب دیکھو کنارے پر پڑی رہتیں۔ پانی کی موج آتی تو یہ اکثر خشکی پر جا پڑتیں۔ اس طرح ہوتے ہوتے نہ جانے کتنے برسوں میں ایسے جانور بن گئے جو تری خشکی دونوں میں زندہ رہ سکتے تھے۔

پھر ہوتے ہوتے ایسے جاندار بھی پیدا ہو گئے جو صرف خشکی پر جی سکتے تھے۔ نانی اماں بتایا کرتی تھیں کہ یہ اکثر رینگنے والے جانور تھے جنکے بچے انڈوں سے نکلتے تھے۔ لیکن یہ انڈوں پر بیٹھتے نہ تھے، یونہی سورج کی گرمی میں رہنے سے انہیں سے بچے نکل آتے تھے۔ اس وضع کے جانور اب بھی دنیا میں ہیں۔ تم روز دیکھتے ہی ہوگے۔ مگر وہ پہلے والے اب سے بہت بڑے ہوتے تھے۔ بعض تو کہتے ہیں کہ سر سے دم تک کوئی ۴۰ گز کے ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض کو دنیا کے پیڑوں پر اڑ کر بیٹھنے کا شوق ہوا تو اس شوق اور کوشش سے انکے پر ہو گئے۔ بعض کے تو ویسے پر جیسے چمگادڑ کے ہوتے ہیں، چمڑے کے، تم نے نہ دیکھے ہوں تو کسی دن دھیان دیکر رات کو دیکھنا۔ یہ جانور رات کو اڑتا پھرتا ہے۔ اور بعض کے تو سچ مچ چڑیوں کے سے پر نکل آئے۔ ہاں بیٹا شوق اور کوشش بڑی چیز ہے۔ ان سے سب کچھ ہو جاتا ہے

مجھے اب اچھی طرح یاد نہیں۔ جانے کیا بات ہوئی کہ اس زمین کی آب و ہوا ایسی بدلی اور ایسا کال پڑا کہ یہ بڑے بڑے رینگنے والے جانور تقریباً سب کے سب مر گئے اور انکی جگہ دودھ پلانے والے جانوروں اور چڑیوں نے لی۔ ان جانوروں میں اوروں سے زیادہ سمجھ تھی۔ اور ہوتے ہوتے یہ سمجھ بہت بڑھ گئی۔ میرے دیکھتے دیکھتے ان دودھ پلانے والوں میں سے ایک اور سب پر اپنی سمجھ کے مارے بازی لے گیا۔ اس کی چھوٹی سی کھوپڑی میں نہ جانے نہ جانے اتنی عقل کہاں سے آگئی۔ چاروں اگلے پچھلے پانوں پر چلتے چلتے میری آنکھوں دیکھی بات ہے، یہ ایک دن پیروں پر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اور اگلے پانوں سے ہاتھوں کا کام لینے لگا۔ اسی کی اولاد میں یہ سب دو پانوں والے ہیں جنکے کھیل تماشوں، لڑائی جھگڑوں کو تم نے تین دن سے نہیں دیکھا تو کل نہیں پڑی اور مجھ سے یہ کہانی کہلوائی .... لو میری بپتی ختم ہوئی۔ اب ذرا دم لے لوں۔"

تاریخ

ایک حبشی غلام کی سرگزشت

مرغیوں کے ڈربے میں اسکول

حبشیوں کے جو حالات مجھ کو اُس ایک ماہ کی سیر و سیاحت اور مختلف تحقیقات سے معلوم ہوئے ان سے میرے دل پر سخت چوٹ لگی اور نہایت ہی متاثر ہوا۔ اور ان لوگوں کو قعرِ ذلت سے نکالکر معراجِ ترقی پر پہنچانا سخت کٹھن اور نہایت دشوار نظر آیا۔ زیادہ تر میرے ہراساں ہونے کی یہ وجہ تھی کہ میں اس وقت تن تنہا تھا اور میری ادنیٰ اور ناچیز کوششوں سے بظاہر چنداں مفید اور بارآور نتائج نکلنے نظر نہ آتے تھے۔ بلکہ نہایت ششدر اور حیران تھا کہ یہ بارِ عظیم مجھ سے اُٹھ بھی سکیگا اور اس میں میری سرِدکاری کا کچھ ماحصل بھی ہوگا۔ ہاں اسی حالت میں اس امر کا مجھ کو یقین ہوگیا تھا کہ محض آجکل کے مروجہ طریقۂ تعلیم کی تقلید سے ان حبشیوں کی ترقی ناممکن ہے۔ ان بچوں کو روزانہ چند گھنٹے محض کتابی تعلیم دینا ایک قسم کی تضیعِ اوقات ہے۔ بلکہ جنرل آرمسٹرانگ نے جو طریقۂ تعلیم ہیمپٹن میں جاری کر رکھا ہے اس کا استعمال نہایت مناسب اور موزوں ہوگا۔ الغرض باشندگانِ ٹسکیگی کی صلاح سے یہ بات قرار پائی کہ ۴ جولائی ۱۸۸۱ء کو ایک چھوٹے سے گرجا گھر میں اسکول کھولدیا جائے۔

حبشی اور گورہ ہر دو قوموں نے اس جدید اسکول کے افتتاح میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور نہایت سرگرمی اور کمال اشتیاق سے یومِ افتتاح کا انتظار کرنے لگے۔ ٹسکیگی کے نواح میں بہت سے گورے ایسے بھی موجود تھے جو اس کام کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے اور حبشیوں کے حق میں اس کو مفید نہ سمجھتے تھے۔ نیز یہ بھی خیال تھا کہ مبادا اس سے دونوں قوموں میں باہم رنجش کا مادہ پیدا نہ ہوجائے۔ بعض کی یہ رائے تھی کہ حبشی جوں جوں تعلیم یافتہ ہوتے جائیں گے اسی قدر حکومت کی تمدنی حالت پست ہوتی جائیگی اور یہ بھی ڈر تھا کہ حبشی تعلیم پاکر کھیتوں میں کام کرنا چھوڑ دینگے اور ان سے گھر کا کام لینا مشکل ہوجائے گا۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ حبشی لوگ پڑھ لکھ کر خاصے جنٹلمین بنجائینگے، اونچی اونچی ٹوپیاں سر پر رکھی ہونگی، نقلی سونے کی عینکیں آنکھوں پر لگائے، بانکی چھڑیاں ہاتھ میں لئے اور چمڑے کے دستانے پہنے ہونگے، نفیس نفیس بوٹ پاؤں میں پڑے ہونگے

اور اپنی ذاتی لیاقت کے بھروسے پر زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہوجائیں گے اور یہ امر ان کے خیال میں آنا ذرا مشکل تھا کہ تعلیم سے اس کے سوا اور کسی طرز پر بھی حبشیوں کو مہذب و شائستہ اور کام کا آدمی بنایا جاسکتا ہے یا نہیں۔

ان تمام مشکلات اور اس کے بعد متواتر انیس برس تک جملہ امور و مہمات میں معاونینِ ٹسکیگی میں سے دو شخص خصوصاً ہر وقت میرے معین و مددگار رہے ہیں اور اس اہتمام میں میری کامیابی بہت کچھ انہیں کی اعانت کا نتیجہ ہے۔ ان میں سے ایک تو گورہ تھا جس کے ہاں غلام رہا کرتے تھے اس کا نام مسٹر جارج کیمبل تھا۔ دوسرا حبشی تھا جو خود غلام رہ چکا تھا اس کا نام مسٹر لیوس ایڈمس تھا۔ انہی صاحبان نے جنرل آرمسٹرانگ سے استاد کی درخواست کی تھی۔ مسٹر کیمبل ایک سوداگر اور شریف آدمی تھا اور تعلیمی معاملات میں چنداں دسترس نہ رکھتا تھا اور مسٹر ایڈمس ایک کاریگر تھا جس نے غلامی کے دنوں میں جوتے اور ساز بنانا اور ٹین کے سامان تیار کرنا سیکھا تھا۔ وہ عمر بھر میں ایک دن بھی کسی مدرسے میں داخل نہیں ہوا لیکن تاہم کسی نہ کسی طرح لکھنا پڑھنا ضرور سیکھ لیا تھا۔ یہ دونو ابتدا ہی میرا تعلیمی خاکہ دیکھ کر اس قدر مائل ہوئے کہ ہمیشہ میرے معین و مددگار اور ہر کام میں میرے ہمدرد اور غمگسار رہے۔ اسکول کی مالی حالت کے خراب ہونے کے زمانہ میں جب کبھی مسٹر کیمبل سے امداد کی درخواست کی جاتی تو کبھی انکار نہ کرتا اور بقدرِ وسعت کچھ نہ کچھ ضرور دیتا۔ میں نے کوئی دو شخص جن میں سے ایک تو غلاموں کا آقا اور دوسرے نے خود غلامی کی تکالیف جھیلی ہوں ایسے نہیں دیکھے جنکی نصیحت اور مشورہ پر ٹسکیگی اسکول کی ہستی اور بہبودی کے باب میں ان سے بڑھ کر تقلید کرنے کے لئے کبھی آمادہ ہوا ہوں۔

میں ہمیشہ محسوس کرتا رہا ہوں کہ مسٹر ایڈمس کی دستکاری و حرفت و صنعت کی تعلیم ہی اس کی غیر معمولی ذہانت کا باعث تھی جس کی بدولت وہ ایامِ غلامی میں تین پیشوں پر حاوی ہوگیا تھا۔ اگر آج کل کوئی شخص کسی جنوبی شہر میں جاکر پوچھے کہ حبشیوں میں سب سے معتبر اور قومی لیڈر کون ہے تو میں نہایت وثوق اور یقین

سے کہہ سکتا ہوں کہ پچاس فیصدی حالات میں اس حبشی کا نام لیا جائیگا جو زمانۂ غلامی میں کسی نہ کسی صنعت پر قادر تھا۔

اسکول کھلتے ہی پہلے دن تیس طلبا داخل ہوئے جنہیں نصف عورتیں تھیں۔ اور استاد میں صرف اکیلا ہی تھا۔ صرف وہی طلبا داخل کئے جاتے تھے جن کی عمر ۱۵ سال سے اوپر ہو اور جو کچھ نہ کچھ لکھنا پڑھنا جانتے ہوں۔ اگر یہ شرط نہ ہوتی تو طلبا کی تعداد بہت بڑھ جاتی۔ ان میں سے اکثر طلبا اسکولوں کے استاد رہ چکے تھے اور بعض کی عمر چالیس برس کی تھی۔ بعض کے ہمراہ اُن کے چند پرانے شاگرد بھی تھے۔ تعجب کا مقام ہے کہ جب داخلے کے لئے ان کا امتحان لیا گیا تو بعض شاگرد اپنے استادوں سے اعلیٰ جماعتوں میں داخل ہوئے۔ بعض بعض بہت سی کتب کا مطالعہ بھی کر چکے تھے اور بعض اس امر کے مدعی تھے کہ بہت سے طویل العنوان اور کثیر المنفعت مضامین ہماری نظر سے گزر چکے ہیں۔ بڑی بڑی کتابوں اور لمبے لمبے نام کے مضامین اپنی لیاقت اور فخر کے اظہار میں پیش کرتے تھے۔ بعض لاطینی بھی جانتے تھے اور ایک دو یونانی زبان سے بھی واقف تھے اور اس سبب سے اپنے آپ کو خاص درجہ کا حقدار اور سزاوار خیال کرتے تھے۔ یہ طالب علم گرامر اور حساب کے لمبے لمبے اور پیچیدہ قاعدوں کو رٹنے کے نہایت شائق تھے لیکن ان قاعدوں کو اپنے روزانہ کاروبار زندگی میں استعمال کرنے کا کبھی ان کو خیال تک بھی نہ آتا تھا۔ اور نہ ہی ان کو یہ علم تھا کہ یہ کیونکر روزمرہ کے کاموں میں برتے جا سکتے ہیں اور جس مضمون کا مجھے ذکر کرنا اور اس میں اپنا ماہر ہونا نہایت آرزو و شوق سے جتانا چاہتے تھے وہ بہی کھاتہ کا علم تھا لیکن مجھے اُسی وقت معلوم ہوگیا کہ نہ خود ان کا اور نہ اس کے گرد و نواح میں کسی اور شخص کا کبھی کسی بنک سے لین دین رہا جس میں اس کا استعمال کیا گیا ہو۔ ہر ایک طالب علم کے نام میں ایک یا دو حرف زائد بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ میں نے ایک سے سوال کیا کہ جان۔ جے۔ جونس میں جے سے کیا مراد ہے۔ بولا یہ اس کے القاب کا ایک جزو ہے۔ بہت سے طلبا محض اس غرض سے پڑھنے آئے تھے کہ استاد بن کر زیادہ روپیہ کما سکیں گے۔

باایں ہمہ ان طلبا سے بڑھکر زن و مرد کی کوئی جماعت میری نظر سے نہیں گزری جو تعلیم میں اسقدر سرگرم اور تحصیل علم کی اس درجہ متمنی اور خواہشمند ہو جب ان کو کسی مضمون کا مفہوم ٹھیک طور پر سمجھا دیا جاتا تھا تو وہ اُس کے سیکھنے کے لئے نہایت آرزو اور کمال تمنا سے آمادہ ہو جاتے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ نہایت مکمل طریقے اور خوش اسلوبی سے کتابیں پڑھاؤں۔ چند ہی روز میں معلوم ہوگیا کہ طویل العنوان مضامین جو اکثر طلبا کے مطالعہ میں آ چکے تھے، ان سے بہت ہی کم واقفیت رکھتے ہیں۔ نقشے پر کسی صحرا یا ریگستان یا شاہ چین کا دارالخلافہ تو اچھی طرح بتلا سکتے تھے لیکن اتنی تمیز نہ تھی کہ میز پر چھری کانٹے اور گوشت روٹی کا مناسب مقام کہاں ہے۔ مجھے ایک طالب علم کو جو حساب میں مکعب و نفع و نقصان کے قاعدے سیکھتا تھا نہایت دلیری سے یہ کہنا پڑا کہ اول پہاڑے یاد کرنا تمہارے حق میں زیادہ مفید ہے۔

طلبا کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی حتیٰ کہ پہلے ماہ کے اختتام پر پچاس کے قریب ہوگئے۔ اکثر طلبا چاہتے تھے کہ دو تین مہینہ بعد اعلیٰ جماعت میں داخل ہو کر پہلے ہی سال میں ڈپلوما حاصل کرلیں۔

چھ ہفتے گزرنے پر مس ڈیویڈسن نام ایک جدید اور نادر الوجود عورت اُستانی بن کر یہاں آئی۔ جس سے بعد ازاں ۱۸۸۶ء میں میری شادی ہوگئی۔ یہ غالم اوہایو میں پیدا ہوئی اور اس ضلع کے سرکاری اسکول میں تعلیم پائی۔ ابھی لڑکی ہی تھی کہ اس کو جنوبی علاقے میں استادوں کی ضرورت کا حال معلوم ہوا۔ اور ضلع مسیسپی میں جاکر مدرسی کا کام کرتی رہی۔ وہاں ایک طالب علم کو چیچک نکل آئی۔ اس کا کوئی عزیز ڈر سے اُس کے نزدیک نہ جاتا تھا۔ مس موصوف نے اسکول بند کردیا اور اُس کی خدمت کے لئے کمربستہ ہوگئی اور تا صحت نہایت مستعدی سے خدمت کرتی رہی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایام تعطیلات میں جب وہ اپنے وطن میں تھی اس نے سنا کہ میمفس میں ایک قسم کا سخت وبائی بخار پھیلا ہوا ہے۔ سنتے ہی وہاں کی کمیٹی کے افسر کو تار دیا کہ اگر اجازت ہو تو بیماروں کی تیمارداری کے لئے حاضر ہوں؟ اس سے پہلے وہ یہاں استانی بھی رہ چکی تھی۔

جنوب میں رہ کر مس ڈیویڈسن یہ معلوم کر چکی تھی کہ کتابی علم کی نسبت اور تعلیم کی لوگوں کو زیادہ تر ضرورت ہے۔ جب ہیمپٹن کا طریقۂ تعلیم اس کے گوش زد ہوا تو نہایت پسند آیا اور ارادہ کیا کہ اس پیشے کو زیادہ تر مفید اور کارآمد بنانے کے لئے وہاں پر جانا اور تعلیم حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس کی نادر لیاقت اور خداداد قابلیت نے مسز ہیمنوے ساکن بوسٹن کی توجہ کو اپنی طرف مائل کرلیا اور اس کی مہربانی اور فیاضی کی بدولت ہیمپٹن سے گریجویٹ ہوگئی اور بعد ازاں فرامنگم نارمل اسکول میں دو برس تک اُستانی کا کام سیکھتی رہی۔ یہاں داخل ہونے سے پیشتر کسی نے مس ڈیوڈسن کو یہ صلاح دی تھی کہ تمہارا رنگ گورا ہے

اگر اپنا حبشی ہونا نہ ظاہر کرو تو خوب آرام سے رہو گی۔ اُس نے فوراً صاف جواب دیا کہ "میں کسی حالت میں یا کسی فائدے کی غرض سے اپنی قومیت کی نسبت کسی کو دھوکہ دینا گوارا نہیں کر سکتی۔"

فرامنگم سے گریجویٹ ہو کر نکلنے کے کچھ مدت بعد مس ڈیوڈسن ٹسکیگی میں آئی۔ طریقۂ تعلیم میں اس کے خیالات نہایت کارآمد، جدید اور قابل قدر تھے اور اخلاق حسنہ اور خصائل پسندیدہ سے آراستہ و پیراستہ ہونے کے علاوہ ایثار نفس میں بھی کمال رکھتی تھی۔ ٹسکیگی اسکول کو کامیاب بنانے میں جس قدر حصہ مس ڈیوڈسن نے لیا شاید ہی کسی کو نصیب ہوا ہو۔

ابتدا ہی سے ہم دونوں نے مل جل کر اسکول کے مستقبل کی نسبت غور کرنا شروع کر دیا۔ اگرچہ طلبا کتابیں پڑھنے اور اپنے دماغوں کی تربیت کرنے میں خاص ترقی کر رہے تھے لیکن ہمیں فوراً ہی معلوم ہو گیا کہ اگر ہم انکے دماغوں پر کوئی دائمی اثر پیدا کرنا چاہیں تو کتابی تعلیم کے سوا اور بھی کچھ کرنا لازم ہے۔ طلبا کو اپنے گھروں میں جسم کو صاف رکھنے کی ہدایت بھی کبھی نہ ہوئی تھی اور ٹسکیگی کے مکانات جہاں وہ رہتے تھے اُن کے گھروں سے چنداں بہتر نہ تھے۔ اسلئے ہم کو انہیں نہانے دھونے، بدن اور کپڑے صاف رکھنے، کھانا کھانے اور کمرے کو صاف رکھنے کی تعلیم بھی دینی پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ کسی نہ کسی صنعت کا سکھانا بھی ضروری تھا تاکہ وہ اسکول چھوڑنے پر محنت و کفایت شعاری سے اپنی روزی کمانے کے قابل ہو جائیں۔ ہماری غرض یہ تھی کہ وہ محض کتابیں ہی نہ رٹتے رہیں بلکہ دنیوی اشیا کی اصلیت اور ماہیت سے بھی بخوبی واقف ہو جائیں۔

اکثر طلبا ایسے اضلاع سے آتے تھے جہاں کھیتی باڑی پر اُن کا گزارہ ہوتا تھا اور ۸۵ فی صدی حبشی صرف زراعت ہی پر گزران کرتے تھے۔ اس لئے ہم ایسی تعلیم دینا پسند نہ کرتے تھے جس سے وہ زراعت سے متنفر ہو جائیں، اور دیہات چھوڑ کر شہروں میں بود و باش اختیار کریں اور محض عقل ہی کے زور سے روزی کمانا چاہیں بلکہ اس قسم کی تعلیم دینا چاہتے تھے جس سے وہ استاد بن سکیں اور اپنے دیہاتی گھروں کو واپس جا کر لوگوں میں زراعت کو ترقی دیں۔ ان کی عقلی، اخلاقی اور مذہبی زندگی میں روح پھونکیں اور جدید خیالات پھیلائیں۔ ان خیالات اور ضروریات نے ہمیں سخت متفکر اور متردد کر رکھا تھا۔ ہمارے پاس صرف ایک ٹوٹا پھوٹا گرجا تھا جو باشندگان ٹسکیگی نے عارضی طور پر اسکول کے لئے ہمارے حوالے کر دیا تھا۔ طلبا کی تعداد روز بروز بڑھ رہی تھی۔ اکثر نو وارد طلبا سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اُن کا منشا تعلیم سے صرف یہی ہے کہ وہ دستی محنت و مشقت کے ساتھ روزی کمانے سے نجات پا جائیں۔

اسکول کھلنے کے تین ماہ بعد جبکہ ہم کو اپنے کام کے متعلق ازحد تشویش تھی تو معلوم ہوا کہ ایک پرانا باغ بکنے والا ہے جو شہر ٹسکیگی سے ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں جا کر خوب غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہی جگہ ہمارے کام کو مفید اور دیرپا بنانے کیلئے موزوں ہے۔ لیکن اب خریداری کا سوال پیدا ہوا۔ اگرچہ ۵۰۰ ڈالر کچھ اتنی بڑی قیمت نہ تھی لیکن ہمارے پاس تو ایک سینٹ بھی موجود نہ تھا۔ اس کے علاوہ ہم اجنبی بھی تھے اور کسی سے ہمارا لین دین نہ تھا۔ تاہم مالک زمین نے اس شرط پر یہ زمین ہم کو دینی منظور کر لی کہ ۲۵۰ ڈالر تو فوراً ادا کر دیں اور باقی ۲۵۰ ایک سال کے اندر۔ اگرچہ ۵۰۰ ڈالر میں یہ زمین نہایت سستی تھی لیکن جس کے پاس ایک سینٹ بھی نہ ہو اس کو تو نہایت مہنگی معلوم ہو گی۔ میں نے اس آڑے وقت میں کمر ہمت باندھ لی اور اپنے کرم مہربان جنرل مارشل کو جو ہیمپٹن کا خزانچی تھا تمام ماجرا لکھ بھیجا اور اپنی ذمہ داری پر ۲۵۰ ڈالر قرض طلب کیا۔ چند روز بعد جواب آیا کہ مجھے اُس درسگاہ کے فنڈ سے تو قرض دینے کا اختیار نہیں ہے لیکن اپنے پاس سے یہ رقم بخوشی تم کو قرض دے سکتا ہوں۔ اس طرح اس رقم کا حاصل کرنا میرے واسطے نہایت حیرانی اور کمال خوشی کا باعث ہوا کیونکہ اس وقت تک کمبخت سو ڈالر کبھی میرے ہاتھ میں نہ آئے تھے اور ذاتی ذمہ داری پر جو قرض جنرل مارشل سے لیا گیا تھا وہ الگ متردد اور متفکر رکھتا تھا۔

میں نے اسکول کو فوراً نئے مکان میں تبدیل کر دیا۔ جب اس زمین پر ہمارا قبضہ ہوا تو اس وقت وہاں ایک تو جھونپڑا تھا جس میں کبھی کھانا کھایا جاتا تھا اور ایک پرانا باورچی خانہ، ایک اصطبل، اور ایک ٹوٹا پھوٹا مرغیوں کا ڈربہ۔ چند ہی ہفتوں میں یہ سب جگہیں ہمارے استعمال میں آنے لگیں۔ اصطبل اور مرغیوں کا ڈربہ تھوڑی بہت مرمت کے بعد پڑھائی کے کمرے بنا لئے گئے۔

دوپہر کو جب چھٹی ہو جاتی تھی تو اس نئی جگہ کو طلبا سے صاف کرایا جاتا تھا تاکہ اسکول کے کام میں آ سکے۔ جب کمروں کی صفائی سے فراغت ہو چکی، تو کھیتی کے لئے کچھ زمین درست کرانے کا ارادہ کیا۔ جب یہ تجویز طلبا کے سامنے پیش کی گئی تو انہوں نے اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھا، اور تعلیم اور جنگل (دیکھو صفحہ ۱۲)

نظم

باز اور بلبل

(ماخوذ از نظامی)

پھول پھولے تھے جب گلستاں میں — باز اک اڑ رہا تھا میداں میں
تھک کے اک شاخ پر چلا آیا — اور اپنے پروں کو سلجھایا
ایک بلبل بھی تھی وہاں بیٹھی — دیکھ کر باز کو وہ یوں بولی
"سب پرندوں میں اے مرے ذی ہوش — کس لئے اس قدر ہے تو خاموش
بند رہتا ہے تیرا منہ ہر وقت — ہے تری اس ادا پہ حیرت سخت
پھر بھی تیرے بڑے عروج ہیں باز — بادشاہوں کا تو ہے مایۂ ناز
تیری بیٹھک ہیں ہاتھ شاہوں کے — ہاتھ کس کے؟ جہاں پناہوں کے!
مجھ کو دیکھو کہ نغمہ گاتی ہوں — درد دل پھول کو سناتی ہوں
میرا صیاد ہوگیا دشمن — چاہتا ہے کہ چھوڑ دوں گلشن
گو ہے خاروں میں آشیاں اپنا — پھر بھی دشمن ہے باغباں اپنا
گھورتا ہے مرے نشیمن کو — یوں بڑھاتا ہے دل کی الجھن کو"
باز بولا کہ "سن مری اک بات — اس طرح تو بسر نہ کر اوقات
کیونکہ میرا تو تجربہ ہے یہ — لاکھ دیکھے مگر نہ ایک کہے،
لوگ دنیا کے مطلبی ہیں سب — ہیں ہراک شے میں دیکھتے مطلب
اُن کو بھاتی نہیں تری بکواس — اس لئے ہے ترا لحاظ نہ پاس
کام تجھ کو کوئی نہیں آتا — رونے گانے میں وقت ہے جاتا
میں شکاری ہوں بادشاہوں کا — اک کھلونا جہاں پناہوں کا
میں سدا اُن کے کام کرتا ہوں — دم غلامی کا اُن کی بھرتا ہوں
تب مجھے ہاتھ پر بٹھاتے ہیں — اچھے کھانے مجھے کھلاتے ہیں
آہ مطلب سے کون ہے خالی — بات جو سچ تھی تجھ سے کہہ ڈالی

بلبل زار میں نہیں واعظ
لو چلے پھر کبھی......! خدا حافظ"

غریب کی دنیا

(ہندوستان کے قومی ڈراما نویس حضرت آغا حشر کشمیری کا تازہ قومی ڈراما)

(خاص پیام تعلیم کے لئے)

یہ ایک غیر فانی ڈراما ہے جو حضرت آغا حشر کشمیری ؔ شکسپیر ہند کا لکھا ہوا ہے۔ یہ ۱۴ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو کلکتہ کے اسٹیج پر آیا ہے اور ڈیڑھ مہینے تک کلکتہ میں کھیلے جانے کے بعد شمالی ہند میں چلا گیا ہے۔ اس کی شہرت و مقبولیت بے مثال، ہندو مسلم، امیر غریب، عالم جاہل، ہندوستانی اور یورپین سب اس پر فدا اور قربان ہیں آخر اس کا کیا راز ہے؟ ایک ایک شخص نے اس کو سات سات مرتبہ دیکھا ہے اور کوئی دیکھنے والا ایسا نہیں آیا ہے جو آنسوؤں میں ڈوب کر نہ آیا ہو حتی کہ خود مصنف اور ایکٹرس بے خود و بے اختیار ہو ہو کر رو پڑے ہیں۔ اس کا کیا باعث ہے؟

چونکہ اس سوال کے جواب کا تعلق بچوں سے بھی ہے اس لئے آج میں مختصراً اسکا حال لکھتا ہوں۔ پوری کہانی پر لکھنا منظور نہیں ہے، صرف اس کا مختصر مطلب ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔

جیسا کہ ڈرامے کے نام سے معلوم ہو سکتا ہے یہ ہمارے پیارے وطن ہندوستان کی غربت و افلاس اور مظلومیت و قابل رحم حالت پر ہے۔ اس میں ساہوکار، زمیندار، پروہت، وکیل اور نفرت کے پرچارک لیڈر کے غارت گرانہ اور ظالمانہ کرتوتوں کو دکھلایا گیا ہے۔ پھر غلط مذہب کے مقابلہ میں سچے دھرم کو، سرمایہ پرستی کے مقابلہ میں قربانی کو، ظلم و جبر کے مقابلہ میں رحم و شرافت کو پیش کیا گیا ہے۔ نیکی اور بدی، قوم پرستی اور خود غرضی، عصمت اور گناہ اور روشنی اور تاریکی میں جنگ ہوتی ہے۔ اول روشنی مغلوب ہوتی ہے لیکن پھر تاریکی پر غالب آتی ہے۔ آخر میں ظالم مہاجن، بے رحم زمیندار، فریبی وکیل اور مہاتما نما شیطان اپنے اپنے جال میں گرفتار ہو ہو کر تباہ ہوتے ہیں۔

جو اثر آدمی کے دل پر اس کھیل کو دیکھکر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے دکھی دیش میں عورتیں پامال ہیں، کسان برباد ہیں، نادار اور غریب (اور ملک کی اصلی آبادی غریب ہی ہے) انصاف سے محروم ہیں اور انکی عزت و آبرو، جان و مال تمامتر دلیلوں، مہاجنوں اور زمینداروں کے رحم و کرم پر موقوف ہے۔ دھرم اور دھرم کے ٹھیکہ دار پروہت بھی اونچ طبقوں اور سرمایہ داروں کا حامی ہے۔ رسم و رواج نے سوسائٹی کو برباد کر رکھا ہے۔ خود دھرم اُن کے دباؤ سے بےجان اور بے روح ہو گیا ہے۔ اخلاق، خدا پرستی اور خلق دوستی کی جگہ ریا، رسم پرستی اور سرمایہ دوستی کا دور دورہ ہے۔

ملک کو بڑی ضرورت وطن کے سچے خادموں اور فدائیوں کی ہے جو سچائی اور بے غرضی کے ساتھ ملک و قوم کی بہتری کے لئے کھڑے ہوں، اپنے آپ کو متحد و منظم کریں۔ پھر عقل اور دلیری کے ساتھ سماجی برائیوں کے خلاف جنگ شروع کردیں، اور بہادری کے ساتھ ہر میدان میں قومی بہتری کے لئے جان، مال اور دل و دماغ کے ساتھ مصروف ہو جائیں تاکہ ہمارا دیش بھارت جو دنیا کا سب سے دکھی دیش ہے، دکھ، غربت، نفاق، ظلم، بے انصافی اور غلامی سے نجات پائے۔

ڈراما کے ہیرو "سونا" اور "رویا" دو بھائی ہیں جو ملک و قوم کی خدمت کے لئے ایک "سیوا سمتی" بناتے ہیں۔ یہ دونوں دھرمی بالک (مذہبی لڑکے) ہیں۔ خدمت خلق، آزادی وطن اور اصلاح ملک ان کا دھرم ہے۔ اول ایکٹ کا اول سین جس سے ڈراما شروع ہوتا ہے بہت پر اثر ہے۔ اس میں سونا رویا دونوں دھرمی بالک تمام خدام وطن کے لیڈر کی حیثیت میں سیوا سمتی کے ممبروں کے ساتھ صف بستہ خدا کی رحمت و ربوبیت کا بھجن گاتے ہیں۔ پھر سب ملکر اخلاص سے قوم و ملک کی سیوا کا عہد کرتے ہیں، حلف اٹھاتے ہیں، تقریریں کرتے ہیں اور آخر میں ملکر یہ کرم گان گاتے ہیں:-

بھارت کی نیا پار اُتارو! دیش کا دُکھ تارو!

٭ کوئی دو ماہ کا عرصہ ہوا یہ ڈرامہ دہلی میں بھی آیا تھا اور غالباً اپنی مقبولیت کیوجہ سے آجکل پھر آیا ہوا ہے۔ یہ ڈرامہ ایک پارسی کمپنی کر رہی ہے اور اس کے کام کرنے والے گجراتی ہیں۔ اپنے عزیز دوست دیویداس گاندھی جی کے تعلق سے ایک دو بار خود راقم الحروف کو بھی اسکے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور خود راقم تنقید نگار کے ان خیالات سے بالکل متفق ہے۔

(ایڈیٹر)

کرجاؤ شبھ نام ! نام !! نام !!!

ہندی ہو بھارت کی سنتان توجس سے ہو بھارت کا کلیان

بت کرنا وہ کام ! کام !! کام !!!

کرم نگر میں آئے ہو تو دھرم کا سودا کرلو

دھرم ہی جگ میں سچا دھن ہے،

باقی سارے دھن ہیں کھوٹے دام ! دام !! دام !!!

دنیا کے سارے دیش سکھی ہیں، بھارت دیش دکھی ہے

بھارت کا اُدھار کرو تم !

بھارت کی سیوا میں ہے سکھ دھام ! دھام !! دھام !!!

ڈرامے کے کل اشخاص ہندو ہیں لیکن مصنف کی عالی دماغی اور بلند نظری کی داد دینی چاہئے کہ ہندو دھرم کے خلاف ایک لفظ بھی دل آزارانہ نہیں ہے بلکہ پورا ڈراما ہمدردی و اصلاح کے جذبہ میں ڈوبا ہوا ہے۔ کاش ملک کے اخبار رسالے اور مصنف حضرت حشر سے سبق لیں۔ زبان ہندی ہے لیکن بالکل سلیس اور رواں۔ بناوٹ نام کو بھی نہیں، اردو خواں آسانی سے اس کو سمجھ لیتے ہیں۔ واقعی حضرت حشر ہمارے قومی ڈراما نویس ہیں جس طرح حضرت اقبال ہمارے قومی شاعر ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ہندوستانی اسٹیج پر آج تک کوئی ایسا کھیل نہیں آیا ہے اور نہ کسی کھیل نے حاضرین سے اتنا خراج تحسین گہر ہائے اشک کی صورت میں وصول کیا ہوگا۔ یہ پورا ڈرامہ ہندوستان کی موجودہ حالت پر ماتم کناں ہے اور ہر دیکھنے والے کو اسکی حالت پر ماتم کناں بنا دیتا ہے۔ ایک شخص نے حضرت حشر سے جو کھیل کو دیکھ کر زار و قطار رو رہے تھے، پوچھا آپ کیوں روتے ہیں ؟ آپ نے فرمایا میں اس کھیل کے کھیلنے والے اشخاص پر نہیں رو رہا ہوں بلکہ ہندوستان پر رو رہا ہوں جسکی غربت و مظلومیت پر یہ ڈراما رو رہا ہے۔

بچو ! آج سے تم بھی عہد کرو جیسا سونا اور روپا نے عہد کیا ہے کہ ملک و قوم کی خدمت تمہارا دھرم اور حق کی حمایت تمہارا کرم ہوگا !

(بقیہ صفحہ ۹) کی قطع و برید اور صفائی میں جو اصلی اور حقیقی تعلق ہے اس کی ماہیت اور حقیقت کے سمجھنے سے قاصر رہے۔ نیز یہ بھی وجہ تھی کہ بعض طلبا مدرسی کا کام کر چکے تھے اسواسطے بھی ذرا کتراتے اور پہلو تہی کرتے تھے کہ جنگل کا کاٹنا اور زمینوں کا درست کرنا انکے لئے شایاں اور موزوں نہیں ہے۔ انکی اس بیجا شرم اور خیال باطل کو رفع کرنے کی

غرض سے میں خود کلہاڑا اٹھا کر سبقت کرتا اور جنگل کاٹنے لگتا۔ جب انہوں نے مجھکو بذات خود درخت کاٹتے اور زمین درست کرتے دیکھا تو اس جھوٹی شرم اور خیالی عزت کو خیرباد کہکر نہایت صدقدلی اور سرگرمی سے میرے ساتھ شریک ہو جاتے اور نہایت محنت اور عرقریزی سے جنگل کاٹتے اور فصل کے لئے زمین تیار کرتے تھے۔ کئی روز دوپہر کے بعد لگاتار کدوکاوش کر کے ۲۰ ایکڑ زمین ہم نے درست کرلی اور فصل بھی بودی۔

ادھر مس ڈیویڈسن قرض کی ادائیگی کی فکر میں لگی ہوئی تھی اور اسکے لیے اُسنے مینا بازار لگانے کی تدبیر نکالی اور گھر گھر گشت لگا کر نہایت جد و جہد سے کیک، مرغی، ڈبل روٹی، سموسہ وغیرہ مختلف اشیا جو وہاں فروخت ہو سکتی تھیں لاتی اور انکو مینا بازار میں سجاتی تھی جبشی تو اپنی حیثیت اور استطاعت کے موافق جو کچھ دیسکتے تھے نہایت خوشی اور فراخ حوصلگی سے دیتے ہی تھے لیکن کوئی گورہ خاندان بھی وہاں ایسا موجود نہ تھا جس سے مس موصوف نے کوئی شے طلب کی ہو اور اُسنے دینے میں مضائقہ کیا ہو بلکہ وہ اور مختلف طریقوں سے بھی اس اسکول کے ساتھ اپنی دلچسپی اور قلبی محبت کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ الغرض چند بار ایسے بازار لگانے سے ایک خاصی رقم پیدا ہوگئی۔ اور دونو قوموں سے اپیل کرنے پر بھی کچھ نقدی وصول ہوئی۔ اکثر اوقات بوڑھے حبشیوں کے عطیات جنکی جوانی غلامی میں بسر ہوئی تھی دردانگیز معلوم ہوتے تھے۔ کبھی وہ ۵ سینٹ دیتے اور کبھی ۲۵ سینٹ۔ کبھی ایک لحاف اور کسی وقت کچھ گنے ہی دیدیا کرتے تھے۔ مجھے ایک ستر سالہ پھٹے کپڑوں والی بڑھیا جشن کبھی نہ بھولیگی جو انہی دنوں میں جبکہ ہم قرض اُتارنے کے لئے چندہ جمع کر رہے تھے، مجھ سے ملنے آئی اور کہنے لگی "مسٹر واشنگٹن ! خدا شاہد ہے میری جوانی غلامی میں بسر ہوئی، میں نہایت مفلس اور ناخواندہ ہوں لیکن اس مقصد کو جو آپ کے اور مس ڈیویڈسن کے پیش نظر ہے، خوب سمجھتی ہوں اور نہایت عزت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھتی ہوں۔ آپ حبشی مردوں اور عورتوں کو لائق و فائق بنانے میں نہایت سرگرمی اور مستعدی سے کوشش کر رہے ہیں۔ گو اسوقت میرے پاس نقد تو موجود نہیں لیکن تاہم نہایت عاجزی سے التماس کرتی ہوں کہ یہ چھ انڈے جو میں نے پس انداز کئے ہیں آپ قبول کریں، اور لڑکے لڑکیوں کی تعلیم میں صرف کریں۔" جب سے ٹسکیگی میں یہ کام شروع ہوا ہے میرے پاس سینکڑوں تحائف اور چندے اسکول کے لئے لوگوں سے وصول ہوئے، لیکن کسی نے میرے دل پر اتنا گہرا اثر نہیں کیا جتنا کہ اُس بڑھیا کے ان چھ انڈوں نے۔

حسد کا پھل

ایک بادشاہ کے دو بیویاں تھیں جن میں ایک بڑی اور دوسری چھوٹی تھی۔ دونوں کے ایک ایک لڑکی تھی۔ بڑی بیوی اور اس کی لڑکی دونوں نہایت خوبصورت، شریف طبیعت اور فرشتہ سیرت تھیں لیکن چھوٹی بیوی اور اس کی لڑکی دونوں نہایت بدصورت، کریہ المنظر اور کم عقل تھیں۔ ایک عجیب بات تھی کہ بادشاہ اپنی چھوٹی بیوی اور اس کی لڑکی سے زیادہ محبت کرتا تھا اور اپنی بڑی بیوی کی لڑکی کو کھیت کی رکھوالی کے لئے مقرر کر رکھا تھا۔ یہ بیچاری لڑکی کھیت میں تمام دن جانوروں کو ہنکاتی پھرتی تھی۔

ایک دن وہ ہنکانے چلانے سے تھک کر زمین پر لیٹ گئی اور درد بھری آواز سے چلا کر کہا "آہ! کون اس بدنصیب لڑکی کی مدد کر سکتا ہے؟ وہ یہ کہہ ہی رہی تھی کہ دفعتہً ایک بہت بڑا اژدہا اس کے سامنے آیا اور اس کو تسلی دیکر کہنے لگا "تم سو جاؤ۔ میں تمہارے کھیت کی حفاظت کروں گا۔ لیکن اس بات کا وعدہ کرو کہ تم مجھ کو اپنے گھر لیجاؤ گی اور اپنے پاس رکھو گی"۔

لڑکی نے دل میں سوچا کہ "اگر میں اس سے وعدہ کر لوں تو اس میں کچھ نقصان نہیں کیونکہ نہ یہ میرے گھر آسکتا ہے اور نہ میرے ساتھ رہ سکتا ہے" اور یہ خیال کرکے اُس نے اژدہے سے وعدہ کر لیا اور سو گئی۔ اژدہا تمام دن کھیت کی حفاظت کرتا رہا۔ اُس کے خوف سے تمام جانور ادھر اُدھر دوسرے کھیتوں میں چلے گئے اور اس کھیت میں آنا چھوڑ دیا۔ شام کو لڑکی خوش خوش اپنے گھر آئی اور اپنی ماں سے تمام واقعہ بیان کیا۔

اب یہ روزمرہ اپنے کھیت میں ادھر اُدھر کھیلتی پھرتی تھی کیونکہ جانوروں کے آنے کا اب بالکل خوف نہیں رہا تھا۔ ایک دن وہ اپنے کمرہ میں اپنی ماں کے ساتھ سو رہی تھی کہ اژدہا اُس کے گھر میں آیا اور دروازہ کے پاس کھڑے ہو کر ایک خوفناک پھنکار ماری، جس سے تمام گھر کے لوگ جاگ اُٹھے اور لڑکی روتی ہوئی بھاگی۔ اُس نے اپنی ماں سے کہا "یہ وہی اژدہا ہے جس سے میں نے وعدہ کیا تھا۔" اس کی ماں بھی یہ دیکھکر رونے پیٹنے لگی۔ اتنے میں بادشاہ آگیا اور دروازہ روک کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا "یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک خوفناک اژدہا میری لڑکی سے شادی کرے۔"

اُس کی چھوٹی بیوی دور سے کھڑی یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ اُس نے یہ حال دیکھکر اپنے دل میں خیال کیا کہ "یہ موقع بادشاہ کی بیوی اور اس کی لڑکی دونو کو نقصان پہنچانے کا اچھا ہے۔" چنانچہ یہ سوچکر وہ بادشاہ کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ "یہ جائز نہیں ہے کہ وعدہ کرنے کے بعد اس کو پورا نہ کیا جائے۔ تم دروازہ پر سے ہٹ جاؤ اور اس کو اندر جانے دو۔" بادشاہ یہ سن کر فوراً دروازہ پر سے ہٹ گیا اور اژدہا اندر داخل ہو گیا اور شہزادی کے پلنگ کے پاس جا بیٹھا۔ شہزادی بھی چپ چاپ لیٹی رہی۔ صبح کو جب شہزادی اُٹھکر باہر چلی گئی تو اژدہا فوراً ایک نہایت خوبصورت شہزادے کے بھیس میں تبدیل ہو گیا۔ اُس نے اپنی کینچلی کو آگ پر ڈال دیا۔ وہ جل کر راکھ ہو گئی۔

جب شہزادی اندر آئی تو وہ یہ ماجرا دیکھکر نہایت حیران ہوئی اور اُس سے اسکا حال دریافت کیا۔ اُس نے کہا "مجھے ایک جادوگر نے ایسا بنا دیا تھا اور کہا تھا کہ جب تم کسی شہزادی سے شادی کر لوگے اس وقت اپنی اصلی حالت پر آجاؤ گے۔" یہ سنکر شہزادی بہت خوش ہوئی اور دونوں آرام سے رہنے لگے۔

چھوٹی بیوی نے جب یہ حال دیکھا تو اس نے بھی بادشاہ سے اصرار کیا کہ وہ اس کو ایک اژدہا منگا دے۔ چنانچہ بادشاہ نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ ایک اژدہا پکڑ لاؤ" وہ گئے، اور ایک بہت بڑا اژدہا پکڑ لائے۔ رات کو اژدہے کو شہزادی کے ساتھ ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ اژدہا بھوک سے بیتاب ہو رہا تھا اس نے شہزادی کے کھانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اس نے پاؤں کی طرف سے شہزادی کو کھانا شروع کیا۔ شہزادی چلائی "اماں! اماں! مجھے بچاؤ اژدہا میرے پاؤں چبا رہا ہے۔" لیکن ماں نے باہر سے جواب دیا کہ "بیٹی غل مت مچاؤ وہ تمہارے پاؤں میں سونے کے چھاگل پہنا رہا ہوگا"۔ شہزادی نے اسکا کچھ جواب نہ دیا۔ جب اژدہا کمر تک شہزادی کو نگل گیا تو وہ پھر چلائی "اماں! اماں! میری مدد کرو اژدہا مجھے کمر تک کھا گیا ہے"۔ ماں نے جواب دیا "بیٹی وہ سونے کی پیٹی تمہاری کمر میں باندھ رہا ہوگا۔ تم ڈرو مت"۔ آخرکار صبح تک اژدہے نے شہزادی کو کھا کر ختم کر دیا۔ جب ماں نے دروازہ کھولا تو بیٹی کو نہ پایا بہت روئی پیٹی۔ بالآخر جب اژدہے کا پیٹ چیرا گیا تو اس میں سے شہزادی مری ہوئی نکلی

انعامی معمّہ

ذیل میں چند ہندسے دئے جاتے ہیں۔ ان کو نو خانوں والے مربع میں اس طرح لکھئے کہ اگر ان کو دائیں سے بائیں مقامات ا، ب، ج سے علی الترتیب د، ر، س تک اور مقامات ط، ص، ف سے علی الترتیب ل، ک، م تک گنا جائے تو ہر صورت سے ان کا مجموعہ برابر ہو۔ وہ ہندسے یہ ہیں۔

۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶

اور مربع اس قسم کا ہو۔

شرائط

۱۔ جوابات ۳۰ مئی تک مندرجہ ذیل پتہ پر پہنچنے چاہئیں
نجم الدین صاحب،
بتوسط ایڈیٹر صاحب "پیام تعلیم"
قرولباغ - دہلی

۲۔ ہر جواب کے ساتھ ایک آنہ کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

۳۔ اگر کوئی طالب علم ایک سے زیادہ ایک ایک آنے کا ٹکٹ بھیجیگا تو اس کو اتنی ہی بار مقابلہ میں شریک کیا جائے گا۔

۴۔ انعام صرف ایک ہوگا۔ اگر جوابات زیادہ ہوئے تو دوم انعام بڑھا دیا جائے گا۔

پیامِ تعلیم
جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
پندرہ روزہ تعلیمی رسالہ

شرح قیمت رسالہ ماہ تعلیم ۔ سالانہ (عہ) ۔ ششماہی عہ ۔ فی پرچہ ۔

کوائف جامعہ

از کوائف نگار

بتاریخ ۱۲ اگست ۱۹۳۰ء مدرسہ شاخ جامعہ ملیہ میں جلسہ میلاد النبی منعقد ہوا۔ طلبا نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح حیات بیان کئے۔ اور آپ کی مدح میں نظمیں پڑھ کر سنائیں آخر میں حاضرین کی شیرینی سے تواضع کی گئی جلسہ نہایت کامیاب رہا۔

گزشتہ ہفتہ جناب شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی جو جامعہ میں اُستاد تھے اور جو ملک و قوم کی خدمت کرنے کے لئے جامعہ سے علیحدہ ہوگئے تھے دہلی میں گرفتار کر لئے گئے۔ آپ کا مقدمہ مسٹر پول کی عدالت میں پیش ہوگا۔

---

۲۷ اگست کو ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری امیر جامعہ کانگرس کی مجلس عاملہ کے جلسہ کے سلسلے میں گرفتار کر لئے گئے۔ دوسرے دن جامعہ میں تعطیل رہی۔

یکم ستمبر سے جامعہ میں ایک نئی جماعت الیکٹرک اینڈ موٹر انجینیرنگ کا افتتاح ہوا ہے۔ جناب حامد علی خاں صاحب الیکٹرک انجینیر طلبا کو درس دیتے ہیں۔ اس وقت تک صرف دس طلبا کو اس جماعت میں داخلہ کی اجازت ملی ہے۔

انگلستان اور آسٹریلیا کے پانچویں اور آخری مقابلہ میں آسٹریلیا کی ٹیم نے انگلستان کی ٹیم کو شکست فاش دی۔ بریڈمین نے اس مقابلہ میں بھی ۲۳۲ دوڑیں بنائیں۔ انگلستان کی ٹیم کے کپتان مسٹر ویٹ نے آسٹریلیا کے کھیلنے کی بہت تعریف کی اور کہا کہ وہ جیتنے کے مستحق تھے۔ آسٹریلیا میں بڑی خوشیاں منائی جارہی ہیں۔

نیوزی لینڈ اور انگلستان کے آخری رگبی کے مقابلہ میں انگلستان کی ٹیم کو شکست ہوئی۔ اس طرح نیوزی لینڈ نے اپنی رگبی کی شہرت کو قایم رکھا۔

آئندہ سال چین کی ایک فٹ بال کی ٹیم انگلستان کا دورہ کرے گی۔ اس ٹیم کا انتظار بڑی دلچسپی سے ہو رہا ہے۔

ٹلڈن جو دنیا کا بہترین ٹینس کا کھلاڑی تھا اور جس نے اس سال ومبلڈن میں کپ جیتا تھا نیویارک کے ایک ٹورنامنٹ میں ایک نوجوان کھلاڑی کے خلاف کھیل رہا تھا۔ اسکا مدمقابل اس خوبی سے کھیل رہا تھا کہ ٹلڈن بمشکل پورے سیٹ میں ایک کھیل جیت سکا۔ اس پر تماشائیوں نے ٹلڈن کا مذاق اڑانا شروع کیا۔ ٹلڈن اس کو برداشت نہ کرسکا۔ اور اپنے مدمقابل سے ہاتھ ملا کر چلا گیا۔

اُستاد اور والدین کا صفحہ

اُردو کا طریقۂ تعلیم

ماسٹر شفیع الدین صاحب نیّر

جسوقت اردو پڑھانے اور لکھانے کے طریقوں کے عنوان پر کوئی بحث کرنا چاہے تو اس کا فرض ہے کہ اپنے مضمون کی وُسعت کی حدود قایم کرے تاکہ جن نتایج کو وہ اخذ کرنا یا جن اُمور کو وہ ناظرین وسامعین کے سامنے پیش کرنا چاہے ان کو صحیح طریقے سے پیش کر سکے۔ ظاہر ہے کہ جس وقت مضمون نگار عنوان بالا پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہے گا تو فوراً مختلف سوالات اسکے پیش نظر ہونگے۔ اول یہہ کہ آیا وہ ایسے طلبار کو پڑھانے لکھانے کا طریقہ بیان کرنا چاہتا ہے۔ جنکی مادری زبان اُردو ہے یا ایسے طلبار کو جن کی مادری زبان اردو نہیں۔ دوم ایسے طلبار اس کے پیش نظر ہیں جنکی عمر بہت کم ہے۔ یا ایسے طلبار ہیں جو اپنی عمر کا کافی حصہ بسر کر چکے ہیں۔ سوم آیا ایسے طلبار کو وہ زیر بحث لا رہا ہے۔ جو صرف اردو ہی کا مطالعہ کرنا اور صرف اسی زبان میں لیاقت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یا ایسے طلبار کو جو دیگر مضامین کے ساتھ ساتھ ضمناً اس زبان کے مطالعہ کے خواستگار ہیں۔ چہارم آیا وہ طلبار اس زبان میں فقط نوشت وخواند کی لیاقت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یا انکی خواہش ادبی ذوق کا حصول ہے۔ کیونکہ مندرجہ بالا ہر صورت میں مضمون نگار کا پیرایۂ بیان مختلف ہوگا۔ اور ہر مخصوص حالت کی مختلف دشواریاں یا سہولتیں اسکے پیش نظر ہو جائیں گی۔ آپ تسلیم کرینگے کہ اہل زبان کو تعلیم دینا بہ نسبت غیر اہل زبان کے آسان ہے۔ اسی طرح چھوٹے بچے کے مقابلہ میں بڑے آدمی کی ذہنی قوتیں کافی تربیت حاصل کر چکی ہوتی ہیں اور اس لئے اسکی تعلیم کا بار معلم پر بچے کی نسبت کم پڑتا ہے۔ نیز اگر مقصد صرف زبان ہی سیکھنا ہو تو طالب علم کی تمام کوششیں اسی مضمون پر مرکوز رہتی ہیں: بجائے اس کے کہ مختلف مضامین کے حصول پر منقسم ہوں

چوتھے اگر معلم کا مقصد صرف طالب علم کو نوشت وخواند ہی سے آگاہ کرنا ہے اور ذوق ادب پیدا کرنا اس کا مطمح نظر نہیں تو یہہ امر استاد کو بہت سی ذمہ داریوں سے سبکدوش کرنے کے لئے کافی ہے۔ لہذا میں شروع ہی میں یہہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس امر کو واضح کر دوں کہ میرا مقصد ایسے چھوٹے طلبار کو جن کی مادری زبان اردو ہو اور جنمیں ادبی ذوق پیدا کرنے کی ضرورت ہو ابتدائی اردو کی تعلیم تک محدود رہتا ہے۔ کیونکہ موجودہ ضرورت کا اقتضا یہی ہے کہ اس مسئلے کے اسی پہلو پر روشنی ڈالی جائے۔ تاکہ اگر ہم باہمی بحث مباحثے سے کسی مفید اور کارآمد نتیجہ پر پہنچ سکیں تو یہہ ہزارہا اساتذہ اور لکھو کھا طلبار کو فائدہ رسانی کا باعث ہوگا۔ اس امر کے لئے مدت کا تعین بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اور اس لئے میں چار سال ہی پیش نظر رکھتا ہوں اور بچے کی عمر سات سے گیارہ برس تک۔

اہمیت

جسقدر اس مسئلہ پر روشنی ڈالنی ضروری ہے اُسی قدر اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہہ نہایت اہم بھی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے؎

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا میرود دیوار کج

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر معمار پہلی اینٹ بنیاد میں ٹیڑھی لگائے تو ساری عمارت کو خواہ آپ آسمان تک اونچا لے جائیں وہ ٹیڑھی ہوگی کیا آپ نے کسی ٹیڑھے درخت کو نہیں دیکھا۔ اس کا سبب یہہ تھا کہ جب بیج میں کلہ پھوٹا تو وہ اتفاق سے ٹیڑھا تھا۔ اب اگرچہ

درخت بہت بڑا ہو گیا لیکن پھر بھی ٹیڑھا پن اس میں باقی ہے۔ اور ہمیشہ ہمیشہ یہ ٹیڑھا پن باقی رہے گا۔ یہی حال بچوں کی تعلیم کا ہے۔ اگر ابتدا میں کوئی کمی رہ گئی تو اسکی کسر مشکل ہی سے نکلتی ہے۔ اس واسطے بچوں کی تعلیم کی اہمیت پر یہ شعر بخوبی صادق آتا ہے۔

آپ نے نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی کوئی تصویر ضرور دیکھی ہو گی۔ اسکے رنگ و روغن، خد و خال، خوبصورتی و خوشنمائی اور دلکشی و دلفریبی نے بہت اثر کیا ہو گا بے اختیار آپ کا جی چاہا ہو گا کہ مصور کے موئے قلم کی آپ تعریف کریں اور تحسین کے پھول اس کی صناعی پر چڑھائیں۔ بیشک آپکی تعریف و توصیف اس موقع پر بجا ہے۔ لیکن کیا آپ ایسے موقع پر یہ امر سوچنے کی تکلیف گوارا فرمائینگے کہ یہ تناسب، یہ حسن، یہ رعنائی کیا۔ دراصل رہین منت اس خاکے کی نہیں ہے جو سب سے پہلے مصور نے پنسل سے کھینچا ہو گا۔ اگر آپ اس وقت اس خاکے کو دیکھتے تو شاید ایک لفظ بھی تعریف کا آپکی زبان سے نہ نکلتا۔ اب مکمل تصویر آپ کے سامنے ہے اور آپ ابتدائی خاکے کی خوبی پر غور بھی نہیں کرتے لیکن مہربانی فرما کر اس حقیقت کو فراموش نہ کیجئے کہ ابتدائی خاکہ بھدا۔ بھونڈا اور غیر متناسب ہوتا تو کیا ایسی اعلےٰ درجہ کی تصویر عالم وجود میں آسکتی تھی۔ پس اس تمثیل کو ابتدائی تعلیم پر منطبق کیجئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ابتدائی تعلیم درحقیقت ایک خاکہ ہے جو بچے کے سادہ لوح دل پر استاد کھینچتا ہے۔ یا بنیادی اینٹ ہے جو کسی اونچی دیوار کی رکھنا چاہتا ہے پس اگر اس موقع پر ذرا سی بھی غفلت اور بے پروائی کا اظہار کیا گیا تو تعلیم کی دیوار ہمیشہ ہمیشہ ٹیڑھی اور جس تصویر کا خاکہ تیار کرنا چاہتا ہے وہ بھونڈی رہے گی۔ اس لئے اس موقع پر ہر ہوا خواہ تعلیم کا فرض ہے کہ پورے غور و خوض سے قدم اٹھائے تاکہ غفلت اور بے پروائی کے کلنگ کے ٹیکے کا نشان اسکے ماتھے پر نہ رہے جس طرح یہ تمثیل ہر مضمون کی ابتدائی تعلیم پر عائد ہو سکتی ہے اسی طرح اردو بھی اس سے مستثنےٰ نہیں۔

اردو کی چند خصوصیتیں

اردو کی تعلیم کے متعلق ابتدا میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کی تعلیم انہیں اصول پر مبنی ہونی چاہئے جن اصول پر کسی اور مادری زبان کی تعلیم ہو سکتی ہو۔ مگر اس زبان میں چند خصوصیتیں ایسی ہیں جن کا خیال ابتدا سے رکھنا ضروری ہے۔ اگر ہم نے ان چند خصوصیتوں سے بے پرواہی برتی تو حضرت سعدی کا یہ شعر ہم پر صادق آئے گا ؎

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است

اور ہم منزل مقصود پر نہ پہنچ سکیں گے۔

اب میں اردو پڑھنے اور لکھنے میں جو عام دشواریاں ہیں ان کا ذکر کرتا ہوں اور اس ضمن میں نقطہ مقابل میری نظر میں انگریزی اور ہندی زبانیں ہیں۔ اردو کی ابتدائی تعلیم میں انگریزی اور ہندی زبانوں سے بھی زیادہ دقتیں ہیں۔ کیونکہ ان دونوں زبانوں کے پڑھنے میں مفردات کی تعداد کم ہے اور لکھنے میں اور بھی زیادہ آسان ہیں۔ اس لئے کہ ان دونوں زبانوں میں مفردات سیکھ کر ہی طالب علم مرکبات لکھنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ برخلاف اردو کے۔ اول تو اس زبان کا ماخذ کئی زبانیں ہیں اس واسطے حروف تہجی کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔ دوسرے اس زبان کے مرکبات بھی مفردات ہی کی طرح سیکھنے پڑتے ہیں۔ تیسرے اس زبان میں بعض حروف مثلاً ا ء ع۔ س ص ث ذ۔ ز ظ۔ ض۔ ح۔ ہ۔ ت۔ ط کی وجہ سے ہجے اور املا سیکھنے کے لئے جس قدر اردو میں دقت ہوتی ہے۔ اتنی مذکورہ بالا زبانوں میں نہیں ہوتی۔ چوتھے بعض صوبوں کے طلبا کے لئے بالخصوص ق۔ ک۔ ف اور پھ۔ گ اور غ۔ کھ اور خ وغیرہ کا سوال بھی ذرا دقت کا باعث ہوتا ہے۔

اگر صرف دقتیں ہی دقتیں ہوتیں تو حقیقت یہ ہے کہ اردو پڑھانے اور لکھانے کا کام بہت ہی خشک اور ناگوار معلوم ہوتا۔ مگر ان دقتوں اور دشواریوں نے ہی تعلیمی نقطہ نظر سے اس کو بہت ہی مفید بنا دیا ہے اس امر پر پوری پوری بحث انشاء اللہ تعالےٰ کسی دوسرے موقع پر کرونگا۔

(باقی آئندہ)

نظم

آمد برشگال

آئی برسات چھائے دل بادل — جوش میں آرہا ہے گنگا جل

ہے چمکتی ذرا ذرا بجلی — دور پر ہیں گرج رہے بادل

آئی پُروا ہوا گریں بوندیں — سارا میدان ہوگیا جل تھل

جوش رحمت سے خوش ہیں چوپائے — سبز و شاداب ہوگیا جنگل

جھیل و تالاب بھر گئے سارے — خاک پر بچھ گیا مخمل

عید ہے آج سبزہ زاروں میں — بلبلیں مل کے گا رہی ہیں غزل

کہ نہیں کوئی حمد کے قابل

ہاں مگر ذاتِ پاک عزّ و جل

مقبول۔ احمد پوری۔

آسٹریا

ایک زمانہ میں اسٹریا کی سلطنت یورپ میں سب سے زیادہ طاقتور سلطنت تھی۔ اس کا دارالخلافہ وی آنا اپنی گوناگوں دلچسپیوں کے باعث تمام دنیا میں مشہور تھا۔ یہاں کے باشندے باہر کے لوگوں کو یہاں آنیکی اس طرح دعوت دیا کرتے تھے "وی آنا آؤ اور خوش خوش واپس جاؤ"

جنگ عظیم کے بعد یہ طاقتور سلطنت بالکل مٹ گئی۔ ہنگری کا ایک بڑا حصہ اس سے علیحدہ ہوگیا۔ پولینڈ والوں نے ایک بہت بڑے ضلع پر اپنا قبضہ جما لیا۔ شمال کے باشندوں نے زوگوسلافیہ کے نام سے اپنی علیحدہ حکومت قائم کرلی۔ شمالی ٹائرل (جو آسٹریا کا ایک بہت بڑا صوبہ تھا) کا ایک بڑا حصہ اٹلی والے اپنے ماتحت لے آئے۔ آسٹریا کی سلطنت جو کل تک مضبوط ترین سلطنت تھی آج ایک چھوٹی سی جمہوریت رہ گئی اس وقت وہاں کی آبادی پچاس لاکھ سے زائد تھی اب بمشکل چھ لاکھ نفوس بستے ہیں۔

جنگ عظیم کے بعد ایک مدت تک اسٹریا کی حکومت بالکل غریب تھی۔ لوگ بھوکے مر رہے تھے۔ ان کے مویشی برباد ہو چکے تھے۔ نوجوان جنگ میں اپنی جانیں قربان کر چکے تھے۔ اس کے سکوں کی اب دوسرے ممالک میں کچھ قدر و قیمت نہ تھی۔

پرانے زمانہ میں آسٹریا کے پچیس ہزار کراؤن انگلستان کے ایک ہزار پونڈ کے برابر ہوتے تھے۔ لیکن جنگ کے بعد صرف دو شلنگ کے برابر رہ گئے۔ شہروں کی تمام گلیوں میں لوگ ننگے اور بھوکے پھرتے تھے۔ ان میں سے اکثر چند سال پہلے بہت امیر تھے لیکن انقلاب زمانہ نے ان کی یہ حالت کر دی تھی۔ کسان اب بھی غلہ فروخت کرتے تھے لیکن اس کے معاوضہ میں روپیہ پیسہ تو لیتے ہی نہ تھے بلکہ میز، کرسی، پیانوں اور اسی قسم کی دوسری چیزیں لینا پسند کرتے تھے۔

غرضیکہ ملک کی حالت خراب تھی۔ جب اس حالت زار کی خبر دوسرے ممالک میں پہنچی تو وہاں کے باشندوں نے چندہ جمع کر کے ان کی مدد کے لئے بھیجا۔ چند حکومتوں نے آسٹریا کی حکومت کو بڑی بڑی رقمیں قرض دیں۔ اب آسٹریا کی حالت بہت اچھی ہے اور ملک ترقی کر رہا ہے۔

آسٹریا کا ملک یورپ میں بہت خوبصورت ہے۔ سوئٹزرلینڈ سے وی آنا تک ریل کا سفر واقعی نہایت دلفریب ہے جو آدمی پہلی دفعہ اس راستہ سے گزرتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ وہ کہیں پرستان میں پہنچ گیا ہے۔ راستہ میں وہ صاف و شفاف پانی کی جھیلیں، پہاڑوں کی برف آلود چوٹیاں، اچھے اچھے شہر اور خوبصورت لوگ دیکھتا ہے۔

وی آنا کے قریب کوہ الپس میں نہایت عمدہ سیرگاہیں ہیں۔ پہلے زمانہ میں ان کا کہیں پتہ نہیں چلتا تھا۔ راستہ بہت دشوار گذار تھا اور وہاں جانیکی کوئی ہمت نہیں کرتا تھا۔ لیکن اب برقی ریلیں ہر جگہ دوڑتی پھرتی ہیں۔ ایک مقام سے دوسرے مقام پر جانا کچھ بھی مشکل نہیں ہزاروں سیاح ہر سال یہاں کی سیر کو آتے ہیں اور لطف اٹھاتے ہیں۔

آسٹریا کے لوگ سیر و تفریح اور کھیلوں کے بہت شائق ہیں جنگلی جانور اور مچھلی کے شکار کو بہت پسند کرتے ہیں۔ گرمیوں میں یہ لوگ خیمے اٹھا کر دور۔ پہاڑوں میں نکل جاتے ہیں۔ کسی اچھی جگہ پر خیمہ لگا کر زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ جب وہاں سے طبیعت سیر ہوئی تو خیمہ اٹھا کر کہیں اور چل دیتے ہیں۔

ٹائرل کے صوبہ میں وی آنا سے بھی اچھی اچھی سیرگاہیں ہیں یہاں کے باشندے تمام تر کاشتکار ہیں۔ یہ انہیں رسم و رواج پر عمل کرتے ہیں جن پر ان کے آباؤ اجداد آج سے ہزاروں سال پیشتر کرتے تھے۔ ہر ایک گاؤں میں دو چیزیں بہت نمایاں ہوتی ہیں۔

گرجا اور سرائے۔ سرائے میں صرف باہر کے لوگ ہی آکر نہیں ٹھہرتے بلکہ سرائے گاؤں والوں کا ایک کلب سا ہوتا ہے۔ یہاں ہر شام کو آدمی جمع ہو کر مختلف کھیل کھیلتے ہیں۔ اور یہیں ہر قسم کے معاملات کا تصفیہ ہوتا ہے

گاؤں کے باشندے پرانے رسم و رواج پر چلنا اپنا فخر سمجھتے ہیں آدمی اور عورتیں سخت محنت کرتی ہیں۔ بڑا دن بڑی شان و شوکت سے منایا جاتا ہے جب کوئی آدمی کسی دوسرے کو دعوت دینا چاہتا ہے تو وہ ہماری طرح یہ نہیں لکھتا کہ "آج غریب خانہ پر تشریف لاکر ماحضر تناول فرمایئے" بلکہ یوں کہتا ہے "میرے کھیتوں کی باڑ خراب ہوگئی ہے، آپ تشریف لاکر ذرا میری مدد کریں" یا اس طرح کہتا ہے کہ "بارش کی وجہ سے میرے مکان کی ایک دیوار گر گئی ہے کیا آپ اسے بنانے میں میرا ہاتھ بٹائیں گے"۔ جب دوسرا آدمی آتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ نہ تو باڑ ہی خراب ہے اور نہ ہی مکان کی کوئی دیوار گر گئی ہے البتہ کھانے پینے کی چیزوں کی افراط ہے اس طرح سب مل کر کھاتے ہیں اور ہنستے کھیلتے رہتے ہیں

ٹائرل والے اپنے ہیرو اندر اس ہوفر کا دن بڑی شان و شوکت سے مناتے ہیں۔ ہوفر میران کے شہر میں پیدا ہوا تھا اور ایک سرائے کا مالک تھا۔ جب ۱۸۰۹ء میں نپولین نے ٹائرل پر حملہ کیا تو یہاں کے باشندوں نے ہوفر کو اپنا سردار منتخب کر لیا اور فرانسیسیوں کو شکست دی۔ لیکن نپولین نے بویریا سے عہد نامہ کرکے اس حصہ کو تقسیم کر لیا ہوفر خاموش بیٹھنے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ آہستہ آہستہ تمام کسانوں میں آزادی کی روح پیدا کر رہا تھا۔ ایک دن اس نے تمام کسانوں کے نام پیغام بھیجا کہ "اب وقت آگیا ہے" اس رات الپس پر ایک بہت بڑی آگ جلائی گئی جس کا مطلب یہ تھا کہ لڑائی کے لئے تیار ہو جاؤ۔ دوسرے دن ہوفر نے ایک بہت بڑے لشکر کو ساتھ لیکر بویریا پر حملہ کر دیا۔ انس برک کے مقام پر بویریا والوں کو شکست ہوئی۔ نپولین نے یہ سن کر اپنے ایک افسر کو پچاس ہزار فوج دیکر روانہ کیا لیکن اسے بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کے بعد ٹائرل والوں نے ہوفر کو اپنا گورنر منتخب کر لیا۔ اسے روزانہ چار شلنگ اپنے اخراجات کے لئے ملتے تھے۔ اس نے نہایت عمدہ طریقہ سے حکومت کی لیکن نپولین کی آنکھوں میں ہوفر کانٹا تھا۔ اس نے ایک بڑی فوج سے ہوفر کو شکست دی۔ ہوفر گرفتار کر لیا گیا۔ فرانسیسیوں نے اس پر مقدمہ چلایا اور بیچارے کو گولی مار دی گئی۔

انس برک کوہ الپس کے دامن میں نہایت خوبصورت چھوٹا سا شہر ہے۔ یہ پہلے زمانہ سے مشہور چلا آتا ہے۔ اب یہاں ایک یونیورسٹی ہے اور تجارت کا مرکز ہے۔

آسٹریا جانے والے کو سالبرگ ضرور دیکھنا چاہیئے۔ یہاں پرانے زمانہ کے محلات اور قلعے ہیں جن سے قدیم شان و شوکت کا اظہار ہوتا ہے۔

دی آنا بڑا خوبصورت شہر ہے اس کی ہر عمارت شاندار محل معلوم ہوتی ہے۔ یہاں چمڑے کا کام بہت ہوتا ہے دی آنا کے کپڑے بنانے والے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ سابق شہنشاہ فرنسس جوزف کا محل بڑا شاندار اور عظیم الشان ہے ہزاروں سیاح اسے دیکھنے کے لئے آتے ہیں۔ اب اسے عجائب خانہ بنا دیا گیا ہے۔

جب لوگوں سے پوچھا جاتا ہے تم دی آنا کو کیوں پسند کرتے ہو تو وہ جواب دیتے ہیں "یہاں انسان کو خوش رکھنے کے لئے اتنی مختلف چیزیں ہیں کہ ہم کسی خاص چیز کا نام نہیں لے سکتے"

فرانسیسی کسابی نیکا

راغب احسن صاحب بی اے

۱۷۹۸ء میں فرانس اور انگلستان کے جنگی بیڑوں کے درمیان، دریائے نیل کے دہانہ پر، خلیج ابوکبیر کے اندر بڑی زبردست اور اہم لڑائی ہوئی۔ یہ نیل کی لڑائی کہلاتی ہے۔ اس نے فیصلہ کر دیا کہ مشرق میں فرانس سب سے زیادہ طاقتور سلطنت رہیگا یا انگلستان۔ لڑائی میں جیت انگریزوں کی ہوئی۔ انگریزی بیڑے کا افسر مشہور بہادر نلسن تھا۔ اس نے نہایت ہوشیاری اور بہادری کے ساتھ نپولین کے فرانسیسی بیڑے پر، جس کے ذریعہ وہ مصر پر قابض تھا اور ہندوستان میں انگریزی راج کو دھمکی دے رہا تھا، حملہ کیا۔ نلسن کا حملہ ایسے غضب کا تھا کہ فرنچ بیڑا بالکل تباہ ہوگیا اور نپولین کا سارا کرا دھرا برباد ہوگیا، اور فرانس کی مشرقی سلطنت کا خواب، پریشان ہوگیا، کیونکہ نیل کی لڑائی کا یہ نتیجہ ہوا کہ مشرقی ملکوں کی دو کنجیوں یعنی مصر اور ہندوستان پر فرنچ اثر باقی نہیں رہا لیکن انگریزوں کا اختیار اُن پر رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اور ساتھ ہی سارے مشرق میں انگریزی اقتدار کو ترقی ملتی گئی۔ اس طرح مصر اور ہندوستان، مشرقی ملکوں پر انگریزی قبضہ و اختیار کے دو بنیادی پتھر بن گئے۔ لیکن اس انگریزی قبضہ کی بنیاد دراصل نیل کی مشہور فتح نے رکھی تھی۔ انگریز ہندوستان اور مصر کو اب تک اپنی سلطنت کی دو بڑی کنجیاں خیال کرتے اور اُن پر قبضہ رکھنا ضروری جانتے ہیں اگرچہ اب مصر اور ہندوستان میں آزادی کی زبردست لہر اور قومیت کی جدید طاقت پیدا ہوگئی ہے اور انگریز مجبوراً کچھ دینے پر تیار ہو رہے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ انگریزی اقتدار مشرق میں بغیر مصر و ہند کے قائم نہیں رہ سکتا ہے۔

"پیامِ تعلیم" میں نیل کی لڑائی کے انگریز ہیرو لارڈ نلسن کا تذکرہ آچکا ہے آج میں اس جنگ کے فرنچ ہیرو "کسابی نیکا" کا مختصر حال لکھتا ہوں۔

واضح ہو کہ جس طرح فتح اور کامیابی میں بہادری کے کارنامے ہوتے ہیں شکست اور ناکامی میں بھی ہوتے ہیں۔ پھر جس طرح بڑے جوان لوگ بہادر اور ہیرو ہوتے ہیں ویسا ہی ادنیٰ بچہ بھی ہو سکتے ہیں بشرطیکہ اُن کا کام اعلیٰ ہو۔ اس لڑائی کے وقت کسابی نیکا قریب ۱۲ سال کا ایک لڑکا تھا۔ وہ بچپن ہی سے بڑا جری اور جیوٹ تھا اُس کا باپ ایک پیدائشی سپاہی تھا اور نپولین شہنشاہِ فرانس کا بڑا پیارا افسر تھا۔ نلسن کی طرح کسابی نیکا کا باپ بھی ایک امیر البحر یعنی جنگی بیڑے کا کمانڈر تھا اور اُس کو بچپن سے ہی لڑائیوں میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اُس کے جہاز کا نام اُورینٹ (مشرق) تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مشرقی ملکوں پر فرانس کا اثر و اختیار قائم کرنے کو تیار ہوا تھا اور اسی کام کے لئے مشرق کے پھاٹک مصر میں آیا تھا۔ یہاں اچانک نلسن کے بیڑے نے اُس کو خلیج ابوکبیر میں آگھیرا، بڑی بھاری لڑائی ہوئی۔ گولہ باری سے گویا سمندر میں آگ لگ گئی، بہت سے جہاز برباد، بہت سے غرق اور بہت سے آگ میں مبتلا ہوئے۔ کسابی نیکا کا باپ خاموشی و استقلال سے انگریزوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ ایک ضرورت سے اُس کو جہاز کے ایک دوسرے حصہ پر جانا پڑا۔ جانے کے پہلے اُس نے اپنے لختِ جگر کسابی نیکا کو جو حسبِ معمول اس معرکۂ کارزار میں اُسکے ساتھ تھا، حکم دیا کہ "تم جہاز کے ڈیک پر جہاں ہو، وہیں کھڑے رہو۔ ہرگز دوسری جگہ مت جاؤ جب تک میں واپس آکر تم کو کہیں دوسری جگہ جانے کی اجازت نہ دوں"۔

(باقی آئندہ)

بہنو اور بھائیو! مجھے بہت مسرت ہے کہ آپ نے اس جلسہ میں دل سے شرکت کی ہے، میرا خیال ہے اور آپ سب میرے ہمنوا ہونگے کہ بلیوں کے حقوق کی حفاظت لازمی اور ضروری چیز ہے۔ ہم اپنے بالوں کو دودھ کی طرح سفید کس طرح رکھ سکتے ہیں اگر دودھ سے ہم کو محروم کر دیا جائے۔ ہم اپنے بچوں کو کس طرح طاقتور کر سکتے ہیں اور ہم میں وہ روح کس طرح پیدا ہو سکتی ہے جس سے کہ ہم چوہوں کا شکار کر سکتے ہیں

میں یہ بار بار کہنے کو تیار ہوں کہ انسان کو شرم کرنی چاہیئے۔ انہیں باتوں کی وجہ سے انسان خود اپنے ہاتھوں اپنی عزت کھوتا ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ تمہاری آنکھوں سے آنسو نکل رہے ہیں یہی آنسو میری آنکھوں سے بھی نکل چکے ہیں تم اب تک ان کے نشانات دیکھ سکتی ہو۔ ایک اور اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بغیر دودھ کے ہم اپنا کھانا اور ناشتہ کس طرح کر سکتے ہیں۔

کیا ہمیں اپنے آپ کو آدمیوں کے حوالہ کر دینا چاہیئے اور انہیں اسی طرح خوش رکھنا چاہیئے جس طرح ہم رکھتے چلے آئے ہیں۔ نہیں واللہ ہرگز نہیں۔ میں تم سے یہ سوال کرتی ہوں کہ کیا ہمیں انسان سے نرمی برتنی چاہیئے، یا اپنے دانتوں اور پنجوں سے ان کے مقابلہ کرنا چاہیئے؟

تمام بلیوں نے دانتوں اور پنجوں کا نعرہ بلند کیا اور اپنے اپنے پنجے اُٹھا دئے۔

اس کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔ اور سب نے اپنی اپنی راہ لی۔

"حقوق زندہ باد"

مغرور گیہوں

بشیر احمد صاحب

اگر تم کسی روز مینہ برسنے کے بعد کسی گیہوں کے کھیت میں جاؤ جس میں پودے کھڑے ہوں تو وہ تمہیں ایسا سیاہ نظر آئیگا جیسے جل گیا ہو۔

میں تمہیں اس کی بابت ایک کہانی سناؤنگا۔ جو میں نے ایک چڑیا سے سُنی ہے اس چڑیا نے یہ کہانی ایک کہن سال بید مجنوں سے سنی تھی۔ جو گیہوں کے کھیت کے قریب لگا ہوا تھا۔ اور اب بھی اُسی جگہ ہے۔ وہ کہانی یہ ہے :۔

صبح کا وقت تھا۔ گیہوں کے پودے ہوا میں لہلہا رہے تھے اُن میں بالیاں آگئی تھیں جن کے سبب وہ جُھک گئے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا گردن جھکائے خدا کی حمد وثنا میں مصروف ہیں لیکن "گیہوں" کا درخت نہایت بے باکی اور شان کے ساتھ اپنا سر اُٹھائے قدرت کے پُرفضا مناظر کو دیکھ رہا تھا اور نسیم سحری کے ساتھ ہم آغوشی کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ مجنوں کے درخت نے اُس سے پوچھا "تم اس طرح مغرورانہ انداز سے کیوں کھڑے ہو"؟

موٹے گیہوں نے جواب دیا "مجھ میں سنہری بالیاں لگی ہوئی ہیں جو خوبصورتی میں اپنا مثال نہیں رکھتیں اور میرے پھول مثل سیب کے پھولوں کے پیارے معلوم ہوتے ہیں میں ان چیزوں پر جسقدر ناز کروں بجا ہے۔ اے کہن سال بید مجنوں! کیا تم نے کوئی چیز مجھ سے بھی زیادہ خوبصورت دیکھی ہے"؟

بید مجنوں نے جواب میں صرف اپنی گردن ہلائی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُس نے کوئی چیز اس سے بھی زیادہ خوبصورت دیکھی ہے۔

"بیوقوف بید مجنوں" موٹے گیہوں نے کہا "تم اتنے بوڑھے ہو گئے ہو کہ تمہارے منہ پر گھاس اُگ آئی ہے"۔

عین اُسی وقت بارش کا ایک زبردست طوفان آیا کھیت کے تمام پودوں نے اپنے پھول موڑلئے اور اپنے چھوٹے سر جُھکالئے لیکن ایک گیہوں کا درخت تھا جو نہایت بے باکی کے ساتھ سر اُٹھائے تمام کھیت کی حالت کو دیکھتا رہا۔

"تم بھی اپنا سر ہماری طرح جھکالو" تمام پھولوں اور پودوں نے گیہوں کے پودے سے کہا۔

"میں کبھی نہیں جھکونگا" اُس نے جواب دیا۔

پھر بید مجنوں نے اُس سے کہا کہ "تم اپنے پھولوں کو پتوں میں چھپالو اور اوپر مت دیکھو کیونکہ آسمان پر بجلی چمک رہی۔ بعض اوقات لوگ اُس کو دیکھنے سے اندھے ہو جاتے ہیں۔

"آسمان پر میں بجلی کو چمکتے دیکھونگا" گیہوں نے جواب دیا۔

اب بارش رُک گئی تھی۔ تمام چیزیں عجیب انداز میں نظر آرہی تھیں چھوٹے چھوٹے گیہوں کے پودے ہوا میں لہلہا رہے تھے۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے تمام کھیت مہک رہا تھا غرضیکہ ہر چہار طرف کھیت میں پُرلطف منظر نظر آرہا تھا۔

لیکن "مغرور گیہوں" زمین پر مرجھایا ہوا پڑا تھا۔

کہن سال بید مجنوں اُسکی حالت زار پر زار زار رو رہا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ تم کیوں رو رہے ہو اُس نے مجھے مغرور گیہوں کی یہ کہانی سنائی جو اس وقت میں نے تم سے بیان کی ہے۔

بیکاری

از محترمہ رقیہ ریحانہ

سلیمن کا گھر نینی تال میں تھا۔ ہاں پندرہ بیس کمروں والے محل کو بھی گھر کہہ سکتے ہیں جس میں ہزاروں روپیے کے قالین، لاکھوں کا ساز و سامان ہو، بجلی کی روشنی سے جھاڑ فانوس جگ مگ جگ مگ کرتے ہوں، گرمی میں پنکھے چلتے ہوں سردی میں انگیٹھیاں دہکتی ہوں۔ اور اس کوٹھری کو بھی گھر کہتے ہیں جس کے ایک کونے میں ٹوٹا سا چولھا ہو۔ ایک کونے میں ایک بانس کی چارپائی اور ایک اس سے چھوٹا کھٹولا پڑا ہو جس کے تین پائے ہوں اور ایک پایہ کی جگہ دو گما اینٹیں۔ ایک گوشہ میں چھوٹا سا مٹی کا دیا ٹمٹماتا ہو اور دروازہ کے سوراخوں اور درازوں میں سے جاڑوں میں برف جیسی ٹھنڈی ہوا سرسراتی ہوئی آتی ہو۔ تو ہماری سلیمن کا گھر اسی دوسری قسم کا گھر تھا۔ اس میں سلیمن، سلیمن کا باپ مستیا اور سلیمن کی ماں لڑتی رہا کرتے تھے۔ بانس والی چارپائی پر ماں بیٹیاں پڑ رہتی تھیں اور کھٹولے پر مستیا گنڈلی منڈلی ہو کر سوجاتا تھا۔

جاڑوں کا موسم تھا۔ تم جانتے ہو کہ نینی تال بڑے اونچے پہاڑ پر ہے اور سردی میں وہاں خوب برف پڑتی ہے۔ اور ایسی ٹھنڈی ہوا چلتی ہے کہ بدن کٹا جاتا ہے۔ سلیمن کے ماں باپ کے پاس اوڑھنے بچھانے کو بس یونہی سا تھا۔ غریب کھادی کے دوہرا دو روئی کے پھٹے پرانے گودڑوں سے کام لیتے تھے۔ ادھر دروازہ کے سوراخوں اور درازوں میں سے ہوا آتی تھی اور بدن میں چھیدی جاتی تھی۔ سوراخوں کو تو سلیمن کی ماں نے گودڑے سے بند کر دیا تھا مگر درازوں کا کیا کرتی۔ لاچار یہ بچارے رات بھر چولھے میں اوپلے جلاتے رہتے تھے۔ اس کی گرمی سے رات کٹ جاتی تھی پہلے تو دھویں سے ذرا دم گھٹتا تھا مگر اب یہ بھی اچھا لگنے لگا تھا۔

سلیمن کا باپ مستیا راج تھا۔ مگر معمولی سا کام جانتا تھا۔ روز دس آنے بارہ آنے مل جاتے تھے۔ لیکن کام لگنا شرط تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ مہینہ مہینہ بھر کام نہ ملتا۔ آج کل البتہ نینی تال میں کئی مکان بن رہے تھے، گرمی میں بڑے بڑے لوگ یہاں پہاڑ پر آکر دن گزارتے ہیں اس لئے یہاں کے لوگ جاڑوں جاڑوں اپنے پرانے مکانوں کی مرمت کرا لینا اور نئے مکان بنانا چاہتے ہیں۔

تو آج کل میاں مستیا کا کام سیٹھ جی کے مکان پر لگ گیا تھا یہ مکان آبادی سے بالکل باہر، پہاڑ کی اونچی سی چوٹی پر بن رہا تھا۔ مستیا کو اپنے گھر سے کوئی دو ڈھائی کوس چلنا ہوتا تھا۔ اس لئے صبح صبح ہی گھر سے نکل کھڑا ہوتا۔ اور شام کو چراغ جلے واپس آتا۔

دن بھر پاڑہ پر کھڑے رہنا اور وہ بھی جنوری کی ٹھنڈی ہوا میں۔ بس جب گھر لوٹتا تو ہاتھ پاؤں ایسے ٹھنڈے ہوتے تھے جیسے برف کی قفلی اور ایسے سُن کہ چھریاں چلاؤ تو پتہ نہ چلے۔ واپسی پر مستیا جہاں گھر میں گھستا سلیمن دوڑ کر اس کے پیروں میں لپٹ جاتی۔ لڑتی جھٹ مٹی کی ہنڈیا چولھے پر رکھ کر چاء پکاتی اور ذرا سا نمک ڈال کر پہلے مستیا کو ایک آبخورہ میں چاء دیتی اور پھر مٹی کے ایک پیالہ سے جس کی کور ٹوٹی ہوئی تھی خود بھی پیتی اور بیچ بیچ میں ایک گھونٹ سلیمن کو دیتی جاتی۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ مستیا روز کی طرح صبح صبح کام پر گیا۔ رات میں برف خوب گری تھی اس لئے زمین پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی

نے سفید روئی کے گالے بچھادئے ہیں۔ ذرا دھوپ نکلی کہ سلیمن پڑوس کے بچوں کے ساتھ برف پر کھیلنے نکل گئی۔ کوئی برف کی گیندیں بنا بنا کر دوسرے پر پھینکتا تھا۔ کسی نے برف کا ایک آدمی سے بنا لیا تھا جس پر سب برف کے گیندے مارتے تھے۔ دھوپ چٹکی ہوئی تھی۔ سلیمن کوئی بارہ بجے تک کھیلتی رہی۔ ادھر بارہ بجے کا گھنٹہ بجا اور سلیمن کو خیال آیا کہ اب ابا کے لئے روٹی لیجانا ہے۔ فوراً دوڑی ہوئی گھر آئی۔ اور بچے روکتے بھی رہے پر یہ نہ ٹھہری۔

گھر پہنچی تو دیکھتی کیا ہے کہ ابا تو چولھے کے پاس بیٹھے اپنی گڑ گڑی پیتے جاتے ہیں اور تاپ رہے ہیں۔ ابا اس دن آٹھ ہی بجے لوٹ آئے تھے۔ سلیمن نے پوچھا "ابا۔ آج ابھی سے آگئے؟" مسیتا نے جواب دیا "ہاں، بیٹی، آج کام نہیں ہے۔ سردی کے مارے سارا چونا جم گیا۔ آج کام نہیں ہوگا۔" ہاہاہا، سلیمن بولی "یہ تو اچھا ہوا۔ تو اب میں روٹی تو نہ لیجاؤنگی" "ہاں بیٹی" ماں نے جواب دیا "آج تو ابا گھر ہی پر رہیں گے۔" اور مسیتا چپ رہا۔

"ابا۔ یہ تو بڑا اچھا ہوا، تم آگئے۔ کبھی تو کام سے چھٹی ملی۔ آج تو دن بھر گھر پر رہو۔ خوب گرم گرم۔ ذرا سو جاؤ۔ میں پاؤں دابونگی نہیں تو یہاں گھر پر بھی تو بہت کام ہے۔ میری لکڑی کی گڑیا کا سر ٹوٹ گیا ہے۔ وہ جو گڑیا کی گاڑی تم نے بنا دی تھی اس کا پہیہ نکل گیا ہے۔ میرے اور کھلونے بھی ٹوٹ گئے ہیں۔ اماں کو تو ٹھیک کرنا آتا نہیں تم ٹھیک کر دینا۔"

مسیتا نے سلیمن کے سارے کھلونے ٹھیک ٹھاک کر دیئے۔ اپنے کھٹولے کے لئے بسولے سے ایک موٹا سا پایہ بھی بنا لیا۔ لکڑی کی دو تین گانٹھیں پڑی تھیں انہیں چیرا۔ چارپائی کی ادوان کھینچی۔ اور پھر یونہی ٹالم ٹول کر کے جیسے تیسے دن گزار دیا۔

مگر سردی تھی کہ کم نہ ہوتی تھی۔ رات کو ہوا ایسی چل رہی تھی جیسے آندھی آئی ہو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی گھر کے کواڑ پکڑ پکڑ کر ہلا رہا ہے۔ رات بھر اوپلے جلتے رہے مگر پھر بھی سردی کے مارے سلیمن کی کپکپی نہ جاتی تھی۔ جوں توں صبح ہوئی۔ یہی حال ۴۔۵ دن تک اور رہا کسی دن برف پڑتی۔ مگر سردی کسی طرح کم نہ ہوتی تھی

چھٹے دن مسیتا نے سلیمن کی ماں سے کہا "لو۔ اب تو اوپلے بھی ہو چکے۔ بس یہی جو چھپرے میں پڑے ہیں یہی ہیں۔" لڑتی اُٹھ کر دوسرے کونے میں گئی اور سب سے نیچے والی ہانڈی میں سے ایک میلی سی تھیلی نکالی اور اس میں سے جو کچھ تھا سب لا کر سلیمن کے باپ کے سامنے رکھ دیا۔

دو چونیاں تھیں، ایک اکنی اور چودہ پیسے کل ساڑھے بارہ آنے مسیتا نے کہا "میں تو جانتا ہوں سب کے اوپلے خرید لو۔ سردی کا کیا ٹھیک ہے۔ کھانے پینے کا اللہ مالک ہے۔ شبو سے قرض ہی لے لیں گے۔ اوپلے تو قرض نہیں ملیں گے۔"

اس دن دوپہر کو ان سب نے ٹھنڈی روٹی اور ارہر کی بہت پتلی دال کھائی۔ سلیمن نے کہا "اماں، تم نے کہا تھا جمعرات کو کلیجی پکاؤنگی۔" ماں نے جواب دیا "بیٹی، قصائی اُدھار نہیں دیتا۔"

دوسرے دن ماں نے سلیمن سے کہا "بیٹی، جا شبو کے یہاں سے ڈھائی سیر جو کا آٹا لے آ۔" سلیمن نے کہا "اماں پیسے" ماں نے جواب دیا "ادھار مانگ لانا۔ اور دو پیسہ کا نمک اور ایک دیا سلائی کی ڈبیا بھی۔ راستہ میں حسینی کے یہاں سے دو پیسہ کے آلو بھی ادھار لیتی آنا" سلیمن گئی، شبو نے ذرا منہ بنایا مگر آٹا، نمک اور دیا سلائی کی ڈبیہ سلیمن کو دیدی اور اپنے کھاتہ میں لکھ لیا۔ حسینی کی دکان پر پہنچی تو اس نے للکارا "بڑی آئی ہے اُدھار لینے۔ گھر میں خزانہ گڑا ہے نہ جو میں اپنے پیسے وصول کرونگا۔ مجھے حساب وساب لکھنا نہیں آتا۔ جاؤ اُدھار شبو ہی کے سے لو۔" سلیمن بہت آزردہ ہوئی اور گھر لوٹ آئی،

تین دن اور گذر گئے۔ آٹا ختم ہوگیا۔ اور سردی کا وہی حال۔ سیٹھ جی کے مکان پر کام بند کا بند۔ ماں نے سلیمن کو پھر شبو کے ہاں بھیجا۔ شبو نے بھی اب کی دفعہ آٹا دینے سے انکار کر دیا۔ اور کہا "ابھی وہ تین مہینہ پہلے کے دام بھی تو نہیں آئے۔ میں کہاں تک بھرے جاؤں" سلیمن نے آ کر جب یہ حال سنایا تو ماں باپ دونوں سن سے ہو گئے اور چپ ہو بیٹھے۔ تھوڑی دیر میں لڑتی نے کہا "یا اللہ اب کیا ہوگا۔ میرے پاس تو ایک کوڑی بھی نہیں" مسیتا بولا "میرے پاس اس دن کے دو پیسے بچے ہوئے ہیں۔ مگر دو پیسے میں کیا کام نکلے۔"

شام ہوگئی تھی۔ لڑیتی نے کونے میں دیا جلایا۔ سوکھی روٹی کے کچھ ٹکڑے بچے پڑے تھے انھیں پانی میں بھگو دیا اور اوپر سے نمک کی دو کنکریاں ڈال ایک مرچ توڑ دی۔ اس طرح جو چیز تیار ہوئی وہ سلیمن کو کھلا کر اُسے سلا دیا۔ اور یہ دونوں بہت دیر تک چولھے کے پاس چپ چاپ بیٹھے رہے گھر کے پاس ہی ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ اس سے اذان کی آواز آئی۔ یہ آواز روز ہی آتی ہوگی مگر مستیا کام سے کچھ ایسا تھکا ماندہ آتا تھا کہ شاید اذان سے پہلے ہی سو جاتا تھا آج کچھ ایسا معلوم ہوا کہ یہ اذان دینے والا اسی کو بلا رہا ہے، مستیا نے لڑیتی سے کچھ کہا بھی نہیں، جھٹ اُٹھ کر ٹھنڈے یخ پانی سے وضو کیا۔ کرتے سے ہاتھ منہ پوچھے اور مسجد کو چلدیا۔

مسجد میں اس دن مجمع ذرا زیادہ تھا۔ اڑوس پڑوس کے سارے غریب راج مزدور بھی تھے۔ اور راجوں کا مستری جو کبھی مسجد میں نہ آتا تھا وہ بھی آج آیا تھا۔ مستیا اور سب کو تو جانتا تھا مگر آج نماز نہ جانے کس نے پڑھائی تھی۔ کوئی نئے آدمی تھے، لمبی سی کالی کالی داڑھی پر تیل ملا ہوا جس سے وہ چم چم چمکتی تھی، سر پر پٹے دار بال ان پر ایک بڑا سا پگڑ، بہت ڈھیلی سی عبا۔ آنکھوں میں سرمہ نماز ہو چکی تو یہ منبر پر جا بیٹھے۔ مستیا نے اپنے پاس والے سے پوچھا یہ کون ہیں؟۔ اس نے بتلایا کہ سہارن پور کے بڑے مولوی صاحب ہیں اشرف مستری کے پیر

مولوی صاحب نے کوئی دو گھنٹہ تک وعظ کیا۔ مستیا پر اپنی مصیبت کا بھی کچھ اثر تھا، کچھ ان مولوی صاحب نے اللہ رسول کی ایسی باتیں کیں۔ اللہ رسول کے لئے لوگوں نے اپنے جان مال جس طرح قربان کیا ہے اس کے ایسے ایسے قصے سنائے کہ مستیا زار زار رونے لگا۔ آخر میں مولوی صاحب نے چندہ مانگا۔ سب لوگ اُٹھ اُٹھ کر رومال میں جو منبر کے نیچے بچھا تھا کچھ ڈالنے لگے۔ کسی نے اٹھنی دی کسی نے چونی، اشرف مستری نے خوب کھنکھنا کر دو روپیہ رومال میں ڈالے۔ اس کے بعد مستیا بھی اُٹھا اور اپنی گوٹ میں سے دو پیسے جو اس کے پاس رہ گئے تھے جا کر رومال میں ڈال آیا۔ مولوی صاحب وعظ کے بعد مستری کے گھر دعوت تھی وہاں چلے گئے مستری نے خوب چربی والا چکنا گوشت پلاؤ کے لئے منگایا تھا۔ موہن حلوائی کے یہاں سے بالائی منگائی تھی۔ اور نہ جانے اور کیا کیا انتظام کیا ہوگا۔ ہاں تو مولوی صاحب تو اس دعوت میں چلے گئے اور مستیا پھر اپنے گھر لوٹ آیا۔

مستیا کو گھر سے گئے کوئی ڈھائی گھنٹے ہو گئے تھے۔ لڑیتی کچھ دیر تو جاگتی رہی پھر وہیں چولھے کے پاس بیٹھے بیٹھے اونگھ آگئی اب جو مستیا گھر میں آیا تو اس کی آہٹ سے آنکھ کھلی۔ آنکھ کھلتے ہی پوچھنے لگی "تم نے یہ بھی دیکھا۔ یہ کیا ہے" مستیا نے کہا کیا ہے کچھ بھی نہیں میں ہوں: لڑیتی اب خوب ہوشیار ہوگئی اور مستیا کو بتانے لگی کہ "ابھی ابھی گھر میں کچھ عجیب سی روشنی تھی اور بہت سے ننھے ننھے بچے سے تھے، میں تو جانوں ان کے پر بھی تھے۔ کدھر گئے" مستیا نے سمجھا کہ خواب دیکھا ہوگا خواب"

اب لڑیتی اُٹھ کر سلیمن کے پاس پڑ رہی اور مستیا اپنے گھوڑے پر لیٹ گیا، بہت دیر تک تو دونوں چپ چاپ لیٹے رہے۔ پھر مستیا کی تو آنکھ لگ گئی۔ مگر لڑیتی کو نیند نہ آئی۔ کوئی ۳ بجے مستیا ہڑبڑا کر اُٹھا اور سلیمن کی ماں سلیمن کی ماں پکارنے لگا۔ تو نے دیکھا بھی یہ کون لوگ تھے؟" لڑیتی نے کہا میں تو جگ ہی رہی ہوں۔ کوئی نہ تھا، یونہیں تمہیں خیال ہو گیا" مستیا نے کہا "نہیں نہیں ابھی ابھی سارے گھر میں ایسی دودھ جیسی سفید روشنی تھی۔ اور ننھے ننھے بچے ادھر اُدھر اُڑ رہے تھے اور ایک کے پاس تو نہ جانے خوان میں کھانے کی کیا کیا چیزیں تھیں"۔ لڑیتی نے کہا تم نے خواب دیکھا ہوگا۔

دونوں پھر چپ پڑ رہے۔ کہ صبح کی اذان ہوئی۔ مستیا پھر اُٹھا اور برف کے سے پانی سے وضو کر کے مسجد کو گیا نماز پڑھ کر لوٹا تو ساتھ ہی مسجد سے نصرت بھی نکلا۔ یہ بھی اسی کے ساتھ سیٹھ صاحب کے مکان پر کام کرتا تھا۔ اور اسی کی طرح کئی دن سے بیکار تھا۔ اس نے کہا بھیا مستیا سڑکوں پر سے برف ہٹانے کے لئے صفائی میں آدمیوں کی مانگ ہے۔ آج چلو ہم تم بھی چلیں مستیا نے کہا اچھا گھر پر آ کر سلیمن کی ماں کو خبر کی اور دونوں نے صفائی کے دفتر کا رُخ کیا۔ وہاں اسے ۶ر روز پر کام مل گیا

چاند

رجسٹرڈ ایل
پیام تعلیم
جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا
پندرہ روزہ تعلیمی رسالہ

جملہ اشتہاروں میں ہر ایک چیز کے ساتھ اسکی قیمت مطابق اشتہار لکھنی چاہئے۔ **قیمت پیام تعلیم۔ سالانہ ۶ ششماہی ۳ فی پرچہ ۱ر**

کوائف جامعہ

از

کوائف نگار

گذشتہ دو ہفتوں میں جامعہ کی ہاکی ٹیم نے تین میچ کھیلے۔ دو امپیریل کلب سے اور ایک ینگس کلب سے۔ امپیریل سے پہلی مرتبہ نتیجہ برابر رہا۔ لیکن دوسرے میچ میں جامعہ کی ٹیم دو گول سے ہار گئی۔ ینگس والے بھی دو گول سے جیت گئے۔ امسال کھیلنے والے نئے ہیں اور مشق بھی اچھی طرح سے نہیں ہوئی امید ہے آئندہ میچوں میں جامعہ کی ٹیم اپنے آپ کو زیادہ اچھا ثابت کریگی۔

تعطیلات کے بعد ۱۰ر ستمبر ۱۹۳۰ء کو انجمن اتحاد کا پہلا جلسہ گلشن منزل ہال میں منعقدہ ہوا۔ تجویز زیر بحث یہ تھی کہ موجودہ تحریک آزادی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کو بحیثیت مجموعی عملی شرکت سے محترز رہنا چاہیئے" اس مضمون کے مخالف و موافق بہت سی تقریریں ہوئیں۔ جلسہ کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔

اسی تاریخ کو تربیت گاہ بشیر منزل میں بھی بزم ادب کا ایک جلسہ ہوا۔ جس میں طلبا نے اپنی زندگی کے دلچسپ واقعات یا دوسرے مشہور لوگوں کے حالات بیان کئے

آئندہ پرچہ سے کونٹ ٹالسٹائے کی ایک طویل اور دلچسپ کہانی شایع ہونا شروع ہو گی۔ جسکو پڑھکر بچے بہت خوش ہونگے

کھیل کی خبریں

از

کھلاڑی

گذشتہ ہفتہ مارلی بارن کرکٹ کلب کی طرف سے اسٹریلیا کی ٹیم کو ایک شاندار دعوت دی گئی۔ اس دعوت میں انگلستان کے بڑے بڑے لوگ بھی شریک تھے۔ لارڈ ہیرس نے اسٹریلیا والوں کی بہت تعریف کی اور کہا کہ وہ کھیل میں ہر حیثیت سے انگلستان والوں پر فوقیت رکھتے تھے۔ اسٹریلیا کی ٹیم کے کپتان مسٹر وڈفل نے مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کیا اور انگلستان کی مہمان نوازی کی بہت تعریف کی۔

ہابس اور سٹکلف انگلستان کے بہترین کرکٹ کے کھلاڑی وسط اکتوبر میں ہندوستان آرہے ہیں۔ دونوں مہاراجہ وزیانگرم کے مہمان ہونگے اور ان کی ٹیم کی طرف سے کھیلیں گے جو سیلون کا دورہ کرنے والی ہے۔ غالباً یہ ٹیم دہلی کے آل انڈیا کرکٹ ٹورنامنٹ میں بھی حصہ لیگی۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ اور سلطنت برطانیہ کے درمیان ہر سال پولو کے تین آزمائشی مقابلے ہوتے ہیں جس میں جیتنے والی ٹیم کو ایک بہت بڑا کپ انعام میں دیا جاتا ہے۔ اس سال انگلستان والوں نے اس کپ کو حاصل کرنے کے لئے بہت تیاریاں کی تھیں لیکن امریکہ والوں نے تینوں آزمائشی مقابلوں میں انہیں شکست دی۔

مکتبہ جامعہ ملیہ سے ہر قسم کی کتابیں مل سکتی ہیں

اردو کا طریقۂ تعلیم

از

شفیع الدین صاحب نیر

(گذشتہ سے پیوستہ)

مگر اختصاراً یہاں صرف اسی قدر عرض کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ تعلیم کا منشا اگر حواس خمسہ کی تربیت اور ذہنی، اخلاقی تنظیم ہے تو اس مقصد کو ایک بڑی حد تک زبان بھی پورا کرتی ہے۔

اس زبان کے طریق ہجّا اور عبارت سے ذہن اور قوت حافظہ کی بدرجہ غایت تربیت ہو سکتی ہے اور اس زبان کی تحریر پر توجہ مرکوز کرنے سے ایک طرف توجہ، اطمینان، صبر، استقلال، محنت اور سعی وغیرہ اوصاف حسنہ کی تربیت ہوتی ہے۔ بلکہ دوسری طرف آنکھ اور ہاتھ کی تربیت کا بھی یہ ایک مفید ذریعہ ہے اگر ڈرائنگ اور دستکاری قوت باصرہ اور قوت لامسہ کی تربیت کا ایک ذریعہ ہے۔ میں مانتا ہوں کہ دیگر زبانوں کی تحریر بھی ایک فن ہی خیال کیجاتی ہے اور لکھنا ایک مستقل شے سمجھا جاتا ہے مگر اردو میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ اس لئے کہ اس زبان میں طباعت کا انحصار اسی پر ہے برخلاف دیگر زبانوں کے کہ انکا ٹائپ بنجانے کی وجہ سے اس کی اہمیت کم ہوگئی ہے۔ اور ابھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اس خصوصیت کی کب تک حامل رہیگی۔

اُردو پڑھنا لکھنا

اہمیت ہرایک زبان کے حصول میں اگر غور کیا جائے تو سب سے ضروری چیز پڑھنا ہے۔ اس واسطے کہ اس سے پوری طرح واقف ہوجانے کے بعد بچے کو قوائے دماغی کی نشو ونما کا خود موقع ملجاتا ہے۔ اور وہ اُستاد کا دست نگر نہیں رہتا۔

دوسرے دیگر مضامین کے حصول میں بھی اس سے بہت مدد ملتی ہے۔ کیونکہ دیگر مضامین کی کتابوں تک رسائی اُس وقت تک نہیں ہوسکتی تا وقتیکہ بچہ کو پڑھنے میں مہارت نہ ہو۔

تیسرے مختلف کتابوں کا مطالعہ اُسکی قوت متخیلہ اور قوت متصورہ کی ترقی میں مدد کرتا اور انکی جلا کا باعث ہوتا ہے۔

چوتھے الفاظ پر نظر ڈالنے سے بصارت کی تربیت ہوتی ہے اور زور سے پڑھنے سے بصارت کے علاوہ سماعت کی تربیت میں بھی کافی مدد ملتی ہے۔

پانچویں الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، طرز عبارت کی خوبی اور عام نظم ونثر سے واقفیت اور فہم اور لطف اُٹھانیکا مادہ جس طرح پڑھنے سے پیدا کرسکتا ہے۔ اُتنا الفاظ ومحاورات وضرب الامثال وغیرہ کو رٹنے سے نہیں ہوسکتا۔

مختصر کہ خواہ آپ کسی نظر سے دیکھیں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ بیکن کا تو یہ مقولہ ہے "پڑھنا انسان کو مکمل بناتا ہے۔ مسٹر تھرنگ Thring فرماتے ہیں کہ

The value of good reading aloud has never been recognised. Good reading is The first Training of The beginner, The last crowning excellence and consummate perfection of The finished master of all perfected culture. Redding is The soul given of words and leasher of word

مقصد پڑھنے کے فوائد عرض کرنے کے بعد یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ابتدا میں مذکورہ بالا جملہ فوائد کا حاصل ہوجانا تو مشکل اور غیر یقینی ہے۔ البتہ اُس مقصد کے حصول کی ابتدائی سرحد پر پہنچانا اُستاد کا ایک ضروری فرض ہے

اس سے پہلے کہ پڑھنے میں جن امور کا خیال رکھنا چاہیئے یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ پڑھنا سکھانے میں سب سے زیادہ دشواری اردو کے ابتدائی قاعدے بچے کے ذہن نشیں کرنے میں ہے۔ اور اگر اس خار دار منزل سے اُستاد گزر گیا تو پھر چاروں طرف سبزہ زار ہی سبزہ زار نظر آتا ہے اس وقت اس منزل کے گزرنے کے لئے تین طریقے بیان کئے جاتے ہیں۔

اول طریق تہجی یعنی Alphabetical method

دوم طریق الصوت یعنی Phonetic method

سوم طریق بین وگو Look and say method

ان میں سے عام طور پر طریق تہجی کا رواج ہے۔

اس موقع پر کسی ایک قاعدے کو ترجیح دینے کے لئے ضروری ہے کہ اس زبان کے حروف کو زیر بحث لایا جائے۔ اس زبان میں بعض حروف تو ایسے ہیں جو Phonetic method کے اصول پر وضع ہیں مثلاً

ب، پ، ت، ٹ، ث، ج، چ، ح، خ ر ڑ ز ژ ف ہ ی اور بعض اس اصول کے برعکس مثلاً

الف۔ ح د ڈ ذ س ش ص ض ط ظ ع غ ق ک گ ل م ن و ر

اب اُستاد کا کام ان حروف کو بچے سے شناخت کرنا اور اُن کے استعمال سے واقف کرنا ہے۔

اور اس موقع پر الف پڑھا کر اَ کا تخیل اور جیم پڑھا کر ج کا تخیل اور قاف پڑھا کر ق کا تخیل قائم کرانا ذرا دشوار کام ہے۔ اس لئے تاوقتیکہ ہم ان حروف کی آوازوں ہی کو نہ بدل دیں اور ابتدا سے لیکر آخر تک ان کی تعلیم کے قاعدے ازسر نو ترتیب نہ دیں جو ذرا مشکل ہے اور جس کو کرنے کے لئے بہت زیادہ تعلیم، تجربے اور بچوں کی عام ذہنیت سے بدرجۂ اتم واقفیت کی ضرورت ہے اُس وقت تک اس پر عمل پیدا ہونا مشکل ہے۔

اس ضمن میں ایک وقت حرکات کا تخیل اور فرق بھی ہے۔ مثلاً زبر۔ زیر اور پیش کا اعادہ۔ چنانچہ جب تک اس کے لئے بھی کوئی طریقہ وضع نہ کر لیا جائے اُس وقت تک بھی اس پر عمل کرنا ذرا مشکل ہے۔

رہا Look and say کا طریقہ یہ اُردو زبان کی نسبت اُن زبانوں کی تعلیم میں زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے جس میں الفاظ الگ الگ حروف کے مجموعے ہوتے ہیں۔

مگر اردو میں ایک ایک syllables کے ایسے الفاظ کے مجموعے ملنے اس وجہ سے دشوار ہیں کہ فارسی عربی زبانوں کے مرکبات کی طرح اس کے مرکبات بھی مختصر نویسی کے اصول پر مشتمل ہیں۔ نیز حروف تہجی کی تعداد بھی انگریزی سے اُردو میں دُگنی ہے اس لئے کہ بھ پھ تھ ٹھ چھ کھ گھ وغیرہ کو بھی مرکب الفاظ کی نسبت مفرد الفاظ کی فہرست میں داخل کرنا مفید اور سہل ہے۔

اور اس زبان کی ماخذ چونکہ مختلف زبانیں ہیں اس واسطے اُن زبانوں کے بھی خاص حروف اس میں پڑھانے جانے ضروری ہیں۔ مثلاً خاص ہندی کے ٹ۔ ڑ۔ ڈ۔ خاص فارسی کے ژ۔ خاص عربی کے ث، ذ، ح۔ ص، ض، ط، ظ، غ، ق، وغیرہ۔

پس لامحالہ اب تیسرا طریقہ حروف تہجی کا رہ گیا۔ جو چاروناچار اختیاراً کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ صرف اسی وجہ سے نہیں کہ چونکہ ہمیشہ ہم ایسا کرتے آئے ہیں اس واسطے اس کو چھوڑتے نہیں بنتی بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ اُردو کی مخصوص تشکیل کو ملحوظ رکھ کر مفید نتائج کے حصول کے لئے اسکا استعمال ناگزیر ہے۔

لیکن کسی اور صورت کی عدم موجودگی میں اگر سر دست ہم اسی کو اپنا رفیق کار بنائیں اور آئندہ تجربے اور غور و خوض کی روشنی میں اس کو تعلیم کے عام اصول پر منطبق کرانے کی کوشش کریں۔ تو شاید بہتر ہو۔

(باقی آیندہ)

ٹروٹسکی

از

غلام سرور صاحب مقیم مصر

اخبارات میں آئے دن ٹروٹسکی کا نام دیکھنے میں آتا ہے، کچھ عرصہ ہوا حکومت روس نے اس کو جلاوطن کر دیا تھا، اس کے بعد یہ یورپ کے مختلف ممالک میں سر چھپانے کی کوشش کرتا رہا۔ مزید دلچسپی کے لئے ہم اس کے حالات زندگی پیام تعلیم کے پڑھنے والوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

۷ نومبر ۱۸۷۹ء میں ٹروٹسکی روس کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ معمولی حیثیت کا کاشتکار تھا، پورے ۳۸ سال کے بعد یہ اور لینن پیٹرو گریڈ میں بالشویک حکومت کی بنا رکھتے ہیں ٹروٹسکی کو دیہاتی ہونے کی وجہ سے کاشتکاروں سے ملنے اُن کے عادات و مراسم اُن کے عواطف و میلان کے مطالعہ کا کافی سے زیادہ موقع ملا۔ اس بنا پر سٹالین اور اس میں کاشتکاروں کے مسئلہ پر اختلاف رونما ہوا۔ ٹروٹسکی کاشتکاروں میں بالشویک اصول پھیلانے کا حامی ہے۔ اور دوسرے زعماء اس کے شدید مخالف، یہی مخالفت اس کی جلاوطنی کا سبب ہوئی۔

ٹروٹسکی نے اپنی زندگی کے حالات خود اپنے قلم سے لکھے ہیں، ان کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک انقلابی لیڈر کو کن کن مصائب و خطروں سے سامنا پڑتا ہے اور قوم کو کس طرح آہستہ آہستہ ظالموں کے خلاف اُبھارا جاتا ہے اور پھر کس طرح خاص موقع پر قوم کے برانگیختہ جذبات کو ظالموں کو ختم کرنے میں استعمال کیا جاتا ہے

۹ برس کی عمر میں ٹروٹسکی حکومت کے مدرسہ میں داخل ہوا لیکن تھوڑی مدت ہی میں ایک مظاہرہ میں شرکت کی بنا پر مدرسہ سے نکال دیا گیا، یہ مظاہرہ طلبہ نے ایک مدرس کو نکالنے کے لئے کیا تھا، اس کے بعد وہ ایک صنعتی مدرسے میں شامل ہوگیا۔ اس صنعتی ماحول میں اس کو انقلابی تحریک اور انقلابی کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اور وہ مزدوروں کی ایک خفیہ انجمن کا ممبر بن گیا۔

ایک عرصہ تک اس مجلس کا پولیس کو سراغ نہ ملا۔ آخر کار حکومت کو اس کا پتہ چل گیا، تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ٹروٹسکی کی عمر اس وقت ۱۸ سال کی تھی، تقریباً دو سال تک وہ قید خانہ میں بند پڑا رہا ان دو سالوں میں اُسے سخت سے سخت مصائب سے گزرنا پڑا۔ کھانے کی تکلیف کے علاوہ اس کو تین ماہ تک ایک لباس میں رکھا گیا جس کی وجہ سے جوتوں نے اُس کے بدن کو چھلنی بنا دیا: سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ یہ قید قید تنہائی تھی۔ لکھنے پڑھنے کی بالکل اجازت نہ تھی۔ ٹروٹسکی کا بیان ہے کہ میں اپنے وقت کا بیشتر حصہ کمرہ میں ہنسنے میں صرف کرتا تھا

اس کے بعد چار سال کے لئے سائبیریا میں جلاوطن کر دیا گیا، اس دوران میں اُس نے اشتراکیت کا گہرے طور پر مطالعہ کیا، اور اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب لکھی، چار سال سے قبل ہی وہ سائبیریا سے فرار ہو کر لندن پہنچ گیا۔ یہاں پر لینن سے ملا، اور دونوں میں عمر بھر دوستی رہی۔ اس زمانہ میں لندن سے لینن ایک بالشویکی اخبار نکال رہا تھا۔ ٹروٹسکی اُس میں کام کرنے لگا۔ ۱۹۰۳ء میں لندن میں روسی بالشویکوں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں آپس میں اختلاف رونما ہوا، اور یہ دو جماعتیں بن گئیں۔ لینن ایک جماعت سے تعلق رکھتا تھا اور ٹراٹسکی دوسری سے، اس اختلاف نے دونوں کی دوستی پر کوئی اثر نہ ڈالا

۱۹۰۵ء میں پیٹرس برگ میں جمہور نے پارلیمنٹ کا مطالبہ کیا جس کا جواب حکومت نے بندوقوں اور توپوں سے دیا۔ بالشویک جلاوطن لیڈروں نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور وہ خفیہ طور پر روس پہنچ گئے، ٹروٹسکی ایک عرصہ تک پیٹرس برگ میں خفیہ طور پر کام کرتا رہا، راز کھل جانے پر فنلینڈ بھاگ گیا۔ اور نئے حالات کا انتظار کرنے لگا زار روس نے عوام کی بڑھتی

ہوئی قوت کو دیکھ پارلیمنٹ کا وعدہ اور انقلابی زعماء دوسرے ممالک سے واپس آنے شروع ہوگئے، لیکن زار مناسب موقعہ دیکھ کر اپنے وعدوں سے پھر گیا اور پھر وہی قتل و غارت، اسیری و دشمنی کا دور شروع ہوگیا۔ ان نئے گرفتاران بلا میں ٹروٹسکی بھی تھا، حکومت نے اس کو سائبریا کے شمالی حصہ میں جلا وطن کر دیا لیکن وہاں سے یہ پھر بھاگ نکلا اور ویانا میں اقامت اختیار کی۔ اور ایک طویل مدت تک اخبارات میں کام کر کے زندگی بسر کرتا رہا یہاں تک کہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کے شرارے بھڑک اٹھے۔ اس وقت ٹروٹسکی نے محسوس کیا کہ دنیا بھر کے مزدوروں کا اتحاد و تعاون سب بیکار ہیں۔ اور اس جنگ میں دوسری جماعتوں کے ساتھ ساتھ مزدور بھی اپنے بھائیوں کا گلا کاٹنے میں دوسروں سے پیچھے نہیں۔

ویانا سے ٹراٹسکی پیرس پہنچا لیکن فرانس اور زار کے معاہدے نے اس کا وہاں ٹھیرنا ناممکن کر دیا۔ روس کے مطالبہ پر حکومت نے اسپین میں جلاوطن کر دیا۔ اسپین اس قسم کے انقلابی لوگوں کو اپنے ملک میں کب دیکھ سکتا تھا۔ بالآخر وہاں سے بھی نکلنا پڑا۔ اور امریکہ میں پہنچا۔ اور نیویارک میں بیٹھ کر آنے والے حوادث کا انتظار کرنے لگا۔

جنگ عظیم نے زار کی فوجی قوت کا خاتمہ کر دیا جس کی وجہ سے قوم کو حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونیکا موقع مل گیا۔ اور کرنسکی کی حکومت قائم ہوگئی، ٹراٹسکی نے اپنے وطن کی راہ لی لیکن برطانیہ نے راستہ میں اس کو گرفتار کر لیا۔ بالآخر روس کی حکومت کے احتجاج پر اسکو چھوڑ دیا گیا۔ ٹروٹسکی روس میں اور لینن سے مل کر موجودہ حکومت کو فوج اور مزدوروں کی مدد سے بدلنے کی سعی کرنے لگا، کرنسکی کو اس کا علم ہوگیا۔ ٹروٹسکی تو گرفتار کر لیا گیا اور اور لینن فن لینڈ بھاگ گیا۔

کرانسکی کامیابی سے حالات پر قابو پا چکا تھا کہ قیصر کے حامیوں نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ بالآخر اسے نئے خطرے کے مقابلہ میں اسے تمام انقلابی کو متحد کرنا پڑا۔ اور اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر ٹراٹسکی اور اس کے ہمنوا ساتھیوں نے مزدوروں کو اور فوج کی مدد سے حکومت پر قبضہ کر لیا اور کرانسکی کو راہ فرار اختیار کرنی پڑی۔

ٹراٹسکی کی جلاوطنی کا یہ تیسرا موقعہ ہے اسٹالین موجودہ بالشویکی لیڈر اور اس میں کاشتکاروں کے متعلق سخت اختلاف ہے۔ اس اختلاف کی بنا پر حکومت

روس کو ٹراٹسکی کو جلاوطن کرنا پڑا۔

فرانسیسی کسابی نیکا

گذشتہ سے پیوستہ

(راغب احسن صاحب۔ بی۔ اے۔ کلکتہ)

اورینٹ کا کمانڈر، اتفاقاً دشمن کی گولہ باری کی زد میں آکر مقتول ہوگیا، جہاز کو آگ لگ گئی۔ فرنچ سپاہی جہاز سے فرار ہوگئے۔ سب ایک ایک کر کے چلے گئے۔ لیکن کسابی نیکا اپنے مقام فرض سے نہیں ہٹا یہاں تک کہ شعلوں نے سارے جہاز کو گھیر لیا لیکن وہ آگ کے درمیان نہایت بہادری اور استقلال کے ساتھ ہاتھ میں چھوٹی تلوار لئے کھڑا تھا کیونکہ اس کے "باپ" نے اور اس کے "افسر" نے اس کو وہاں کھڑا رہنے کا حکم دیا تھا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ اس کا باپ اور افسر مقتول ہوگیا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو دوسروں کے ساتھ بھاگ کر اپنی جان کو بچا سکتا تھا۔ لیکن وہ ایسی صورت میں نافرمان بیٹا اور ڈرپوک سپاہی کہلاتا۔ کسابی نیکا دراصل ایک فرمانبردار بیٹا اور سچا سپاہی تھا باپ کی نافرمانی اور افسر کی عدول حکمی کی بے عزتی وہ برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں تھا کیونکہ وہ اپنی عزت کو اپنی زندگی سے بھی زیادہ پیاری چیز جانتا تھا اس نے موت اور زندگی میں سے اول کو پسند کیا اور دوم کو رد کر دیا کیونکہ اس میں بے عزتی تھی۔

کسابی نیکا اپنے باپ کی موت سے بیخبر ڈک پر کھڑا تھا اور برابر باپ کو صدا دے رہا تھا "ابا! کیا اب بھی ہمارا کام ختم نہیں ہوا ہے؟ آگ چاروں طرف پھیل گئی ہے، جہاز اس میں گھر گیا ہے کیا اب بھی میں یہاں کھڑا رہوں؟ ابا آپ کے سارے سپاہی آپ کے جہاز سے بھاگ گئے، کوئی آپ کا حکم ماننے کے لئے نہیں رہا کیا آپ مجھ کو بھی جانے کی اجازت دے رہے ہیں؟ یہ دیکھئے آگ کی بڑھتی ہوئی لپیٹ میں آپکا کسابی نیکا جھلسا جاتا ہے اور دھوئیں کے مرغولے اس کا دم گھونٹ رہے ہیں۔ ہائے افسوس آپ کی پیاری اورینٹ جل جل کر برباد ہو رہی ہے، آپ کیوں مجھے جواب نہیں دیتے کیا آپ چاہتے ہیں میں اسی جگہ کھڑا کھڑا آگ میں جل جاؤں۔ یہ میری آخری پکار ہے؟ جواب ایک ہولناک گولے کے دھماکے سے ملا جس کے ساتھ ہی اورینٹ ریزہ ریزہ ہوگیا اور کسابی نیکا اس میں فنا...... یا ہمیشہ کیلئے بہادروں کی تاریخ میں زندہ ہوگیا۔

ارشمیدس حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے ۳۰۰ سال قبل صقلیہ میں پیدا ہوا۔ اسکی جوانی میں یونانیوں اور رومن اور کارتھیج والوں میں جنگ ہو رہی تھی ان میں سے ہر ایک صقلیہ پر قبضہ کرنیکی کوشش کر رہا تھا۔ صقلیہ کا بادشاہ اہل روم سے مل گیا۔ اور چونکہ روم کا بادشاہ بہت طاقتور تھا اس لئے صقلیہ کا بادشاہ امن سے حکومت کرنے کے قابل ہو گیا۔ اس جزیرہ کی تجارت میں ترقی ہوئی اور نئے جہاز بننے شروع ہوئے۔

ارشمیدس جہاز سازی کے کارخانوں میں جایا کرتا تھا۔ اور جہازوں کو بنتے ہوئے دیکھتا اور اپنی عقل سے انہیں مدد دیتا۔ وہ انکو بڑے بڑے وزن اٹھاتے ہوئے دیکھتا اور انکو یہ بتاتا کہ زیادہ محنت کے بغیر اتنے بڑے بڑے وزن کس طرح اٹھائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ پہلے ہی سے لیور (ڈنڈی) کا استعمال جانتے تھے۔ وہ ڈنڈی کا ایک سرا پتھر میں گھسا دیتے اور دوسرا سرا کسی پتھر پر رکھ کر اٹھاتے۔ اس طرح انکو بڑی محنت سے کام لینا پڑتا۔ ارشمیدس نے اس چیز کا وزن کیا جسکو وہ اس طرح اٹھاتے تھے اس نے معلوم کیا کہ اگر ڈنڈا لمبا ہو اور دونوں پتھروں کے فاصلہ بڑھا دیا جائے تو وزن بڑھ جاتا ہے۔ اور ہاتھ اور اس پتھر کا فاصلہ جس پتھر پر ڈنڈی رکھکر وزن اٹھایا جاتا ہے پانچ گنا اس فاصلہ کا جو وزن اور پتھر کے درمیان ہو۔ ارشمیدس نے معلوم کیا کہ ہاتھ کی قوت پانچ گنا اس فاصلہ کا ہے جو وزن اور پتھر کے درمیان ہو۔ ارشمیدس نے معلوم کیا کہ ہاتھ کی قوت پانچ گنا ہے اور اس طرح ایک آدمی اس وزن کو اٹھا سکتا ہے جسکو اٹھانے کے لئے بغیر ڈنڈی کے پانچ آدمی درکار ہوں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر ڈنڈی کو بڑھا لیا جائے تو وزن ہلکا ہو جائے گا۔

ارشمیدس نے ایک قسم کا پیچ ایجاد کیا جو پھرانے سے ختم نہیں ہوتا تھا۔ اس کو انگریزی میں Endless Screw. کہتے ہیں۔ اس چیز سے ارشمیدس جہازوں کو پانی سے ریت پر لے آتا تھا صقلیہ کا بادشاہ ارشمیدس کا دوست تو تھا لیکن وہ ایک اور واقعہ سے اس کا اور زیادہ دوست بن گیا۔ وہ واقعہ یہ ہے

بادشاہ نے ایک سنار کو بہت سا سونا تاج بنانے کے لئے دیا جسکو وہ کسی عبادت گاہ میں دینا چاہتا تھا۔ کچھ دنوں میں سنار نے تاج تیار کرکے بادشاہ کو دیا۔ بادشاہ نے اسکو تولا اور اس کا اتنا ہی وزن تھا جتنا کہ سونا اس نے اسے دیا تھا۔ لیکن ایک درباری نے اس کے کان میں کہہ دیا کہ سنار نے کوئی دوسری دھات ملا کر اتنا سونا چھپا لیا ہے

بادشاہ منصف مزاج آدمی تھا۔ وہ بغیر کسی ثبوت کے سنار کو مجرم بنانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے ارشمیدس کو بلایا اور تاج اسے دیا۔ اور تمام واقعہ بتایا۔

ارشمیدس کی اس واقعہ کو سن کر عجیب حالت ہوئی اس نے تاج کو تولا تو وزن ٹھیک تھا۔ اور وہ خالص سونے کا معلوم ہوتا تھا۔ ارشمیدس نے ایک خالص سونے اور ایک خالص چاندی کی مستطیل شکل کی ٹھوس چیز بنائی۔ اور ان دونوں کا ایک ہی حجم تھا۔ اور تولنے سے اسے معلوم ہوا کہ سونے کی مستطیل شکل کا وزن چاندی کے مستطیل سے تقریباً دوگنا ہے۔ اس نے چاہا کہ وہ تاج کو پگھلا کر اس کو مستطیل شکل کا بنا دے لیکن تاج ایسا عمدہ اور خوبصورت تھا کہ وہ ایسا نہ کر سکا۔

ارشمیدس کی یہ عادت تھی کہ جب تک وہ کسی ایک مسئلہ کو حل نہ

کرلیتا اُسے نہ چھوڑتا کبھی وہ زمین پر شکلیں بناتا ہوا ملتا اور کبھی وہ پانی کے ٹب میں نہاتا اور اس کا نوکر اس کے بدن پر تیل ملتا تو وہ تیل جو پانی پر گرتا اس کی مختلف اشکال بناتا۔ وہ ہر وقت اسی مسئلے کو حل کرنے میں مشغول رہتا۔

اس مسئلہ نے اس کو بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ لیکن ایک دن جبکہ وہ غسل کر رہا تھا، اس نے یہ مسئلہ حل کرلیا۔ وہ ایک ٹب میں جس میں وہ آسانی سے سما سکتا تھا۔ نہایا کرتا تھا۔ اسی قسم کے ٹب یونانی اکثر استعمال کرتے تھے اس نے پہلے پانی سے ٹب کو بھرلیا۔ اور پھر خود اندر داخل ہوا۔ اور اپنے تمام جسم کو بالکل پانی کے اندر لے گیا۔ جب وہ باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ ٹب میں پانی اس کے اس میں داخل ہونے سے پہلے کناروں تک بھرا ہوا تھا۔ لیکن اب جس وقت وہ نکلا ہے پانی اتنا نہیں ہے

پانی کی وہ مقدار جو ٹب سے باہر نکل گئی۔ وہ اس کے اپنے جسم کے برابر تھی۔

یہ حقیقت ارشمیدس پر ظاہر ہوگئی۔ اس نے اپنے آپ کو مستطیل شکل بنانے کے بغیر اپنے جسم کی موٹائی معلوم کرلی۔

وہ اس قدر خوش تھا کہ ننگے ہی بادشاہ کے محل کی طرف "میں نے پالیا" "میں نے پالیا" چلاتا ہوا بھاگا۔

اس نے ایک برتن لیا اور اسے لبالب پانی سے پُر کرلیا، اس کے بعد اس نے آہستہ سے تاج اس میں چھوڑ دیا ہے۔ اور ایک تاگا باندھ کر اسے پکڑے رکھا۔ پانی کی ایک مقدار بہ گئی۔ جب تاج نکالا گیا۔ پانی نیچے تھا۔ اس نے پیمانہ (گلاس) لیا اور اس میں جتنا پانی باقی رہ گیا تھا اسکو ناپا۔ اس کے بعد برتن کو پانی سے لبالب بھر کر ناپا۔ پانی کی وہ مقدار جو بہ گئی تھی اس کے برابر تاج کی موٹائی تھی۔

اب اس نے تاج کے وزن کے برابر چاندی اور سونا علیحدہ علیحدہ لیا۔ اس نے انکو مستطیل شکلوں کا بنایا۔ اس طرح اس کے پاس تین چیزیں ایک ہی وزن کی تھیں یعنی تاج، چاندی کا مستطیل اور سونے کا سب سے پہلے اس نے ایک برتن کو بھر کر اس میں سونے کا مستطیل رکھا اس سے پانی کی ایک مقدار بہ گئی پھر اس نے تاج کو پانی میں ڈبویا۔

اس نے تقریباً دوگنا پانی نکال دیا۔ آخر کار اس نے تاج کو پانی میں ڈبویا اس نے سونے کی مستطیل سے زیادہ پانی نکال دیا۔ لیکن چاندی کی مستطیل سے کم اس طرح اسے معلوم ہوگیا کہ ا۔

"تاج میں پانی کی ایک مقدار تھی"

اب اس نے سونے اور چاندی میں دوسری دھاتیں ملاکر بہت سے تجربے کئے اور اسے معلوم ہوگیا کہ سنار نے سونا چرایا ہے

اب وہ بادشاہ کے پاس گیا اور اسے بتایا۔ بادشاہ نے سنار کو بلاکر اسے دھمکایا تو اس نے سونا چرانے کا اقبال کرلیا۔ اور بادشاہ نے اس سے سونا لے کر اسے سزا دی۔

ارشمیدس مختلف اجسام کے تجربہ کرتا رہا۔ اس نے اجسام کو ہوا اور پانی میں تولا۔ وہ پانی میں اجسام کو اس طرح تولا کرتا تھا کہ کسی جسم کو دھاگے سے باندھ کر ملڑے کے ساتھ باندھ دیتا اور اس جسم کو پانی میں چھوڑ دیتا اور اس جسم کا وزن کرلیتا۔ اس نے اس طرح معلوم کیا کہ کہ ہوا کی نسبت پانی میں جسم کا وزن کم ہوتا ہے۔ وزن کا فرق جو ہوا اور پانی میں علیحدہ علیحدہ تولنے سے ہوتا ہے۔ اس پانی کے وزن کے برابر ہوتا ہے جتنا کہ پانی باہر نکل جاتا ہے۔ یہ اس طرح ثابت ہوسکتا ہے کہ اس شکل کے موافق ایک گلاس لیا جائے جس میں ایک نلی دار سوراخ ہو۔ گلاس کو پانی سے بھر دیا جائے اور اس کی سطح نلی تک ہو۔ نلی کے منہ کے بالکل نیچے ایک دوسرا گلاس رکھ دیا جائے لکڑی کا ایک ٹکڑا اسے کہ پانی میں ڈالا جائے تو کچھ پانی نلی میں سے ہوکر گلاس میں گر جائیگا۔ اور اگر گلاس نمبر ا کو لکڑی کے ٹکڑے سمیت تولا جائے تو اس کا وزن اتنا ہی ہوگا۔ جتنا کہ لکڑی ڈالنے سے پہلے تھا۔ تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ

"ہر ایک جسم کا وزن اتنا ہی کم ہوتا ہے جتنا کہ وہ جسم پانی کو ہٹا دیتا ہے۔"

اس قانون کو Principle of Archimedes "نظریہ ارشمیدس" کہتے ہیں۔

پچاس سال امن سے گزر گئے۔ اہل روم نے اہل صقلیہ پر فوجکشی کی۔ ارشمیدس نے حفاظت کا ذمہ لیا۔ (بقیہ بر صفحہ ۱۲)

عزیز کی آٹھ برس کی عمر تھی۔ اُس کو قصے سننے کا بہت شوق تھا جب کبھی وہ جلدی سبق یاد کر لیتا تو باقی وقت کہانیاں سننے میں گذارتا۔ وہ اکثر اپنی ماں سے جن کو وہ امّی کہتا تھا قصہ کہلواتا۔ برسات کا موسم تھا بارش زور کی ہو رہی تھی لیمپ کے آس پاس پتنگوں کی فوج جمع ہو گئی تھی عزیز کا پڑھنا دوبھر ہو گیا پتنگوں سے تنگ آکر کتاب تو رکھ دی اور اپنی امّی کے سر ہوا کہ مجھے کہانی سناؤ۔ گر ہو بہت اچھی میرا دل خوش ہو جائے۔ عزیز کی امّی نے کہا اچھا لو سنو:۔

تمہارے پیدا ہونے سے پہلے اسی رحیم نگر میں کوئی بڑا اسکول نہ تھا۔ دو چھوٹے سے مکتب تھے جن میں لڑکے پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن بارش زور کی ہوئی مکتب کا چھپر ٹپکنے لگا اور لڑکوں کو جلدی چھٹی مل گئی سب کے سب خوش خوش گھروں کو چلے راستہ میں بارش اور بھی تیز ہو گئی۔

احمد ۔ بس ایسی ہی موسلا دھار بارش ہوئی ہو گی جیسی آج ہوئی تھی۔ امی گھر کے آنگن میں اتنا پانی تھا کہ تالاب معلوم ہوتا تھا۔

امی ۔ ہاں، ایسی ہی بارش ہوئی تھی۔

احمد ۔ امّی لڑکے تو سب بھیگ گئے ہونگے۔

امی ۔ بھیگ کیوں نہ جاتے۔ بارش اس زور کی تھی کہ گھر جانا مشکل ہو گیا۔ احمد۔ حامد۔ حلیم۔ نذیر۔ منظور۔ غرض سب بھیگتے بھاگتے چلے جاتے تھے کہ زور کی آواز آئی معلوم ہوا کسی کا پاؤں پھسل گیا اور وہ بیچ سڑک میں دھڑام سے گر پڑا۔ دیکھا تو ایک بڑھیا سڑک پر پڑی چلا رہی تھی حامد وغیرہ تو ہنستے رہے لیکن احمد خاموشی سے آگے بڑھا اور بڑھیا کو اُٹھانا چاہتا تھا کہ پاؤں پھسلا اور خود گر پڑا۔

۔ اہو ہو ہو۔ اہا ہا ہا۔ امی پھسل پڑا آہا ہا ہا خوب پھسلا اُہو

۔ عزیز جس طرح تم ٹھٹے مار رہے ہو احمد کے تمام ساتھی بھی ہنسنے اور کہنے لگے "ہم نے تمہیں پہلے ہی منع کیا تھا تم نہ مانے دیکھو گر پڑے نا۔ کپڑے الگ خراب ہوئے۔ کتابیں الگ خراب ہوئیں اور ملا کیا" لیکن وہ اُٹھا۔ آگے بڑھا۔ بڑھیا کو اُٹھایا اور پوچھا "اماں آپ کہاں جائیں گی۔ آپ کا مکان کہاں ہے؟" بڑی بی نے پتہ بتایا اور احمد انہیں گھر پر چھوڑ آیا۔ گھر پہنچا تو تمام نوکر چاکر دوڑے دیکھا کہ میاں کے کپڑے کیچڑ میں لتھڑے ہوئے ہیں۔ کسی نے دھلے ہوئے کپڑے نکالے کسی نے جھٹ غسل خانہ میں پانی رکھا احمد جلدی غسل خانہ میں جا نہایا کپڑے بدلے باہر آیا گھر والوں نے بات پوچھی تو قصہ سنایا کہنے لگا "اماں دیکھو تو پڑھنے لکھنے سے تو آدمی آدمی بن جاتا ہے لیکن یہ لڑکے کیا پڑھتے ہیں کہ غریب لاچار آدمی کی مدد نہیں کرتے اور دوسرا مدد کرتا ہے تو اُس پر ہنستے ہیں۔

احمد امّی تو کیا دوسروں کی مدد کرنے میں اپنے آپ تکلیف اُٹھائیں۔

امی پڑھے لکھے لوگ ہر حالت میں دوسروں کی مدد کرتے ہیں اپنے آرام کا بھی خیال نہیں کرتے۔

امّی یہ تو بڑی کٹھن بات ہے

یہ کیسی اچھی بات ہے دیکھو احمد کو کیسی خوشی ہوئی۔ بڑی بی نے اُسکو لاکھوں دعائیں دیں اور گھر گھر اُس کی تعریف ہونے لگی۔ اُس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ تعلیم اسی لئے حاصل کی جاتی ہے کہ اچھی باتیں معلوم ہوں اور ان پر عمل کر کے ہم خود بھی خوش ہوں اور دوسروں کو بھی خوش کریں۔ وہ رحیم نگر کے مکتب کی پڑھائی ختم کر کے رحمان پور چلا گیا جہاں ایک بہت بڑا اسکول تھا وہاں داخل ہو گیا اور پڑھنے لگا وہ جب کبھی اپنے ہم جماعتوں سے باتیں کرتا تو اُن سے یہی کہتا کہ ہم کو ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیئے۔ جہاں میٹھی بات سے کسی کا کام چلے میٹھی بات

جہاں وقت صرف کرکے دوسرے کا کام کرسکیں وہاں وقت اور جب روپیے کی ضرورت ہو تو روپیہ سے بھی کمی نہیں کرنی چاہیئے۔ بہت سے لڑکے اس کی باتوں کو پسند کرتے اور کبھی کبھی اس کے کاموں میں مدد بھی دیتے۔

احمد کو اسی کی دھن لگی ہوئی تھی جب کبھی اسکول میں جلسہ یا مباحثہ ہوتا تو وہ یہی تقریر کرتا کہ ہمارا وقت، ہماری دولت، ہمارا علم سب دوسروں کی خدمت کے لئے ہیں۔ اپنے لئے تو سب کرتے ہیں بات تو اس میں ہے کہ دوسروں کے لئے کریں۔ اُس کی ان باتوں سے تمام اُستاد اُس سے خوش تھے۔ جب کوئی لڑکا کلاس میں کم زور ہوتا تو اُس کو احمد کے پاس بھیجدیتے۔ شام کو اسکی میز کے گرد بہت سے لڑکے ہوتے جنکو وہ باری باری پڑھاتا تھا۔ ان میں سے جو لڑکے غریب ہوتے اُنکو اپنے پاس سے کتابیں خرید دیتا اور کسی کو اس بات کی خبر تک نہ کرتا جب وہ تعلیم سے فارغ ہوکر گھر جانے لگا تو اسکول میں بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں ہیڈ ماسٹر صاحب نے اُس کو سونے کا تمغہ دیا۔

عزیز۔ امی احمد تو بڑا اچھا لڑکا تھا اُس نے بڑے اچھے کام کئے

احمد اچھے بچے ایسے ہی کام کرتے ہیں۔ ہر لڑکے کو یہی کرنا بھی چاہیئے تو پھر کیا ہوا۔ اُس نے کیا کیا۔

احمد بہت مالدار تھا۔ آدھا رحیم نگر اُسی کا تھا اس لئے اُس کو ملازمت کا تو خیال ہی نہ تھا۔ لیکن وہ اکثر اپنے وطن سے باہر رہتا۔ لوگوں سے ملتا اور یہی کہتا ہمیں ہر طرح ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیئے۔ ہر شخص اُس کی ان باتوں سے خوش ہوتا اور اس کی مدد کرتا۔ ایکمرتبہ وہ پورے دو سال تک رحیم نگر سے باہر رہا جب آیا تو ایک نہیں سات آٹھ ساتھ تھے اور سب کے سب بی اے پاس تھے۔ اس سے پہلے رحیم نگر میں استنے پڑھے لکھے آدمی کبھی نہیں آئے تھے تمام میں دھوم مچ گئی۔ ہر شخص اُن سے ملنے آتا۔ تھوڑے دن بعد ملاقات کا یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔

احمد نے تمام آدمیوں کو جمع کیا اور ایک بڑا جلسہ کرکے سب کے سامنے یہ تقریر کی "حضرات۔ آپ سب لوگوں کو معلوم ہے کہ رحیم نگر میں کوئی بڑا اسکول نہیں ہے۔ یہاں کے غریب لڑکے باہر جاکر تعلیم نہیں پاسکتے یہاں ایک بڑے اسکول کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ میں نے یہ دیکھا ہے اور آپ بھی جانتے ہیں کہ اسکولوں میں صرف کتابیں پڑھادی جاتی ہیں اخلاق کا کچھ خیال نہیں ہوتا۔ امتحان کا نتیجہ دیکھا جاتا ہے اور بس۔ ایسے اسکول کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے جہاں کتابوں پر زیادہ زور نہ دیا جائے لیکن سادہ اور نیک زندگی کو ہی امتحان بنایا جائے جس لڑکے کی زندگی سب سے زیادہ سادہ اور جو سب سے زیادہ نیک ہو وہی اول آئے اور انعام پائے"۔

"حضرات۔ اس اسکول میں اسی قسم کی تعلیم دیجائیگی اور یہی باتیں بتائی جائیں گی۔ ساز و سامان کا زیادہ اہتمام نہ ہوگا۔ یہ جو سات آٹھ آدمی میرے ساتھ ہیں۔ یہ اُس اسکول میں تعلیم دیں گے۔ میں نے تمام میں پھر پھرا کر دیکھ بھال کرکے ان لوگوں کو منتخب کیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ تمام عمر رحیم نگر میں رہیں گے۔ اسی اسکول میں پڑھائیں گے اور یہی پڑھائیں گے کہ اپنے بھائیوں کی مدد کرو۔ اُمید ہے کہ سب لوگ اپنے بچوں کو اس اسکول میں تعلیم کے لئے بھیجیں گے اور چھوٹے بچے ایک دوسرے کی مدد کرکے اس کا نام روشن کریں گے۔

سب لوگوں نے احمد کی تعریف کی اور وعدہ کیا کہ وہ اپنے بچوں کو وہیں بھیجیں گے۔ جلسہ ختم ہوا اور سب کے سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

عزیز۔ امی۔ یہ تو بڑا جلسہ ہوگا۔ رحیم نگر میں بہت رونق ہوگی۔

اس میں کیا شک ہے۔ بڑے بڑے لیڈر آئے تھے۔ بیس پچیس ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ ایک احمد کا نام پھر ایسا اچھا کام اس میں کون شریک نہ ہوتا۔ جب اسکول قائم ہوا تو اس میں لڑکوں کو بھی تعلیم دی جاتی تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو دوسروں کی مدد کرو۔ دیہات کے لوگ تم جانتے ہو اکثر ذرا ذرا سی بات پر جھگڑنے لگتے ہیں اور جہاں ذرا سا جھگڑا شروع ہوا تو پھر وہ بہت بڑھ جاتا ہے بڑھتے بڑھتے نوبت مقدمہ بن کر عدالت میں پہنچ جاتا ہے وہاں آپس کی ضد میں سیکڑوں روپیہ برباد ہوجاتا ہے یہی حالت رحیم نگر کی تھی۔ جب لڑکے یہاں سے اچھی اچھی باتیں سیکھ کر جانے لگے تو وہ دوسروں کو بھی سمجھانے لگے جہاں جھگڑا ہوتا وہ فوراً پہنچ جاتے اور آپس میں صلح کرا دیتے۔ اس طرح رحیم نگر سے دشمنی دور ہوگئی۔ سب اتفاق سے رہنے لگے۔ اس اسکول کا

سفید فاختہ

از

غلام حسین صاحب۔ دہرہ دون

کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا۔ اسکی صرف ایک لڑکی تھی اس کو اس بات کا بہت ڈر تھا کہ کوئی اس لڑکی کو اُٹھا نہ لیجائے۔ اس لئے اس نے اس کو ایک بڑے شیشے کی الماری میں بند کر دیا تھا۔ ایک روز اتفاق سے شیشہ ٹوٹ گیا۔ اس میں سے وہ نکل کر برآمدے میں کھیلنے لگی۔ اتنے میں اس نے ایک سفید فاختہ دیکھی۔ یہ اس کو بہت بھلی معلوم ہوئی اور اس کو پکڑنے کے لئے اس کے پیچھے دوڑی فاختہ آہستہ آہستہ اُڑتی ہوئی باغ میں پہنچی شہزادی بھی اس کے پیچھے پیچھے گئی آخرکار گھر سے بہت دور نکل گئی اور راستہ بھول گئی۔ اس کو پتہ نہیں نہیں تھا کہ وہ کدھر جا رہی ہے۔ فاختہ نہ معلوم کہاں غائب ہو گئی اتنے میں اسکو ایک جھونپڑی دکھائی دی۔ یہ جھونپڑی ایک دیو کی ملکیت تھی وہ اس وقت اندر بیٹھا ہوا تھا۔ کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اس نے بہت باریک آواز میں کہا "اندر آجاؤ! دروازہ کھلا اور ایک نہایت خوبصورت لڑکی گھر میں داخل ہوئی۔ یہ وہی شاہزادی تھی۔ دیو ایکدم اُٹھا اور جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور شہزادی سے کہا۔ اب تم میرے قبضہ میں ہو اور تم کو کل سے میرا غلام رہنا پڑیگا۔ کل تم کو گھر صاف کرنا اور جھاڑو دینا ہوگا۔ یہ کہہ کر دیو چلا گیا۔ شہزادی اُٹھ کر کام کرنے لگی اس نے گھر کا تمام سامان درست کیا مگر جھاڑو دینے میں بہت دقت پیش آئی۔ وہ بار بار صحن صاف کرتی لیکن وہ پہلے ہی کی طرح رہتا۔ یہ بڑی پریشان ہو کر کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔ اتنے میں اسکو سفید فاختہ نظر آئی فاختہ اس کو رنجیدہ دیکھ کر کہنے لگی میں جھاڑو دینے کی ترکیب بتاؤنگی مگر شرط یہ ہے کہ اگر دیو تم کو مار بھی ڈالے تم میرا نام نہ بتاؤگی۔ لڑکی نے وعدہ کیا۔ فاختہ نے کہا الٹے جھاڑو سے جھاڑو دو۔ یہ کہہ کر فاختہ اُڑ گئی شہزادی اُٹھی اور الٹے جھاڑو سے جھاڑو دینے لگی تو گھر بالکل صاف ہو گیا اور وہ کام سے فارغ ہو آرام کرنے لگی۔ اتنے میں ایک دھماکا ہوا اور دروازہ کھلا دیو گولے کی طرح گھر میں داخل ہوا۔ گھر کو صاف دیکھ کر حیران ہو گیا۔ لڑکی دھماکا سُن کر خوف زدہ ہو گئی، اور ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئی دیو نے لڑکی کو بُلایا اور ڈرا کر پوچھا تم کو جھاڑو دینے کی ترکیب کس نے بتائی۔ مگر لڑکی نے کچھ نہیں بتایا۔ دوسری صبح دیو نے لڑکی کو بُلا کر حکم دیا آج اس طرح کھانا پکاؤ کہ گوشت پورا پکا ہوا اور آدھا کچا بھی ہو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو مار ڈالی جاؤ گی لڑکی بیٹھ کر سوچنے لگی مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر دل میں کہنے لگی کہ آج میری موت آئی ہے۔ اس کے خیالات یہیں تک پہنچے تھے کہ اس کو پھر وہی فاختہ نظر آئی۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ فاختہ نے آتے ہی پوچھا آج دیو نے کیا کہا ہے لڑکی نے سب کچھ بتا دیا۔ فاختہ نے کہا اس طرح کرو پہلے چولھا جلاؤ اور آدھا گوشت پہلے ڈالو اور آدھا ایک گھنٹہ کے بعد اس طرح آدھا پکا رہیگا اور آدھا کچا۔ لڑکی نے ایسا ہی کیا۔ کچھ دیر کے بعد دیو آیا۔ لڑکی سے کھانا مانگا لڑکی نے کھانا پیش کیا۔ دیو نے دیکھا تو اپنے حکم کے مطابق پایا۔ تو اس نے ڈانٹ کر لڑکی سے پوچھا بتاؤ تم کو پکانے کی ترکیب کس نے بتائی۔ لڑکی خاموش رہی۔ دیو اور زیادہ خفا ہوا۔ اور لڑکی کو پھاڑ ڈالنے کا ارادہ کیا ٹھیک اس وقت جب دیو کا ہاتھ لڑکی کی گردن پر پہنچا۔ کھڑکی کھلی اور فاختہ اندر داخل ہوئی۔ آتے ہی شہزادی کے پاس بیٹھ گئی اور ایک مرد بن گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تلوار تھی اس نے تلوار سے دیو کو مار ڈالا اور لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر کہا چلو میرے ساتھ میں ایک ملک کا شہزادہ ہوں۔ اس دیو نے مجھ کو ایک فاختہ کی شکل میں تبدیل کر دیا تھا۔ اور یہ کہا تھا اس وقت تک تم اصلی شکل میں نہیں آسکتے جب تک تم کسی مظلوم کو کسی ظالم کے ہاتھ سے نہ بچاؤ۔ یہ ہے میری سرگزشت۔

ایک عرب کی عدیم النظیر بہادری

(از مولوی سید حامد حسین صاحب)

مرحبا اے افتخارِ قوم اے مردِ عرب
حبذا اے یادگارِ نسل اے عالی نسب

جب تلک باقی زمیں ہے اور چرخِ بیدار
تری ہمت اور جرأت ہے جہاں میں یادگار

یہ نہیں ہے قصہ پارینہ یا در ہوا
حال کا قصہ ہے جو شائع ہوا ہے جابجا

الشیا تھا اک جہاز اور اسمیں تھے حاجی سوار
رُخ تھا بصرہ کیطرف دریا کو وہ کرتا تھا پار

آگئی تازہ مصیبت آگ اُسمیں لگ گئی
کی بہت کوشش نہ لیکن وہ بجھائی بجھ سکی

وہ محل دریا کا ساحل اور دھڑکا جان کا
مستقل اس میں ہے کب کام ہے انسان کا

پندرہ سو سب تھے حاجی مرد و زن بچے سبھی
یہ پریشانی بڑی جانوں پہ سب کے بن گئی

چل رہا تھا وہ جہاز اور تھا دھواں اُسمیں اُٹھا
جو سوار اسمیں تھے انکو سوجھتا کچھ بھی نہ تھا

اتفاقاً اک جہازِ غیر بھی کچھ دور تھا
سُنکے گھنٹی خوف کی بہر مدد وہ آگیا

لیکن اپنی جان پیاری سارے انسانوں کو تھی
پاس آکر بھی نہ کچھ ہمت مدد کی پڑ سکی

لیکن اس میں ایک لڑکا تھا عرب کا بھی سوار
نعرۂ اللہ اکبر کرکے کودا ایک بار

نام عبد اللہ تھا بیشک وہ عبد اللہ ہی تھا
الشیا پر آگ میں بھی وہ بہادر چڑھ گیا

لا دکر لایا سواروں کو وہ اندر سے نکال
اپنے جلنے کا نہ کچھ کھٹکا نہ مرنیکا خیال

چوٹیں کھائیں جل گیا ہمت کو پر باندھے رہا
گر پڑا غش آگیا لیکن وہ پھر فوراً اُٹھا

نعرۂ اللہ اکبر اسکا کہنا بار بار
آنا جانا آگ میں ہر مرتبہ مثلِ شرار

دنگ تھے حکام انگریزی بھی اور کپتان بھی
عورتیں تھیں مدح خواں اور مرد تھے حیران بھی

اسجگہ موجود جتنے مرد اور حکام تھے
اس جوانمردی پہ اسکی سارے صدقے ہوگئے

لیلیا حلقے میں اسکو پاس آئے خاص و عام
ٹوپیاں سب نے اُتاریں اور کئے سب نے سلام

سب نے مانا اور کوئی اسطرح کا یاں نہیں
کہہ رہے تھے سب فرشتہ ہے یہ کم انساں نہیں

سال ہجری یادگاری سکا میں کہتا ہوں اب
قدرِ ملک اے یادگارِ نسلِ مردانِ عرب
٢٧٢ - ٢٩٥ ١٣٠ ٢٢٦ - ١١ - ٩٠،٣٠٣

عیسوی بھی سال اس کا ہدیہ میں کرتا ہوں اب
فخرِ ملکی ۔ یادگارِ نسل افگارِ عرب
٨٨٠ - ١٠٠ - ٢٣٦ - ١٣٠ - ٣٠٢ - ٢٧٢ = ١٩٣٠

انعامات کا فیصلہ

چیستاں مطبوعہ ۱۲ر اگست ۱۹۳۰ء کے بہت سے جوابات موصول ہوئے ہیں۔

بذریعہ قرعہ اندازی تین انعامات اول، دوم، اور سوم بالترتیب سید شوکت علی صاحب، حمیدالدین صاحب محمود اور عزیزہ سلطان صاحبہ کو روانہ کر دئے گئے ہیں۔

نیا معمّا

شرائط:

۱۔ جوابات تاریخ اشاعت سے دو ہفتہ کے اندر مندرجہ ذیل پتہ پر پہنچ جانے چاہئیں۔

پی ایس عزیز احمد۔ طالب علم درجہ نہم (بی)
معینیہ اسلامیہ ہائی اسکول۔ اجمیر

۲۔ ہر معمے کے جواب کے ساتھ ایک آنہ کا ٹکٹ آنا چاہیئے۔

۳۔ انعامات دو کتابیں ہیں جو اول اور دوم کو دی جائیں گی۔

ذیل کے مربع میں چند حروف ہیں انکو اس طرح جماؤ کہ ایک بامعنی جملہ بن جائے۔

ک	ی	ا	د	ک	س
ا	م ہ	ع	م	س	ا
ن	ک	و	ج	ا	ا
ع	و	ش	خ	ص	گ
ا	ح	ل	ک	ر	ی
م	م	ل	س	گ	ا

صفحہ ۶ کا بقیہ مضمون

اس نے بڑے بڑے جنگی انجن بنائے جو دشمن کی فوج پر پتھر برساتے تھے۔ اور بندرگاہ میں اسکے جہازوں کو ڈبو دیتے تھے۔ مارسلیس (Marcellus) رومی جرنیل ارشمیدس کا بڑا مداح تھا۔ اور جب اس نے اس شہر پر قبضہ کرلیا تو اس نے ارشمیدس کی جان کو بچانے کا اعلان کیا ان میں سے ایک سپاہی اس بڑے موجد کے دروازہ پر پہنچا وہ ارشمیدس کو پہچانتا نہیں تھا۔ ارشمیدس اس وقت تک ایک تنکے سے زمین پر شکلیں بنا رہا تھا۔ سپاہی نے اُس کا نام پوچھا۔ اس نے جواب دیا کہ اس کو مسئلہ حل کرنے دے اور شکلوں پر قدم نہ رکھے۔ اس پر سپاہی نے اس کا سر اُڑا دیا۔

مارسلیس کو اس کا بڑا رنج ہوا۔ اس نے اس کے رشتہ داروں کو انعام واکرام دیکر ان کے رنج کے مٹانے کی کوشش کی۔

ارشمیدس کو اسی شہر میں دفن کر دیا گیا۔ اور اس پر ایک ستون اسی کی یاد میں کھڑا کر دیا گیا۔

صفحہ (۹) کا بقیہ مضمون

یہاں کے اُستادوں کا۔ یہاں کے لڑکوں کا تمام میں نام ہے۔ تم جب پڑھتے ہو تو کہتے ہو "امی فلاں اخبار میں ہمارے اسکول کی تعریف لکھی تھی" دیکھو ہر چھ مہینے میں یہاں کوئی جھگڑا ہوجاتا ہے تو تم کو کتنا تعجب ہوتا ہے۔ تم ہی کہتے ہو کہ ہمکو تو دوسروں کی مدد کرنی چاہیئے یہ جھگڑے کیسے ہیں اور کون کرتا ہے احمد نے رحیم نگر ہی میں ایسا اسکول نہیں کھولا۔ انہوں نے جگہ جگہ ایسے اسکول کھولے ہیں جہاں یہی تعلیم دی جاتی ہے کہ جسطرح بھی دوسروں کی مدد کرو وہاں کے طالب علم ان باتوں پر عمل کرتے ہیں۔ ہر شخص اُنکی زندگی کو دیکھ کر یہی کہتا ہے ہمیں بھی یہی کرنا چاہیئے۔

عزیز۔ امی کام تو بہت اچھا کیا لیکن وہ مالدار آدمی تھے اسکول قائم کر دئے ہم تو غریب ہیں ہم کیا کریں۔ ہم تو اسکول نہیں کھلوا سکتے۔

امی۔ رات زیادہ ہوگئی ہے۔ سو رہو۔ پھر بتاؤنگی کہ غریب آدمی کو کیا کرنا چاہیئے۔ عزیز۔ امی ضرور بتانا۔ میں تو ضرور ایسے کام کرونگا جن سے لوگوں کو فائدہ پہنچے۔

جرمنی کے بہترین

یعنی

Bijou

دنیا کے بہترین ٹائپ رائٹر

"بجو"

ہلکے سفری ٹائپ رائٹر کا جدید ترین نمونہ، جو سہولتیں اس مشین میں ہیں کسی دوسرے ٹائپ رائٹر میں نہیں۔ نہایت خوبصورت پائدار، وزن کل ۴ سیر

قیمت انگریزی: مبلغ ۱۱۵ ر

" اردو: مبلغ ۱۱۶ ر

"آئیڈیل"
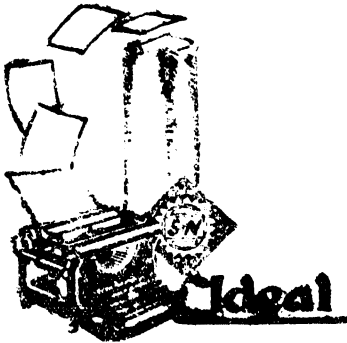
اس کارخانہ کی بڑی مشین۔ دفتر کے لئے اسے رکھئے اور اپنے دفتر کی کارکردگی میں ۵۰ فیصدی اضافہ کر لیجئے۔

قیمت انگریزی: مبلغ ۱۱۵

" اردو: مبلغ ۱۱۰

چاند
ہندوستان میں جہالت اور بری رسمیں اتنی پھیلی ہوئی
ہیں کہ اُن کے ہوتے ہوئے ترقی اور سدھار کی کوئی اُمید
نہیں کیجا سکتی۔ ملک کے عالم اور تجربہ کار مدتوں سے چیخ
رہے ہیں اور اصلاح کی کوشش میں نہیں تھکتے۔ مگر سُنے کون
اور سُنے تو عمل کیونکر کرے؟ رسم و رواج کی رُکاوٹیں سُدھار
کی طرف بڑھنے ہی نہیں دیتیں۔ بات بات پر ناک کٹنے کا خطرہ
قدم قدم پر بدنامی اور برادری کی ناراضی کا ڈر۔ اس حالت
میں اگر کوئی امید کی کرن پھوٹتی ہے تو
چاند الہ آباد
سے
کیونکہ اس رسالہ کی زندگی کا واحد مقصد مجلسی سُدھار ہے
پہلے بدن روگوں سے پاک ہو تب وہ کوئی کام کر سکے۔
چاند قوم و ملک کے رگ رگ میں گھسے ہوئے روگوں کو
اُبھار اُبھار کر روشنی میں لاتا ہے۔ وہ بڑی صفائی سے
آئینہ کی طرح عیبوں کی روبرو نمائش کر دیتا ہے۔ اور
اُسی کے ساتھ بڑے محبت بھرے لفظوں میں سُدھار کی
نصیحت کرتا ہے۔ سچ نہ مانیں تو خود دیکھ لیں۔ نمونہ کا
پرچہ ایک روپیہ میں منگالیں
ایڈیٹر منشی کنہیا لال ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ایڈوکیٹ
چندہ سالانہ آٹھ روپیہ
ششماہی پانچ روپیہ
فی جلد ایک روپیہ
کاپی نمونہ بلا قیمت نہ اجرا ہوگی۔
نام نامی بلا توقف مندرج فہرست خریداران
کرا لیجئے۔
چاند اردو میں اشتہارات دینا کامیابی
کا وسیلہ معقول ہے۔ مفصل کیفیت
منیجر دفتر "چاند" (اردو ایڈیشن)
چندر لوک الہ آباد سے دریافت
کیجئے۔ ٹیلیفون نمبر ۲۰۵۔
تار کا پتہ :۔ "چاند"
خاص نوٹ۔ مضامین نظم و نثر اور
دیگر ایڈیٹوریل مضامین کے بابت مراسلات
بنام ایڈیٹر "چاند" (اردو)
ہونا چاہیئے۔

نمبر ۷

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
پیام تعلیم
پندرہ روزہ تعلیمی رسالہ

تمام اشتہاروں میں ہر ایک چیز کے ساتھ اسکی قیمت مطابق ہنس نہ ریکھنی چاہئے۔ **قیمت پیام تعلیم۔ سالانہ ۶؍ ششماہی ۳؍ فی پرچہ ۱؍**

الکٹریکل انجینئرنگ یعنی بجلی کے کام کی تعلیم

چونکہ ہندوستان کے طول و عرض میں بلکہ اس کے علاوہ دیگر ممالک (برما، سراندیپ، عراق عرب، فارس وغیرہ) میں بھی بجلی کا کام بہت سرعت کے ساتھ پھیلتا جاتا ہے اس واسطے زمانہ کی ضرورت کو محسوس کرکے جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ دہلی میں بجلی کا کام اور موٹر کار کی تعلیم کو شروع کردیا گیا ہے

قواعد

الکٹریکل انجینیرنگ میں یہ کام شامل ہیں:-

سائینس و مشینری کے عام اصول مکانات میں روشنی اور پنکھے وغیرہ استعمال کرنے کے واسطے وائرنگ کرنا یعنی تار و دیگر سامان لگانا بجلی کی بیٹریاں بنانا، بیٹری کی دیکھ بھال، بیٹریاں چارج کرنا بجلی سے ملمع کرنا یعنی الکٹروپلیٹنگ کے اصول۔
ڈائرکٹ کرنٹ کے موٹر ڈائی نما۔ آرمیچر کی مشینری۔ آئیر کیٹر ٹرنسفارمر و موٹر وغیرہ بجلی کے پنکھے بجلی گھر کا کام ملائن کا کام بجلی کے تاروں میں ٹانکہ لگانا۔ بجلی کے ذریعہ سے زراعت کی آبپاشی کرنا، بجلی کے ذریعہ امراض کا علاج شعاع بنفشی [illegible] سے وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ اس کے طلبہ کو مختلف کارخانوں میں لیجا کر لاکھوں روپیہ کی بڑی بڑی مشینوں کا تجربہ کراتے ہیں تاکہ جہاں کہیں جاویں بغیر کسی قسم کی رکاوٹ یا جھجک کے فوراً کام کرسکیں۔

ہمارے یہاں تعلیم دینے کا طریقہ ایسا ہے کہ معمولی سمجھ کا آدمی جس کو معمولی اردو لکھنا پڑھنا آتا ہو نہایت آسانی سے کام سیکھ سکتا ہے۔ انگریزی داں اصحاب ہماری تعلیم کی مدد سے بہت زیادہ ترقی کرسکتے ہیں مزید حالات کے واسطے دفتر جامعہ سے خط و کتابت کریں۔

ہمارے یہاں کام سیکھ کر انسان ملازمت بھی کرسکتا ہے اور اپنا ذاتی کاروبار بھی کرسکتا ہے بجلی کے ذریعہ سے زراعت کرکے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ امراض کا علاج کرسکتا ہے۔

ہندوستانی ریاستوں میں، میونسپل کمیٹیوں میں بجلی کی کمپنیوں میں ٹھیکیداروں، محکمہ ریلوے، ملوں، کارخانوں جہازوں وغیرہ میں ایسے انجینیروں کی اکثر ضروریات رہتی ہیں۔

۲۔ الکٹریکل انجینیرنگ کی تعلیم کی میعاد چھ مہینہ ہے لیکن محنت کرنیوالا شخص دو یا تین مہینہ میں بھی کام پورا کرسکتا ہے۔
۳۔ کُل فیس بجلی کے کام کی صرف تیس روپیہ ہے جو کہ بوقت داخلہ یکمشت وصول کیجاتی ہے۔
۴۔ الکٹریکل انجینیرنگ کے طلبہ موٹر کار چلانا بھی سیکھیں گے ان کو تیس روپیہ زاید یعنی کل ساٹھ روپے ادا کرنے ہونگے۔
۵۔ محض موٹر کار کے کام کی فیس مبلغ پینتالیس روپے ہے۔
۶۔ باہر کے طلبہ کے لئے بورڈنگ کا کافی انتظام ہے۔ کرایہ کمرہ اور خوراک کے صرف آٹھ روپے لئے جاتے ہیں۔
۷۔ داخلہ ہرماہ کے پہلے ہفتہ میں ہوتا ہے
۸۔ ناخواندہ اشخاص بھی کام سیکھ سکتے ہیں۔ فقط

حامد علی الکٹریکل و مکینکل انجینیر (سابق گورنمنٹ الکٹریکل کسپرٹ و موٹر لاری انسپکٹر)

جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ دہلی

اُستاد اور والدین کا صفحہ

اردو کا طریقہ تعلیم

مولوی شفیع الدین صاحب نیّر

میں نے ایسے طلباء کو بھی دیکھا ہے جنہوں نے اس قاعدے کے مطابق تعلیم پائی ہے اور خود میں نے اسی قاعدے کو ترجیح دی ہے۔ یہاں آگر رنجیت سنگھ کو دیکھا ہے جس کو شاید Look and say کے اصول پر پڑھایا گیا تھا۔ یہ طالب علم اردو کی پہلی کتاب کا ساتواں سبق پڑھتا تھا۔ مگر سوائے مخصوص الفاظ کے باقی تمام الفاظ کی شناخت سے معذور تھا اور جہاں تک اُردو پڑھنے کا تعلق ہے کسی طرح بھی کامیاب نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بلکہ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ باوجود پہلی کتاب پڑھنے کے حروف تہجی سے بھی واقف نہ تھا۔ مجبوراً عمر کے لحاظ سے اُس سے بھی چھوٹے بچوں کے ساتھ طریق تہجی کے قاعدہ کی ابتدا کرائی اور چھ ماہ میں قاعدہ ختم کرایا اور پھر سب طالب علموں میں اتنی لیاقت پیدا ہوگئی کہ اردو کی پہلی کتاب کو خود بخود پڑھنے لگے۔ پس اپنے تجربے کی رو سے بھی اُردو قاعدے کی تعلیم کے لئے اسی اصول کو بہتر سمجھتا ہوں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ اسکا استعمال بہت کچھ اُستاد کی قابلیت پر منحصر ہے۔ یہ تو اُستاد کی پسند پر موقوف ہے اس امر کے امکانات ہیں کہ بعض صورتوں میں دو مختلف طریقوں کو ملا کر بہتر نتائج اخذ کئے جا سکیں اور اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اُستاد کو کسی ایک طریقے کا خواہ مخواہ پابند ہونا چاہیئے بلکہ جس طرح بھی یہ مقصد کہ طلباء اجلد سے جلد پڑھنے لگیں اور پڑھنے کا شوق اُن میں پیدا ہو حاصل ہو جائے۔ میرے خیال میں تو کسی اُستاد کی کامیابی کا یہی معیار ہونا چاہیئے۔

افسوس ہے کہ یہ بحث بہت بڑھ گئی اور اس لئے تفصیل میں پڑ کر آپ کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ اسی پر اکتفا کرتا ہوں کہ قاعدہ پڑھانے کے وقت ہمیں بچوں کی نفسیات child psychology سے بھی کچھ نہ کچھ واقف ہونا چاہیئے تاکہ ہم فطری رجحانات کو اپنے مقصد کے حصول میں استعمال کر سکیں یہ سمجھکر کہ بچہ تصویروں کو دیکھنے کا عادی ہے ہم حروف کا تخیل اگر تصاویر کے ذریعہ سے کرائیں تو یہ بہت دلچسپی کا باعث ہے۔

یہ سمجھکر کہ بچہ نچلا بیٹھنا نہیں جانتا اگر حروف اور حرکات و سکنات کو بعض حرکتوں کے ذریعہ ذہن نشیں کرائیں تو یہ مفید ہوگا۔ یہ سمجھکر کہ بچہ ایک کام سے بہت جلد سیر ہو جاتا ہے اور اُن کے سمجھنے سے قبل اس زبان کے بہت سے الفاظ اور ایک خاص حد تک طریق گفتگو سے واقف ہے۔ اُستاد سبق کے دوران میں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مختصر، دلچسپ اور آسان کہانیاں سنائیں یا اسی طرح کی نظموں کی مہارت کرائیں تو اس سے بچے کی طبیعت لگی رہیگی اور مضمون خشک ہونے کے باوجود بھی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ یہ یاد رہے کہ بالکل شروع ہی سے اُستاد اس بات کا خیال رکھے کہ کسی زبان کا غلط تلفظ یا کسی جملہ کی غلط طرز ادا اُس کے کان میں نہ پڑے جان سٹورٹ مل نے فرمایا ہے کہ یہ اچھا ہے کہ کوئی طالب علم ہزاروں حقیقتوں سے ناواقف رہے بہ نسبت اس کے کہ کوئی ایک بات بھی غلط اُس کے ذہن میں بیٹھ جائے"۔

مسٹر وسٹ پرنسپل ڈھاکہ کالج نے جو تقریر ۲۵؍، ۲۷؍ اور ۲۸ فروری کو دہلی میں کی تھی انہوں نے بھی اس بات پر زور دیا تھا کہ اُستاد کو پوری کوشش کرنی چاہیئے کہ بچہ کو غلط لفظ یا جملہ سننے کا موقع مہیا نہ ہونے دے یہ بات اصول فطرت کے موافق معلوم ہوتی ہے کیونکہ بیماری کے امکانات کو مٹا دینا بیمار ہونے کے بعد علاج کرنے سے بہتر ہے۔

اور ابتدا میں اصول تعلیم کے سراسر خلاف نامعلوم سے معلوم کی طرف چلنا پڑتا ہے۔ مگر یہ حالت بہت ہی تھوڑے عرصہ قائم رہتی ہے اور اس صورت میں بھی اس کے اثر کو مختلف نمونوں۔ تصویروں اور قدرتی اشیاء کے ذریعہ کم کیا جا سکتا ہے اور بہت جلد استقرائی طریقے سے کام لینے کا موقع مل جاتا ہے۔ اور اس اصول کی خلاف ورزی بھی نہیں کرنی پڑتی کہ معلوم سے نامعلوم کی طرف چلا جائے۔ پس شروع ہی سے پڑھنے یعنی تلفظ یعنی Articulation تفصیل یعنی Pronunciation روانی یعنی Fluency تاکید یعنی Emphasis

اور تغیر لحن یعنی modulation پر زور دینا اور خیال رکھنا چاہیئے۔

(۲) مضمون مقدار اور اشکال کے لحاظ سے بچوں کی استعداد اور عمر کے موافق ہو مفید ہو اور دلچسپ۔

(۳) بچوں میں عبارت پڑھنے کا مادہ پیدا ہو جائے تو اُستاد نمونتاً خود پڑھ کر اور جملہ امور کا خیال رکھ کر بچوں کو سُنائے پھر ابتدا میں اپنے ساتھ ساتھ بچوں کو بھی اُسی دُرست انداز سے پڑھنے کی عادت ڈالے اور اس کے بعد ایسی صورتیں اختیار کرے کہ خود طلبا پڑھیں۔

(۴) میرے خیال میں ابتدا میں لفظوں کے معنی پر الگ الگ زور دینا کچھ مفید نہیں کیونکہ اس سے یہ نقصان ہوتا ہے کہ طالب علم کسی لفظ کے موقع استعمال سے واقف ہونیکی بجائے اُس کے ایک مخصوص معنی یاد کرلیتا ہے۔ اگر طالب علم کسی جملے، پیراگراف یا سبق کو پڑھ کر اُس کا مطلب سیاق وسباق کی مدد سے سمجھ لے تو یہ کافی ہے۔ جب اس طرح بہت سے الفاظ سے واقفیت ہو جائے تو الفاظ کے معانی سے آگاہ کرنے میں بھی مضائقہ نہیں۔ اور اگر کسی لفظ کے معنی تبلانے میں ہوں تو اُس کے مختلف معنوں کے بتلانے کی ضرورت نہیں صرف وہی معنی تبلائے جا سکتے ہیں جنکی اُس خاص حالات میں ضرورت ہو۔

(۵) ابتدا میں غلطی کو فوراً درست کر دینا چاہیئے۔ بلکہ تمام ایسے الفاظ تختۂ سیاہ پر مشق کرانی ضروری ہے جن میں ذرا بھی غلطی کا امکان ہو

(۶) کیونکہ زباندانی کا مقصد عام بول چال میں غلطیوں سے محفوظ رہنا بھی ہے اس واسطے اُستاد کا فرض ہے کہ وہ اپنی تعلیم کو فقط کتاب ہی تک محدود نہ کرے بلکہ زندگی کی عام مصروفیات، ضروریات، یا اشیاء کے متعلق بات چیت بھی کرے۔

(۷) اُستاد کو شروع ہی سے یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ بہت جلد طالب علم کو نظم ونثر عبارات کے معانی اور مطلب بیان کرنا تشریح وتوضیح سے واقف ہونا۔ خلاصہ لکھنا۔ خط وکتابت اور مضمون نگاری سے دوچار ہونا ہے اس واسطے شروع ہی سے یہ اُمور بھی اُستاد کے پیش نظر رہیں اور وہ طلبا کے ذہن کو شروع سے اس طرح تربیت دیجائے کہ اپنے موقع پر جب ان امور سے طالب علم کا واسطہ پڑے تو یہ نئے نہ معلوم ہوں۔

(۸) جہاں زبان سے واقف ہونے کے لئے مندرجہ بالا امور سے واقف ہونا ضروری ہے، وہاں زبان دیگر مضامین کے حصوں کا بھی ایک ذریعہ ہے بلکہ میں تو یہ عرض کرونگا کہ زباندانی اور دوسرے مضامین لازم ملزوم ہے مگر یہ امر بھی اُستاد کی عام واقفیت اور مختلف مضامین میں بصیرت سے زیادہ تعلق رکھتا ہے جس طرح زبان کو پڑھانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اُس زبان کے ادب، تاریخ، ماخذ، وغیرہ امور سے کماحقہٗ واقف اور اصول تعلیم سے پورے طور پر آگاہ ہو وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ دیگر علوم وفنون سے قدرے واقفیت رکھتا ہو جس طرح زبان سے خاص طور پر نا واقف زبان کو پڑھانیکی اہلیت نہیں رکھتا اسی طرح وہ شخص بھی زبان کی تعلیم کے لئے موزوں نہیں جو سوائے زبان کی تعلیم کے لئے موزوں نہیں جو سوائے زبان کے دیگر مضامین سے بالکل نا واقف ہو۔ مگر دیگر علوم وفنون کی تعلیم ضمنی طور پر ہونی چاہیئے۔ اصل مقصد معلم کا زباندانی ہونا چاہیئے۔ اگر دوسرے مقاصد بھی حاصل ہو جائیں تو نورٌ علیٰ نور۔

(۹) نظم پڑھانے میں شروع ہی سے بہت زیادہ خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ نظم بچوں میں ادبی ذوق۔ دیگر حقایق سے واقفیت۔ اور اخلاقی نقطۂ نظر سے تربیت کرنے کا ایک نہایت ہی اچھا ذریعہ ہے۔ افسوس ہے کہ اردو علم ادب ابھی ایسی نظموں سے بہت معریٰ ہے جو اس مقصد کو پورا کر سکیں۔ تاہم مولوی محمد اسمٰعیل صاحب، مولانا حالی، ڈاکٹر سر محمد اقبال اور کتاب بازیچۂ اطفال کی چیدہ نظموں سے اس ضمن میں کچھ امداد لیجا سکتی ہے اور آگے بڑھ کر تو بہت سے شعرا کے کلام میں سے مندرجہ بالا مقاصد کی تکمیل کے لئے بہتر سے بہتر نمونے مل سکتے ہیں۔

(۱۰) قواعد زبان کی پابند ہوتی ہے زبان قواعد کی پابند نہیں ہوتی۔ اُن طلبا کو قواعد صرف ونحو سے آگاہ کرنا جنکی مادری زبان اردو ہے اُن کی پریشانی کا باعث ہو سکتا ہے۔ اس لئے شروع میں دو ایک سال تک جو وقت اور توجہ قواعد کی تعلیم کے فضول کام پر صرف کیجائے وہ پڑھنے میں مشق ومہارت بہم پہنچانے میں صرف کرنی چاہیئے۔

ہاں آگے چلکر اس قدر قواعد پڑھانے میں مضایقہ نہیں جس پر سبق کے دوران میں عملی طور پر استعمال ہو سکے۔

کوایف جامعہ

(کوایف نگار)

جامعہ میں جب کبھی چند دنوں کی چھٹیاں ہوتی ہیں سب طلبا مل کر سیر وتفریح کے لئے جاتے ہیں۔ اب کے دسہرہ کی چھٹیوں میں سب کے سب مل کر تو کہیں گئے نہیں البتہ مختلف جماعتوں نے اپنے شوق کے مطابق سیر وتفریح منائی۔ بعض طلبا اوکھلے دریائے جمنا کے کنارے گئے، چند طلبا نے آگرہ کی سیر کی اور ایک جماعت نے سائیکلوں پر پانی پت کا سفر کیا۔ اس جماعت میں ایک صاحب ایسے بھی تھے جنہوں نے صرف چند گھنٹے پہلے سائیکل چلانا سیکھا تھا۔

گزشتہ دو ہفتوں میں جامعہ نے تین ہاکی میچ امپیریل کلب سے کھیلے۔ پہلے اور تیسرے میں نتیجہ برابر رہا لیکن دوسرے میں جامعہ ہار گئی۔

جامعہ میں اساتذہ کی اتفاقی کمی ہو جانے کی وجہ سے جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور پروفیسر محمد مجیب صاحب اورنگ آباد سے تشریف لائے ہیں اور جامعہ کے کاموں میں مدد دے رہے ہیں۔

جناب شیخ الجامعہ صاحب حیدر آباد تشریف لے گئے ہیں۔ چند دن میں واپس آئینگی توقع ہے پروفیسر کیلاٹ صاحب انکی جگہ قائم مقام شیخ الجامعہ ہیں

انجمن اتحاد کے زیر اہتمام ایک جلسہ گزشتہ جمعرات کو گلشن منزل میں منعقد ہوا جس میں رشید اختر صاحب نے توحید اور تثلیث پر ایک دلچسپ مضمون پڑھا۔

۷ اکتوبر کو مولوی شفیق الرحمن صاحب قدوائی کا مقدمہ پیش ہوا۔ جو دو ماہ پیشتر گرفتار ہوئے تھے۔ آپ کو ایک سال قید محض کی سزا ہوئی ہر اور سزا کا شمار آپکی گرفتاری کے وقت سے ہوگا۔ ہم شفیق صاحب کو انکی اس عزت افزائی پر دلی مبارک باد دیتے ہیں۔

آجکل یہاں ملیریا کا زمانہ ہے۔ اکثر طلبہ اور بعض اساتذہ علیل ہیں۔ لیکن دو چار روز کی علالت کے بعد پھر اچھے ہو جاتے ہیں۔

کھیل کی خبریں

(کھلاڑی)

ہندوستان میں ہر سال ایک فٹ بال ٹورنامنٹ ہوتا ہے جس میں صرف ریلوے ٹیمیں حصہ لیتی ہیں۔ امسال اس ٹورنامنٹ کا آخری مقابلہ ای۔بی۔ ریلوے اور جی۔آئی۔پی ریلوے کے درمیان شملہ میں ہوا جس میں اول الذکر ٹیم نے آخرالذکر ٹیم کو شکست دی۔ ای بی۔ آر کے جیتنے میں صمد کا بہت بڑا ہاتھ تھا جو ہندوستان کا بہت اچھا کھلاڑی ہے۔

انگلستان کی ٹینس ٹیم ۲۸ نومبر کو کلکتہ پہنچ جائیگی۔ کلکتہ میں ایک ٹورنامنٹ ہوگا جس میں ہندوستان کے مشہور کھلاڑی بھی حصہ لیں گے اس کے بعد یہ ٹیم لاہور، دہلی، بمبئی، اور مدراس کے بھی دورے کرے گی اس ٹیم میں انگلستان کے ایک بہترین کھلاڑی آسٹن بھی شامل ہیں

دہلی میں آل انڈیا کرکٹ ٹورنامنٹ ۱۹ نومبر سے شروع ہوگا۔ اس میں مہاراجہ وزیا نگرم کی ٹیم بھی شرکت کریگی۔ مہاراجہ کی ٹیم کی طرف سے ہندوستان کے مشہور کھلاڑیوں کے علاوہ دنیا کے دو مشہور کھلاڑی ہابس اور سٹکلف بھی کھیلیں گے۔

جغرافیہ

یورپ کا ایک چھوٹا سا ملک بلجیم

(سید نصیر احمد صاحب)

بلجیم کا چھوٹا سا ملک فرانس اور جرمنی کے درمیان واقع ہے جنگ عظیم میں اسی حیثیت کی وجہ سے اسے بہت نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ جنگ سے پہلے بہت کم لوگ بلجیم سیر و تفریح کے لئے جاتے تھے۔ کیونکہ بلجیم کے باشندے بہت خاموش اور الگ رہنے والی طبیعت کے لوگ ہیں۔ وہ دوسرے لوگوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتے۔ انھیں باتوں کی وجہ سے بلجیم کے باشندوں کو مغرور و متکبر سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جنگ کے بعد تمام دنیا کو معلوم ہو گیا کہ بلجیم کے باشندے بہت حلیم اور بردبار ہیں۔

بلجیم میں دو قومیں بستی ہیں۔ فلیمنگ (Fleming) اور ویلون (Walloon) فلیمنگ ولندیزیوں سے اور ویلون فرانسیسیوں سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ اول الذکر خوبصورت ہوتے ہیں لیکن ذرا موٹے۔ ویلون اگرچہ سیاہ اور زرد ہوتے ہیں لیکن ان کا جسم بہت اچھا ہوتا ہے۔ ان دو قوموں میں یہی امتیاز اور فرق ہے۔ باقی ان کے رسم و رواج اور عادتیں بالکل ایک سی ہیں۔ یہ دونوں قومیں پانچسو برس سے ایک ساتھ رہ رہی ہیں اور ان میں ایک دفعہ بھی جھگڑا فساد نہیں ہوا۔ دونوں کا مذہب ایک ہی ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ زبانیں مختلف ہیں۔

بلجیم کے کسان بہت محنتی اور مستعد ہوتے ہیں۔ صبح سے لے کر شام تک کام کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی صحت قابل رشک ہوتی ہے اور کبھی بیمار نہیں ہوتے۔ بوڑھے سے بوڑھا کسان بھی کام کرنے کا شایق ہوتا ہے۔ کام کرتے وقت یہ لوگ لکڑی کے بڑے بڑے جوتے پہنتے ہیں۔

اتوار کے روز سب چھوٹے بڑے اپنے بہترین کپڑے پہنکر ہوٹلوں میں جاتے ہیں وہاں کھانے پینے کے علاوہ بہت باتیں ہوتی ہیں بس یہی ان کی تفریح ہے اور اسی کا انھیں شوق ہے۔

بلجیم میں ایک کھیل بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ یہ نشانہ بازی کا کھیل ہے۔ بلجیم کے لوگ شروع زمانہ ہی سے تیر و کمان چلانا خوب جانتے ہیں اور اب تک ان کو بہت شوق ہے۔ ایک دن سب لوگ ایک بڑے میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ میدان کے بیچوں بیچ ایک لانبا بانس کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ اسکے اوپر سرے پر ایک چھوٹا سا لکڑی کا کبوتر ہوتا ہے۔ جو شخص سب سے زیادہ مرتبہ اس کبوتر کا نشانہ کرتا ہے اسے انعام دیا جاتا ہے۔

بلجیم کا جنوبی حصہ بہت زرخیز ہے۔ اسکے علاوہ یہاں کوئلے کی بھی بہت سی کانیں ہیں۔ مگر کانوں میں کام کرنے والوں اور مزدوروں کی حالت بہت خراب ہے۔ مزدوری انھیں بہت ہی کم ملتی ہے۔ اور جس جگہ یہ لوگ رہتے ہیں اسے کمرہ تو کوئی کہہ نہیں سکتا ہاں چھوٹے چھوٹے سوراخ ضرور ہوتے ہیں۔

بلجیم دو قدرتی حصوں میں منقسم ہے۔ شمال کا میدانی حصہ اور جنوب کا پہاڑی علاقہ۔ دریائے موز ان دونوں حصوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے۔ دونوں حصوں کے دریاؤں کی خصوصیات بھی علیحدہ ہیں۔ دریائے سکلیڈ شمالی میدان کا دریا ہے۔ جو آہستہ آہستہ بہتا ہے۔ اور تیز رفتار موز

پہاڑی علاقہ کا دریا ہے۔ بلجیم کے بڑے بڑے شہر انھیں دریاؤں کے کناروں پر ہیں۔

برسلز دریائے سین پر واقع ہے۔ یہ بلجیم کا دارالخلافہ اور بڑا خوبصورت

شہر ہے۔

مصور بلجیم کے شہروں کو بہت پسند کرتے ہیں کیونکہ یہاں مصوری کے اچھے اچھے نمونے پائے جاتے ہیں۔ انھیں شہروں میں ایک برگس ہے جسے شمال وینس کہتے ہیں۔ یہ اسی خصوصیت کی وجہ سے بہت مشہور اور دلچسپ ہے۔ ہزاروں مصور خصوصیت سے ہر سال یہ شہر دیکھنے آتے ہیں۔ لیکن جنگ عظیم کی وجہ سے اس شہر نے بہت نقصان اٹھایا ہے۔

بلجیم کے بعض گاؤں قابل دید ہیں۔ انھیں میں سے ایک کاکس ڈی ہے۔ یہ گاؤں سمندر کے کنارے پر واقع ہے۔ اور یہاں کے لوگوں کا گزارہ مچھلی پر ہے۔ یہ لوگ کانٹوں اور جال سے کنارہ پر بیٹھکر یا تھوڑے تھوڑے پانی کے اندر جاکر مچھلی نہیں پکڑتے۔ بلکہ گھوڑوں پر سوار ہو کر مچھلی پکڑتے ہیں۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۷)

جورکی ایک جاسوس کے متعلق بیان کرتا ہے کہ وہ حکومت کے ایما سے میرے ہمسایہ میں رہتا تھا۔ اور میں اس سے نہایت کم معاوضہ پر تمام کام لیا کرتا تھا اور وہ نہایت خوش اسلوبی سے میرا ہر کام کیا کرتا تھا۔

۱۹۰۵ء میں پیٹرس برگ میں طلبہ اور مزدوروں نے ایک زبردست مظاہرہ کیا۔ جس کی سرکردگی پادری گاپون اسقف نے کی۔ جب یہ جماعت قصر شاہی کے قریب پہنچی اور بادشاہ سے پارلیمنٹ کا مطالبہ کیا تو اس کے جواب میں توپوں اور بندوقوں کی گولیاں ملیں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ زار کو بنی نوع انسان کے اس بیجا ہلاکت پر نامزد کیا جاتا۔ لیکن قوت کے مقابلہ میں کسی کی کیا چل سکتی ہے۔ قتل وغارت کے بعد حکومت نے لوگوں کو گرفتار کرنا شروع کیا۔ جورکی اس ہنگامہ میں شریک تھے۔ اس کو بھی گرفتار کیا گیا۔ اور ایک سال کی سزا ملی۔

ایک سال کے اختتام پر اس پر بیماری کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ مجبوراً اسے راس کی مرطوب آب و ہوا کا خیال کرکے اپنے ملک کو چھوڑنا پڑا اور اٹلی میں اقامت اختیار کر لی۔

زار کے عہد میں روسی انقلابیوں کا مرکز جنوا تھا

انقلاب کے برپا ہونے کے وقت جورکی روس نہیں اوس مدت میں بسا اوقات اس کا اور لینن کا تصادم ہوا۔ جورکی لینن کی طرح فریقین کے ساتھ ظلم وجور اور سختی کا حامی نہ تھا۔ اس نے قدیم آثار محفوظ رکھنے کے لئے ایک انجمن بنائی اور بیت العلم کی بنیاد رکھ کر اہل علم کی حفاظت اور مالی سرپرستی کی نیز کتابوں کی نشر و اشاعت کے لئے ایک کمپنی بنائی۔ یہ کمپنی روسی کتابیں شایع کرتی، دوسری زبانوں سے روسی زبان میں ترجمہ کرواتی۔ اور ملک میں کم سے کم قیمت میں کتابوں کی اشاعت کا انتظام کرتی۔ علم وادب کی ان خدمات کی بنا پر اہل روس جورکی کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

حسابی چٹکلہ

(نبی احمد صاحب انصاری طالبعلم ثانوی دوم جامعہ ملیہ)

میں تمہارے بھائی بہنوں کی تعداد بتلا سکتا ہوں

اپنے زندہ بھائیوں کی تعداد خیال میں لاؤ۔ اسے دوچند کرو۔ اس میں تین جمع کرو پھر حاصل جمع کو پانچ سے ضرب دو پھر اس میں اپنی زندہ بہنوں کی تعداد جمع کرو اسے دس سے ضرب دو۔ پھر اس میں اپنے مرے ہوئے بھائی اور بہنوں کی تعداد جمع کرو اور کل میزان میں سے ۱۵۰ تفریق کرو جو عدد باقی رہے گا اس میں سے:۔

دائیں جانب کا عدد کل اموات کا ہوگا

بائیں طرف کا عدد زندہ بھائیوں کا

اور درمیانی عدد زندہ بہنوں کی تعداد کا

تاریخ

جورکی غریبوں کا غمخوار

جناب غلام سرور صاحب مقیم مصر

لوئیس شاز دہم شاہ فرانس کے متعلق مشہور ہے کہ انقلاب فرانس کے دوران میں اس نے ایک دن پیرس کے قیدخانہ سے باہر جھانکا۔ لوگوں کا غیر معمولی ہجوم اور جوش وخروش دیکھکر وجہ پوچھی معلوم ہوا کہ والیٹر کی لاش اس کی قدیم قبر سے نکال کر بڑے تزک و احتشام سے ایک نئے عالیشان مقبرہ میں لئے جارہے ہیں۔ بادشاہ نے لاش کی طرف اشارہ کرکے کہا ہم پر سب بلائیں اور مصائب اس شخص کی وجہ سے آئیں۔

انقلاب روس کے بغور مطالعہ کرنے والے پر یہہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ ٹالسٹائے اور جورکی ایسے اہل قلم نے ملک میں انقلاب کا بیج بویا تھا اور زار کی جابرانہ حکومت کے خلاف لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کیا تھا۔ ہمیں روس کے انقلاب اور بالشویکی اصول کے حسن و قبح سے کوئی بحث نہیں اس مضمون سے ہمارا مقصد جورکی کے حالات پیش کرنا ہے۔

روس کے تمام انقلابی اہل قلم میں سے صرف جورکی نے انقلاب کو اپنی انکھوں سے دیکھا جورکی غریبوں اور قلاشوں کا ادیب ہے۔ اس نے بے سروسامانی اور انتہائی فقر وفاقہ میں تربیت پائی اس کا چہرہ ایک محنت کش مزدور کا چہرہ ہے جس پر سختی کے سوا اور کوئی چیز نمایاں نہیں۔ چہرہ کی ہڈیاں چینیوں کی طرح باہر نکلی ہوئی ہیں۔ لباس و معاشرت میں بالکل مزدور۔ اسکی ہر تحریر مزدور اسکی کس مپرسی اور فقر وفاقہ کے متعلق ہوتی ہے۔ اس وقت روس میں کئی سیاسی جماعتیں ہیں جن میں آئے دن آپس میں بغض وحسد کا بازار گرم رہتا ہے لیکن تمام قوم جورکی کی محبت و احترام میں یکجا ہے۔ انکے نزدیک جورکی ایک روحانی پیشوا اور غریبوں کا ہمدرد ہے جیسے والیٹر اہل فرانس کے ہاں آزادی کا پیغمبر ہے۔ لینن کی وفات کے بعد جورکی کے پایہ کا اہل قلم روس میں کوئی نہیں ہے۔ گذشتہ موسم گرما میں جورکی کے ورود پر باشندوں نے اسکا اس طرح استقبال کیا گویا کہ ایک فاتح سردار فتح وکامرانی کے بعد اپنے ملک میں آتا ہے۔ گذشتہ تین سالوں میں اس کی تصنیفات تقریباً بیس لاکھ کے قریب شائع ہوئیں۔ حکیم جورکی کے تعلقات بالشویکی حکومت کے ساتھ اچھے نہیں تھے اس لئے اس نے سنہ ۱۹۲۲ء میں روس چھوڑ دیا تھا۔ اسکے خیال میں موجودہ حکومت کاشتکاروں کے معاملہ میں درگزر کررہی ہے۔ وہ اور ٹراٹسکی اسکے حامی ہیں کہ کاشتکاروں کو بالشویکی اصولوں پر چلایا جائے، لیکن گذشتہ موسم گرما میں جورکی نے اپنی رائے بدل دی اور وہ موجودہ حکومت کا حامی بنگیا۔

جورکی اور دماغی افراد کی طرح عملی سیاست سے سخت درگریز کرتا ہے۔ حکومت روس نے اسکی عزت افزائی کے خیال سے اس کی مجلس عاملہ کا رکن منتخب کیا۔ اس مجلس کے سپرد حکومت کی نگرانی ہوتی ہے۔ جورکی نے رکنیت قبول توکرلی لیکن جلدہی روس کو خیرباد کہہ کر اٹلی میں پناہ لی اور اپنا وقت لکھنے پڑھنے میں صرف کرنے لگا۔

حکیم جورکی کا باپ رنگریز تھا، بچپن ہی میں اس کو معاشں کی تلاش میں ادھر اُدھر گھومنا پڑا۔ ایک شہر سے دوسرے شہر میں مذہبی تصاویر بناتا پھرا تاخوش قسمتی سے ایک روٹی بنانے والے سے ملاقات ہوگئی اور اسکے ساتھ کام کرنے لگا۔ یہہ شخص انقلابی خیالات کا پورا حامی تھا۔

اس زمانہ میں روس میں سخت ظلم ہوتا تھا۔ کسی فرد کی مجال نہ تھی کہ زار کے جابر حکام کے خلاف زبان کھولے۔ اصلاح کا نام لینا بغاوت کے مترادف تھا۔ اس لئے چپکے چپکے حکومت کے خلاف خفیہ سازشیں ہورہی تھیں۔

یہہ روٹی بنانے والا راماس نامی اپنی دکان میں نوجوانوں کو جمع کیا کرتا۔ دکان کی روشنی سے جاسوس کو کوئی شبہ نہ ہوتا وہ یہہ سمجھتے کہ رات کو کام ہوتا ہے۔ اس طرح سے ایک عرصے تک یہہ جماعت باہم مل بیٹھتی رہی۔

راماس نے جورکی کو پڑھنے لکھنے کا شایق پاکر اسکی تعلیم کا انتظام کیا اور اور اس میں بغاوت کا ایسا بیج بویا جو اب تک بڑھا جاتا ہے۔ اس زمانہ سے جورکی افسانے لکھنے شروع کئے۔ یہ افسانے غریبوں کے متعلق ہوا کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاسوسوں نے اس کا پیچھا کرنا شروع کیا۔ کئی بار مختلف الزامات کی بنا پر قیدخانہ کی ہوا کھانی پڑی۔ (بقیہ صفحہ [illegible] پر ملاحظہ فرمائیے)

قصے کہانیاں

ایک نہایت دلچسپ کہانی

(جناب عبدالعلیم صاحب نامی)

ایک زمانہ کا ذکر ہے کہ کسی ضلع کے ایک قصبہ میں ایک دولتمند کسان رہا کرتا تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے، سائمن سپاہی۔ طارس بہادر اور ایون بیوقوف۔ اسکے علاوہ ایک کنواری لڑکی تھی جس کا نام مارتھا تھا۔ وہ گونگی اور بہری تھی۔ سائمن سپاہی شاہی فوج میں بھرتی ہوگیا۔ طارس بہادر قصبے کے ایک سوداگر کے پاس چلا گیا اور بیوقوف ایون ایک ناکارہ کی حیثیت سے گھر میں پڑا رہا اور جوتائی کا کام اسوقت تک کرتا رہا کہ اسکی کمر جھک گئی۔

سائمن سپاہی نے اپنی خدمات کے صلہ میں ایک معزز عہدہ حاصل کیا، ریاست پیدا کی اور ایک شریف آدمی کی لڑکی سے شادی کر لی۔ اس کی تنخواہ معقول تھی اور ریاست بھی وسیع تھی پھر بھی وہ اپنے اخراجات کا کفیل نہ ہو سکتا تھا جو کچھ وہ پیدا کرتا اس کی بیوی فراخدلی سے خرچ کر دیتی اور وہ ہمیشہ تنگدست رہتا۔

سائمن سپاہی ایک مرتبہ اپنے کارندہ کے پاس گیا اور روپیہ طلب کیا لیکن اس نے جواب دیا "روپیہ کیسا۔ آپ کے پاس مویشی کہاں ہیں۔ ہل چلانے کا اوزار اور گھوڑے کہاں ہیں جو روپیہ آوے۔ پہلے اس کا انتظام کیجئے پھر آمدنی کی توقع رکھئے"۔

سائمن سپاہی اپنے باپ کے پاس گیا اور کہا۔ "آپ امیر آدمی ہیں اب تک آپ نے مجھے محروم رکھا تھا اب آپ اپنی جائداد کو تقسیم کر کے ایک تہائی مجھے دیجئے تاکہ اپنی ریاست کو میں ترقی دے سکوں"۔

لیکن ضعیف آدمی نے جواب دیا "تم میرے گھر کیا لائے تھے جو میں اپنی ثلث جائداد کا تم کو مالک بناؤں اور ایون اور لڑکی پر صریحی ظلم کروں۔

لیکن سائمن نے جواب دیا "وہ بیوقوف ہے اور لڑکی گونگی ہے اور بہری ہے وہ اسے لیکر کیا کرینگے؟

ضعیف آدمی نے کہا۔ ایون سے پوچھو اوس کی کیا رائے ہے۔

اور ایون نے جواب دیا۔ جو کچھ آپ چاہتے ہوں اسے لینے دیجئے۔

سائمن سپاہی نے باپ کی جائداد کا حصہ لیا۔ اپنی ریاست میں تبدیل کیا اور پھر ملازمت پر چلا گیا۔

طارس بہادر نے بھی بہت دولت پیدا کی اور ایک سوداگر کی لڑکی سے شادی کر لی۔ پھر بھی اس کو زیادہ کی خواہش تھی وہ بھی باپ کے پاس آیا اور اس سے کہا "میرا حصہ مجھے بھی عطا کر دیجئے"۔

لیکن ضعیف آدمی طارس کو کچھ نہ دینا چاہتا تھا جواب دیا۔ "تم یہاں کیا لائے تھے۔ یہ سب ایون کا پیدا کردہ ہے پھر میں اس کی اور لڑکی کی حق تلفی کیوں کروں؟"

طارس نے کہا اس کو کس چیز کی ضرورت ہے؟ وہ بیوقوف ہے نہ شادی کر سکتا ہے اور نہ اسکو کوئی لڑکی دے گا۔ اور گونگی لڑکی کو کس چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ اس نے ایون سے کہا، سنتے ہو مجھے میرا حصہ دیدو۔ اوزاروں کی مجھے خواہش نہیں ہے اور جانوروں میں بجز بھورا گھوڑا پسند ہے وہ تمہاری جوتائی کے لئے بھی بیکار ہے۔

ایون مسکرایا اور کہا آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو لے لیجئے۔ میں اس سے زیادہ پیدا کرنے کی کوشش کروں گا۔

انھوں نے طارس کو اس کا حصہ دیدیا۔ وہ سامان گاڑی پر لدوا کر بازار لے گیا۔ اور بھورے گھوڑے کو بھی ساتھ لے گیا۔ ایون صرف ایک بھیڑ کے ساتھ پہلے کی طرح ماں باپ کی مدد کرنے کے لئے رہ گیا۔

۲

بڈھا شیطان یہ دیکھ کر بہت غصہ ہوا کہ یہ لوگ تقسیم میں بہت محتاط رہے اور خوش خوش اپنا حصہ لے کر چلے گئے اس نے "تین بچہ شیطان" کو بلایا اور کہا، دیکھو یہ تین بھائی سائمن سپاہی، طارس بہادر، اور ایون بیوقوف ہیں۔ ان کو آپس میں لڑنا چاہئے تھا لیکن اطمینان کے ساتھ رہتے ہیں اور دوستانہ طریقہ پر ملتے ہیں۔ ایون بیوقوف نے میرا جال توڑ دیا۔

(باقی آئندہ)

ایمان داری

جناب محوی صدیقی۔ از مدراس

ابو یعقوب ایک بہت بڑے بزرگ آدمی گزرے ہیں۔ یہہ بیچارے ایک بار کسی سخت مصیبت میں پھنس گئے اور اس کی وجہ سے انھیں اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ وہ بہت پریشانی کی حالت میں شہر بیروت میں آئے، جو شام کا ایک مشہور شہر ہے۔ بیروت میں کوئی انھیں نہیں جانتا تھا، اور وہ چٹائیاں بناکر اپنا پیٹ پالتے تھے۔ ایک بار وہ اپنی کسی ضرورت سے مشہور شہر دمشق میں آئے۔ اور ایسے بیمار پڑے کہ اٹھنا بیٹھنا مشکل ہوگیا۔ نہ کوئی ان کا علاج کرنے والا تھا، اور نہ کوئی خدمت کرنے والا۔ نہ کوئی دوست تھا، نہ عزیز۔ یہہ ایک سڑک کے کنارے پڑے رہا کرتے تھے، کوئی راہ چلتا انھیں غریب اور بیمار سمجھ کر کچھ دے دیتا تو کھا پی لیتے تھے، یہہ بزرگ تھوڑے دن بعد اچھے ہوگئے تو شہر سے باہر نکلے اور ایک سرکاری باغ میں جاکر رکھوالے کی خدمت پر نوکری کرلی۔ یہہ باغ مسلمانوں کے مشہور بادشاہ نورالدین کا تھا۔ ابو یعقوب رات دن وہیں رہتے اور کام کاج کیا کرتے تھے۔

چھہ مہینے کے بعد ایک روز بادشاہ سلامت سیر کرتے ہوئے باغ میں آئے، اور باغ کے داروغہ سے انار کی فرمائش کی۔ داروغہ نے ابو یعقوب کو حکم دیا کہ بادشاہ سلامت کے لئے کچھ انار توڑ لاؤ۔ یہہ گئے اور کئی پکے انار توڑ لائے۔ داروغہ نے بادشاہ کے سامنے پیش کئے۔ اس نے چکھے تو انار کھٹے تھے، داروغہ سے بادشاہ نے، اور داروغہ نے ابو یعقوب سے کہا:۔

"تم چھہ مہینے سے باغ میں نوکر ہو، درختوں کی رکھوالی کر رہے ہو۔ اور آج تک تمھیں یہہ نہ معلوم ہوا کہ میٹھا انار کونسا ہے اور کھٹا کون۔ بادشاہ سلامت کے لئے ایسے خراب انار توڑ لائے"

ابو یعقوب بولے:۔

"جناب آپ نے مجھے درختوں کی حفاظت کے لئے نوکر رکھا ہے، یا پھل کھانے کے لئے؟ جب مجھے پھل کھانے کی اجازت نہیں تو کیا خبر کہ کون پھل میٹھا ہے اور کون کھٹا! میں نے تو آجتک چکھا نہیں پھر آپ ہی بتلائیے کہ میرا کیا قصور ہے"

یہہ سچا جواب سنکر داروغہ کو بڑی حیرت ہوئی۔

اس نے ابو یعقوب کی ایمانداری کا سارا قصہ جاکر بادشاہ کے حضور میں بڑے تعجب سے بیان کیا۔

نورالدین بہت اچھا بادشاہ تھا۔ وہ یہہ سنکر بہت خوش ہوا اور یہہ خیال کیا کہ یہ ضرور ایماندار رکھوالا کوئی بڑا بزرگ آدمی ہے۔ اس نے خود آکر ان بزرگ سے ملاقات کی۔ انکے حالات پوچھے۔ عزت سے انھیں اپنے پاس بٹھایا۔ پھر اپنے ساتھ شہر لے گیا، اور کئی روز خاص محل میں مہمان رکھا، دعوتیں کیں، عمدہ عمدہ کھانے کھلوائے، بہت زیادہ خاطر تواضع کی۔

نورالدین بادشاہ، حکومت کے خزانے سے اپنے خرچ کے لئے ایک پیسہ بھی نہیں لیتا تھا۔ بلکہ اپنی ضرورت کے لئے خود محنت مزدوری کرکے کچھ کما کھا لیتا تھا۔ اس حلال کمائی سے کھانا کھلاتا تھا۔ ایک روز رات کو جبکہ سردی بہت پڑ رہی تھی۔ یہہ بزرگ چپکے سے محل سے نکلے اور شہر دمشق سے چلدئے

(بقیہ صفحہ ۱۰) ہم سب لوگ گھر واپس ہوئے اور سامان بیچکر ہزارہا روپیہ نفع کمایا، پھر کئی بار بندر گوے کر گیا اور سامان لایا۔

حضور! سچ تو یہہ ہے کہ میری ساری دولت کا سبب یہی بندر ہے بصرے میں سب سے بڑا مالدار آج مجھ سے کوئی نہیں اور نہ اتنے ہیرے جواہرات کسی کے پاس ہیں۔ بادشاہ بہت خوش ہوا پھر اس نے وہ ہیرا پیش کیا۔ ہارون رشید نے معقول قیمت ادا کی ملکہ زبیدہ بھی یہہ قصہ سنکر اور ہیرا پاکر بہت خوش ہوئی۔ پھر جب خلیفہ یا ملکہ کو ہیرے جواہرات کی ضرورت ہوتی تو احمد کسلانی ہی سے خریدا کرتا تھا۔

بچو! بتاؤ احمد کسلان کو دولت کس طرح ملی اور خلیفہ کسے کہتے ہیں دینار کے کیا معنے ہیں۔

ایک قیمتی ہیرا

(جناب محوشی صدیقی صاحب اندراس)

ایک دن مسلمانوں کے بادشاہ خلیفہ ہارون الرشید دربار میں بیٹھا تھا، ایک غلام سونے کا تاج ہاتھ میں لئے آیا اور بڑے ادب سے سلام کرکے عرض کی کہ حضور والا! ملکہ زبیدہ نے یہ تاج حضور کے پاس بھیجا ہے اور فرمایا ہے کہ اس میں اوپر لگانے کے لئے ایک بڑے ہیرے کی ضرورت ہے۔

بادشاہ نے اسوقت ہیرا منگوانے کا حکم دیا، شاہی خادم فوراً جوہریوں کے پاس پہنچے لیکن ویسا ہیرا نہ ملا۔ واپس آکر بیان کیا۔ بادشاہ نے فرمایا کہ جس طرح ہوسکے ڈھونڈھ کر لاؤ۔ ایک درباری نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی:-

"ایسا ہیرا صرف احمد کسلان کے پاس مل سکتا ہے جو بصرے کا بڑا جوہری ہے۔"

فوراً بادشاہ کا خاص آدمی بصرے روانہ کیا گیا۔ اس نے وہاں پہنچکر احمد کسلان کا پتہ چلایا اور اسے بادشاہ کا حکم دکھایا۔ احمد اسی وقت بہت سی قیمتی چیزیں اور تحفے لے کر بغداد کو روانہ ہوگیا۔ بغداد پہنچکر سیدھا شاہی محل کو گیا۔ اور بادشاہ کو نہایت ادب سے سلام کیا۔ بادشاہ نے عزت سے بٹھایا پھر احمد نے اجازت لے کر سارے تحفے پیش کئے۔ یوں تو ہر چیز انوکھی اور عجوبہ تھی۔ مگر سب سے زیادہ عجیب چیز ایک سونے چاندی کا جھاڑ تھا۔ اس کی ٹہنیوں پر جواہرات کی چڑیاں بیٹھی تھیں۔ اور احمد کے اشارے پر پھدکتی اور اچھلتی کودتی تھیں۔

بادشاہ نے حیرت سے پوچھا، احمد! احمد یہ چیزیں تم نے کہاں سے پائیں؟-

احمد نے کہا۔ حضور میرا قصہ بھی عجیب ہے، حکم ہو تو سناؤں۔

بادشاہ نے فرمایا۔ ضرور!

احمد نے کہا۔ حضور میں ایک غریب آدمی کا بچہ ہوں۔ میرا باپ ایک غریب مزدور تھا، میں بچپن میں بہت کاہل تھا۔ دھوپ نکلے تک برابر پڑا سویا کرتا تھا۔ پھر دن بھر بستر پر پڑا رہتا تھا۔ اور کوئی کام کاج نہ کرتا تھا۔ میں جب پندرہ سال کا ہوا تو باپ کا انتقال ہوا۔ میری غریب ماں محنت مزدوری کرکے میرا اور اپنا پیٹ پالتی تھی، ایک روز اس نے سمجھایا کہ بیٹا! پڑے پڑے یوں کب تک کام چلے گا۔ لوگ تم کو کسلان یعنی کاہل کہنے لگے ہیں۔ گھر سے نکلو ورنہ بھیک مانگنی پڑے گی

اس نصیحت کا مجھ پر بہت اثر پڑا، اس وقت گھر سے نکل کر سیدھا ایک بزرگ کے پاس پہنچا۔ جو ہماری ہی گلی میں رہتے تھے۔ اور ان سے کہا کہ جناب کوئی ایسا طریقہ بتائیے کہ میں اپنا اور اپنی ضعیف ماں کا پیٹ پال سکوں۔

وہ بڑی شفقت سے پیش آئے اور بولے۔ کل کچھ سوداگر یہاں سے روانہ ہونے والے ہیں۔ وہ سمندر سے موتی نکال کر لاتے ہیں اور بڑا نفع کماتے ہیں۔ تم بھی انھیں کے ساتھ جاؤ۔ یہ لو پچاس دینار (روپیہ) میں تمہیں دیتا ہوں۔ جتنا سامان لاسکو لے آنا۔ پھر خدا مدد کریگا مگر محنت شرط ہے۔ میرے پاس ایک بوڑھا بندر بھی ہے۔ یہ بڑا ہوشیار اور سمجھدار ہے، اسے بھی ساتھ لیے جاؤ بہت کام آئے گا۔

دوسرے دن انھوں نے مجھے ایک سوداگر سے ملایا، اور تیسرے پہر کو میں اپنی ماں سے رخصت ہوکر وہ بندر اور دینار لئے ہوئے سوداگر کے ہمراہ جہاز پر روانہ ہوگیا۔ ہم دو چار جزیروں میں اترے، کچھ اپنا سامان بیچا۔ کچھ خریدا، کچھ چیزیں میں نے بھی مول لیں۔ اس کے بعد ایک دوسری جگہ ٹھیرے اور سمندر سے موتی نکالنے لگے۔ میں اس فکر میں تھا کہ کیونکر نکالوں، اتنے میں بندر سمندر میں کود پڑا اور اس نے کئی غوطے لگائے اور بہت سے موتی، قیمتی پتھر سامنے لاکر رکھدئے۔ میں بہت خوش ہوا، بندر کو دودھ، ملائی، مٹھائیاں کھلائیں غرض

(بقیہ صفحہ ۲۹ پر دیکھئے)

تصویری لطیفہ

از جناب سید منیر احمد صاحب

(۱) ہیری نے آگرہ کا واپسی ٹکٹ خریدا اور جب ٹکٹ بابو نے باقی ۵ روپے کا نوٹ واپس کیا تو ہوا کے جھونکے سے دور چلا گیا۔

(۲) اسطرف ایک بدمعاش بیٹھا تھا اسنے اسے دیکھتے ہی نوٹ کا پیچھا کیا اور اسکا تعاقب ہیری نے کیا تاکہ نوٹ بدمعاش کے ہاتھ جانے نہ پائے۔

(۳) ایک خوفناک بیل نے ہیری کا پیچھا کیا اس حالت میں کہ وہ بدمعاش کے پیچھے تھا۔

(۴) راستے میں ایک لالٹین تھی۔ ہیری اس پر چڑھ گیا۔ اور نوٹ اسکے پاس ہی زمین پر گرا پڑا تھا۔ بدمعاش اسے اٹھانے کے لئے جھکا۔

(۵) لیکن وہ اسے نہیں اٹھا سکا کیونکہ بیل اسطرح تیز اور اندھا دھند جا رہا تھا کہ اسنے لالٹین کو زور سے ٹکر ماری کہ اسے ایسا موڑ دیا جیسے کھا گیا ہے اور

(۶) بدمعاش تو وہیں گر گیا اور بیل نے ٹکر مارنے سے اپنا سر پھوڑ لیا اور واپس بھاگ گیا۔ اس پر ہیری نے اپنی دولت زمین پر سے اٹھا لی۔

نظم

ایک عرب کی بے نظیر بہادری

(محترمہ قمر بنت سید ابو حمزہ الحسنی بھوپالی)

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں (اقبال) بجلیاں برسے ہوئے بادل میں ہی خوابیدہ ہیں

اے جوان نیک خو اے محترم ہیرو عرب
عالم انسانیت کو باعث تزئین ہے
جوش بے پایاں نے آخر کار یہ لکھوا دیا
ایشیا کی آتش افشانی قیامت خیز تھی
تھی صدائے نفسی نفسی الامان والحذر
نعرہ تکبیر سے ساری فضا تھرا گئی؛
آگ کے شعلوں میں گھس کر جواں مردی کمال
خود ہوا خطروں سے تو دو چار اوروں کے لئے
وہ اولوالعزمی تیری اور بے نظیر ایثار ہے
اپنی زنجیر انگاروں کے مانند تھی جو لال
ایک طرف آتش نے کی تھی شعلہ باری اختیار
سب کو تھا کامل یقیں اب موت ہی تیری قریب
عورتوں، بچوں، ضعیفوں کو کندھوں پر بٹھا
پانچ گھنٹے تک مسلسل شعلہ در آغوش تھا
زخم کھا کھا کر رہا پروانہ کی کچھ جان کی
دیکھ کر تجھ کو سلامت پھر یہ افسر نے کہا
آب زر سے کارنامہ تیرا لکھا جائے گا؛
درحقیقت تو فروغ ہیرو ہے تو رشک ہے عرب
احتراماً ٹوپیاں دیتے ہیں ہم اپنی اتار؛

جس قدر تحسین تیری کیجئے وہ کم ہے اب
کارنامہ تیرا مستغنی عن تحسین ہے
مجھ سا ناکارہ تیری تعریف میں ہو لب کشا
پر تیری جرات قیامت پر چمک رہی تھی
بے کسوں کے واسطے باقی نہ تھی جائے مفر
بے نظیر ایثار سے دنیا میں حیرت چھا گئی،
تیرے عزم آہنی پر آفریں اے خوش خصال
بے کسوں کی دستگیری اور اعانت کیلئے
مثل ابراہیم تجھ پر آگ بھی گلزار ہے
تو نے پکڑا دست قوت سے اسے اے باکمال
دوسری جانب تیرا عزم قوی با صد وقار
اور خدا نے کی حیات جاوداں تجھ کو نصیب
تو نے کی تکمیل ہمدردی انساں سر بسر
کام میں مصروف تھا اور منہ سے تو خاموش تھا
لاج رکھ لی تو نے عربوں کی گذشتہ شان کی
پیٹھ تیری ٹھونک کر اے نوجواں صد مرحبا
نام تیرا ہسٹری میں تا ابد رہ جائے گا
اس لئے مجبور ہیں کرنے کو ہم تیرا ادب
تیرے استقلال پر قربان ہو گنج شاہوار

تجھ پہ عبداللہ بجا ہے جو عرب کو ناز ہے۔
کیا سانحہ کا نسے بڑا اسے تجھ کو یہ اعزاز ہے

(ایڈیٹر:۔ سعید انصاری۔ طابع و ناشر:۔ ڈاکٹر عابد حسین۔ پی ایچ ڈی (برلن)   (مطبوعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ پریس دہلی)

جرمنی کی حیرت انگیز طبی ایجاد

جس پر پیرس کی طبی نمایش میں تمغہ عطا ہوا

طلبہ اور ذہنی کام کرنے والوں کے لئے نعمت۔

اعصاب کو تقویت پہنچانے کی بہترین دوا۔

ذہنی کام سے آپ تھک جاتے ہوں۔ مزاج میں چڑچڑاپن آگیا ہو۔

عام کمزوری ہو تو یہ گولیاں استعمال کیجئے۔

جرمنی کے مشہور طبی رسالہ Deutsche Ärzte Zeitung

نے اسے عصابی کمزوری کی بہترین دوا قرار دیا ہے۔

OKASA

مردوں کے لئے۔ روپہلی گولیاں ۱۰۰ گولیوں کی ڈبیہ عـہ/

عورتوں کے لئے۔ سنہری گولیاں ۱۰۰ " " عـہ/

ملنے کا پتہ:- **اوکاسا ایجنسی سول لائن علیگڑھ**

رجسٹرڈ ایل
۱۸۷۱
پیام تعلیم
جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
پندرہ روزہ تعلیمی رسالہ
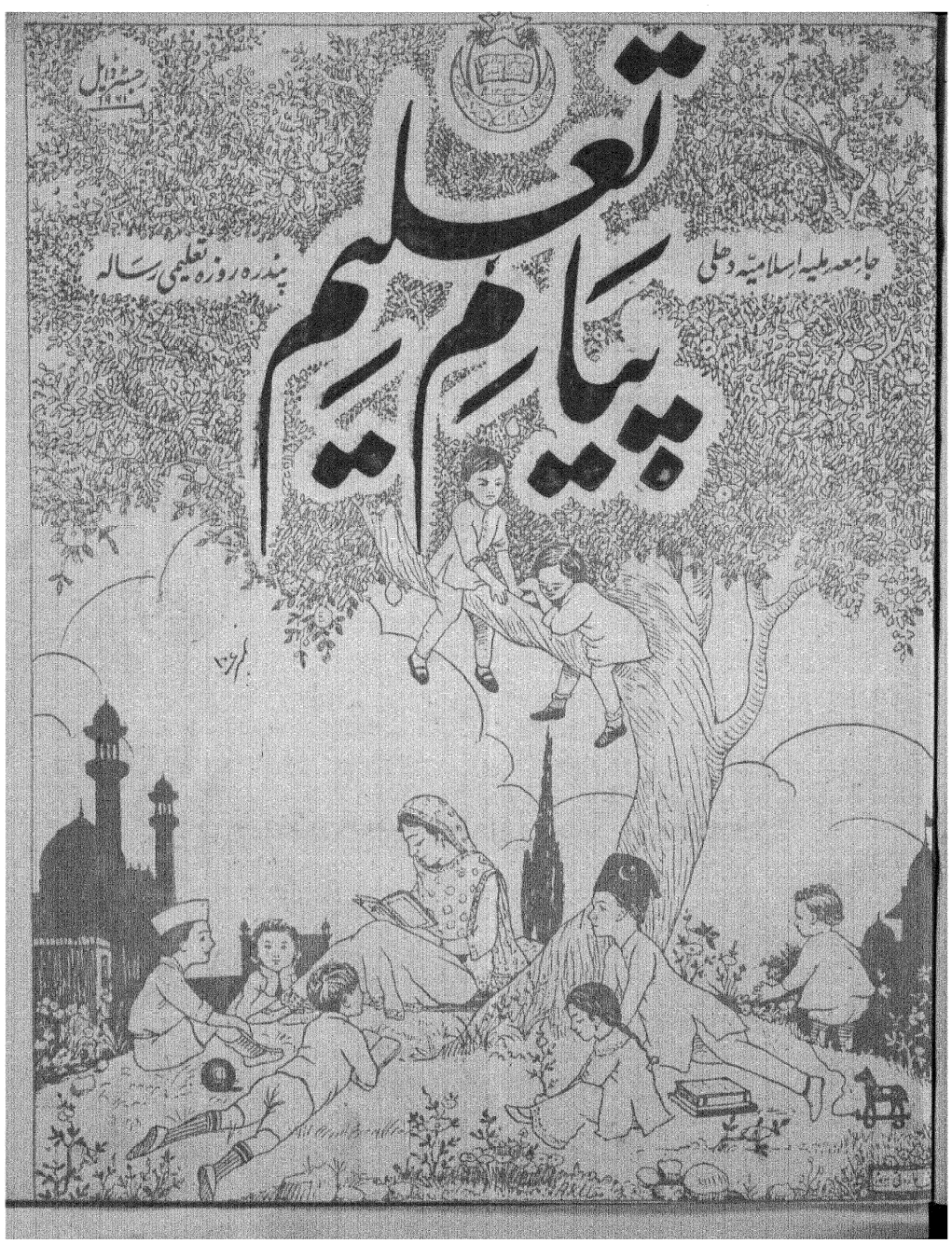
ہمارا سامان کھیل اپنی عمدگی مضبوطی اور

نسبتاً ارزانی قیمت کی وجہ سے لاثانی ثابت ہو چکا ہے

جوں جوں شایقین کھیل کلبوں کے سیکرٹری اور اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر صاحبان اس کو بطور آزمایش منگاتے ہیں اس کی عمدگی مضبوطی اور خوبصورتی کو دیکھ کر شیدا ہو جاتے ہیں۔ جہاں کہیں ہمارا سامان کھیل ایک مرتبہ بھی بطور آزمائش کے منگایا گیا۔ انہوں نے روزمرہ کی پریکٹس اور مقابلہ کے میچوں میں حسب خواہش عمدہ اور مضبوط پاکر عمدہ عمدہ سرٹیفکیٹ دینے اور اپنے بڑے بڑے قیمتی آرڈروں سے مستفید فرماتے اور خود مستقل گاہک بننے کیلئے کمپنی کے مجسم اشتہار بن گئے

گر آپ نے ابھی تک ہمارے سامان کھیل کی آزمائش نہیں کی تو ایک مرتبہ ضرور اپنا آزمائشی آرڈر روانہ کرکے ہمارے مندرجہ بالا الفاظ کی صداقت کا امتحان کریں۔ پھر ہمارے مستقل گاہک نہ بنجائیں تو کہنا۔

ہماری گارنٹی یعنی ذمہ داری

جو سامان کھیل آپ ہم سے طلب فرماوینگے اُس کی عمدگی اور مضبوطی کے ذمہ دار ہم ہیں

اگر وہ رسید گی پر ناپسند ہو تو ۲۴ گھنٹہ کے اندر واپس کرکے اپنی قیمت واپس منگالیں۔ اور اگر کھیل میں ہمارا اپنا تیار کردہ سامان کھیل جلد ناکارہ ہو جائے جس سے ثابت ہو کہ خرچ کردہ رقم حرام ہوئی۔ تو حلفیہ تحریر نے پر دوسری چیز مفت روانہ ہوگی۔ اس وعدے سے صاف ظاہر ہے کہ ہم کبھی کسی کو بُرا سامان روانہ نہیں کریں گے کیونکہ ہم اپنے کام کو شہرت دینا چاہتے ہیں نہ کہ اپنی شہرت محنت اور روپیہ کو برباد کرنا۔

ذیل میں فہرست سامان کھیل درج ہے جس پر فی روپیہ ۲ عایت دیجاویگی حسب ضرورت طلب کریں

فہرست سامان ہاکی

دی منارک ۳ ربڑ سپرنگ ہینڈل ہاکی اوپر کا پوری چمڑا لپیٹا ہوا نہایت خوبصورت اور مضبوط قیمت عہ
دی میجسٹک ڈبل اسپرنگ ہینڈل اور اُتا چمڑا لپیٹا ہوا نہایت مضبوط اور خوبصورت قیمت فی ہاکی ۵ ر
دی مارشل ڈبل سپرنگ ہینڈل ہاکی اوپر سن پروف رنگ کا ولایتی دھاگا لپٹا ہوا مضبوط اور خوبصورت للعہ
دی مارلین سنگل اسپرنگ ٹوائین وڈ ہینڈل ہاکی قیمت (للعہ) دی میجر آل کین ہینڈل اوپر سیاہ ولایتی دھاگا (للعہ) دی سپیشل پریکٹس ڈنڈا ہاکی اوپر چمڑا لپٹا ہوا قیمت صرف ۱ے
چھوٹے بچوں کی ہاکیاں مارین قیمت عا پریکٹس ۱ے
ہاکی بال منارک ۳ سپیشل پریکٹس قیمت (۲ ے)

فہرست سامان کرکٹ

دی کنگ نیس ربڑ اسپرنگ ہینڈل کرکٹ بیٹ اوپر آلنا مضبوط چمڑا لپیٹا ہوا نہایت مضبوط ۱۲ے
دی مارشل ڈبل سپرنگ بید بوند ہینڈل بیٹ رعہ
دی سپر سنگل اسپرنگ ٹوائین بونڈ ہینڈل بیٹ ۷ے
دی سپیشل پریکٹس آل کین ہینڈل روزانہ پریکٹس کیلئے ۳ے
چھوٹے بچوں کے کرکٹ بیٹ ۲ے ۲ے ۳ے ۳ے سے
کرکٹ بال دی منارک ۲ے میچ عا سپیشل پریکٹس عہ لیگ گارڈ چمڑہ کے رنگدار بنے رزین کے عہ فی جوڑ بیٹنگ گلوز عہ وکٹ گلوز بڑھیا قیمت ۳ے ملکے قیمت للعہ فی جوڑ۔ وکٹ دی مارشل بڑی قیمت عہ چھوٹی ۲ے فی سٹ معہ بیلز۔ ربڑ ہینڈل کور قیمت رعہ
چھوٹے بال قیمت عہ رسی گودہ ۱۶ پونڈ للعہ

فہرست سامان فٹ بال

دی منارک ۸ ٹکڑوں کا درجہ اول نہایت مضبوط اور خوبصورت فٹ بال منہ ایک ٹکڑہ میں قیمت مکمل ۵ قیمت ۱عہ
دی میجسٹک تیرہ ٹکڑہ کا منہ ایک ٹکڑہ میں ۵ عہ
دی میجر سادہ مگر نہایت مضبوط منہ ایک ٹکڑہ میں ۵ے
دی میجر سبز تندے والا بچوں کے لئے ۴ے
دی اسپیشل پریکٹس روزانہ پریکٹس کے لئے مضبوط ۵ عہ
چھوٹے بچوں کے لئے میجسٹک فٹ بال ۳ صہ ۲ للعہ
۲ے بلیڈر سرخ نانہ بال ۵ عہ ۳ عہ ۲ عہ ۲ے
۴ اور ۱۲ اپچکاری بڑی قیمت سے، درمیانہ قیمت عا چھوٹی قیمت عہ
سلوشن ۲ ۸ رسیتی رعہ
قواعد فٹ بال قیمت (۱۶ ر)

فہرست سامان والی بال

ملک والی بال گلدستہ رنگ برنگی ٹکڑوں کا نہایت خوبصورت اور مضبوط منہ ایک ٹکڑہ میں مکمل ۵ قیمت ۷ے
دی منارک والی بال گلدستہ قسم دوم مکمل ۵ قیمت ۶ے
چھوٹے بچوں کے والی بال ۳ مکمل ۵ ۳ے فالتو بلیڈر برنے والی بال ۵ عہ ۳ عہ ۳ عہ
دی ملک والی بال جال براؤن رنگ اچھا قسم معہ سوتی ڈوری کے قیمت ۵ے سے ہے للعہ
دی منارک سفید بڑھیا جال قیمت عہ بلکہ للعہ ہے والی بال پولز فیروزی رنگ کے سنہری شاموں والے ولایتی پالش شدہ معہ رسوں اور منگلی کے قیمت بارہ روپے (عہ) کتاب قواعد والی بال اردو ۲ ر
کتاب قواعد والی بال انگریزی با تصویر ۱۲۰ ر

سامان بذریعہ وی پی پارسلوں کے ارسال ہوگا خرچ ڈاک پارسل اور کرایہ وغیرہ ہر حالت میں بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ **جنرل مینیجر ملک اینڈ کمپنی رجسٹرڈ شہر سیالکوٹ**

تار کا پتہ رجسٹری شدہ۔ ہمنٹ۔ Malik

جملہ دانستوں میں ہر ایک چیز کے ساتھ اسکی قیمت مطابق اشتہار لکھنی چاہئے۔ **قیمت پیام تعلیم سالانہ ع اششماہی عہ فی پرچہ ۱ ر**

درسگاہوں میں ہڑتال

اور اس کا اصلی سبب

(اڈیٹر)

ملوں میں اسٹرائک، کارخانوں میں اسٹرائک ریلوے میں اسٹرائک سنتے آئے ہیں۔ اب کچھ دنوں سے درسگاہوں میں بھی اسٹرائک سننے میں آرہا ہے۔ مشین چلانے کی ہڑتال، کوئلہ جھونکنے کی ہڑتال، کام کرنے کی ہڑتال تو اب تک سمجھ میں آنے والی باتیں تھیں لیکن ادھر کچھ عرصہ سے بھوک ہڑتال اور تعلیم ہڑتال بھی ہونے لگی ہے۔ اب گھروں میں اسٹرائک مسجدوں اور مندروں میں اسٹرائک، گرجاؤں اور کلیساؤں میں اسٹرائک ہونے کو باقی ہے۔ وہ بھی کچھ دنوں بعد سننے میں آنے لگیگا اور ہم دیکھیں گے کہ بیٹوں نے باپ کے خلاف ہڑتال کر دی مصلیوں نے امام کے خلاف، پجاریوں نے پروہتوں کے خلاف اور گرجا جانیوالوں نے پادریوں کے خلاف ہڑتال کر دی۔

بہرحال اسٹرائک اور ہڑتال کی ابتدا پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اصل میں ملوں اور خودسر مالکان کارخانہ کے خلاف بے بس اور لاچار مزدوروں اور کام کرنے والوں کے احتجاج اور ناراضگی کے اظہار کا ایک ممکن اور موثر طریقہ تھا۔ انھوں نے جب کبھی اپنے آقاؤں کی طرف سے بے توجہی اور بے پروائی دیکھی، اپنے مطالبات کے منوانے کا اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا علاج نہ سمجھا کہ کام بند کر دیں تاکہ اس سے ان کے کانوں پر کچھ جوں تو رینگے، حالانکہ اس میں فوری اور زیادہ نقصان خود ان کام کرنیوالوں اور مزدوروں ہی کا ہوتا ہے۔ یہ دراصل آبرو باختہ، آقا و مزدور کے درمیان خرابیوں کی اصلاح اور ناگوار حالات کو خوشگوار صورت میں تبدیل کرنے کا ایک موثر اور کارگر حربہ تھا۔ لیکن یہی حالت جب زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی نظر آنے لگی تو قدرتاً وہی طریقہ بھی اختیار کیا جانے لگا، جو اول الذکر شعبہ کے لئے موثر سمجھا جاتا تھا مدرسوں اور اسکولوں کالجوں اور دار العلوموں میں جب اراکین اور منتظمین نے وہی غفلت اور بے پروائی، وہی مغایرت اور بے تعلقی کا اظہار کرنا شروع کیا، تو لامحالہ ماتحتوں کو وہی حربے بھی ہاتھ میں لینا پڑے جو کارکنوں اور مزدوروں نے اپنے لئے ایجاد کئے تھے۔ غرض اس طرح یہ چیز کارخانوں اور ملوں سے نکل کر کالجوں اور دار العلوموں کی چہار دیواری میں پہنچی اور ابھی دیکھیے یہاں سے اور کہاں کہاں جاتی ہے!

گزشتہ کچھ عرصہ سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان اعلیٰ درسگاہوں میں بھی جہاں کے منتظمین خود اسی مذہب و قوم سے تعلق رکھتے ہیں، یہ وبا کثرت سے پھیل رہی ہے۔ اب سے کوئی دو سال ہوئے مسلمانوں کی سب سے قدیم اور سب سے بڑی مذہبی درس گاہ دار العلوم دیوبند میں نہایت زور و شور کے ساتھ اسٹرائک ہوا۔ اس کے بعد ابھی تھوڑا عرصہ گزرا، دار العلوم ندوہ میں منتظمین اور طلباء میں ایسی ہی کشمکش پیدا ہوئی اور اب آج کل مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم (نور اللہ مرقدہٗ) کی ایک بڑی یادگار طبی کالج دہلی میں ہڑتال جاری ہے۔ ہم چھوٹے چھوٹے اسکولوں اور مدرسوں کی اسٹرائکوں کا ذکر کرنا نہیں چاہتے اور نہ ہم علیگڈھ کالج اور ندوہ کے ان اسٹرائکوں کا ذکر کرنا نہیں چاہتے جن کو ایک زمانہ گذر گیا ہم نے صرف مسلمانوں کی چند چوٹی کی درسگاہیں لی ہیں اور ان کے بھی حال کے واقعات سے نتائج اخذ کرنا چاہتے ہیں۔ زیادہ تفصیل میں نہ پڑیئے، صرف موٹی موٹی باتوں کو دیکھیے کہ اسٹرائک کرنے والوں اور ہڑتالیوں کی کیا کیا شکایتیں ہوتی ہیں؟ کہاں تک، وہ اپنی ان شکایات میں حق بجانب ہوتے ہیں؟ اور ان کا اصل علاج کیا ہے؟

سب سے پہلے دیوبند کو لیجئے۔ ہڑتالیوں کی سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ منتظم صاحب نے دار العلوم کو اپنی ملک بنا رکھا ہے اور اس کے انتظامات میں کسی دوسرے کے رائے و مشورہ کو سننا نہیں چاہتے طلبہ اور اساتذہ کی کوئی آواز نہیں۔ دار العلوم کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں۔

اس کے بعد ندوہ کے گذشتہ تازہ واقعہ کو لیجئے۔ لڑکوں کا مطالبہ یہ تھا کہ ناظم صاحب نے اپنے اختیارات سے بے جا کام لیا اور ان کی جائز شکایات کی پرواہ نہ کی۔ طبی کالج کے اساتذہ و طلبہ کی شکایت یہ ہے کہ جوائنٹ سکریٹری صاحب کا طرزِ عمل نہایت توہین آمیز ہے اور انھیں انکی خواہشات اور شکایات کی کچھ پرواہ نہیں۔ ان سب شکایات میں دیکھ جایئے بے پروائی اور بے توجہی کی وہی روح کارفرما ہے جو تاجروں اور مالکان کارخانہ میں مزدوروں اور کارکنوں کے خلاف ہوتی ہے! کالجوں اور دارالعلوموں کے ارباب حل و عقد اور ان کے منتظمین کی طرف سے اسی طرزِ عمل اور سلوک کا اظہار ہوتا ہے جو کسی بڑے کارخانہ دار یا فرم کے مالک کا اپنے ماتحت کاریگروں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ طلبہ ہوں یا اساتذہ، انکی شکایات اور ان کے مطالبات کی نوعیت سے خود یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی حیثیت ان درسگاہوں اور دارالعلوموں میں معمولی مزدوروں اور کاریگروں سے زیادہ نہیں ہے۔ ان کا بڑے سے بڑا مطالبہ بھی یہ ہوتا ہے کہ فلاں ناظم صاحب برطرف کر دیئے جائیں، فلاں سکریٹری صاحب کی بجائے دوسرے سکریٹری صاحب ہوجائیں مجلس انتظامیہ کے اراکین میں فلاں فلاں کی بجائے دوسرے لوگ رکھے جائیں۔ ہمیں نہ منتظمین اور کارکنان کے طرزِ عمل سے شکایت ہے اور نہ طلبہ و اساتذہ کے اس قسم کے مطالبات سے ہمدردی! ہمیں تو نفس اس نظام اور اساس سے بحث ہے جس کے ماتحت آج کل بالعموم درسگاہیں اور تعلیمگاہیں ہوا کرتی ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب کہ ہندوستان میں تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ ایک گرو ہوتے تھے اور ان کے گرد چیلوں کی ایک جماعت ہوا کرتی تھی۔ گروجی چیلوں کو اپنی اولاد کی برابر سمجھتے تھے اور چیلے بھی گروجی کو اپنے پتا یا باپ سے بڑھ کر مانتے تھے گروجی اپنے چیلوں کو نہ صرف تعلیم کے مخصوص گھنٹوں میں تعلیم دیتے تھے بلکہ انکا اٹھنا بیٹھنا سب چیلوں کے لئے سکشا اور تعلیم کا کام دیتا تھا۔ گروجی کے لئے اس تعلیم کا معاوضہ چیلوں کی پُرخلوص خدمت ہوتی تھی، یا بہت کچھ کسی نے لاکر اگر دیا تو وہ جنس کی صورت میں ہوتا تھا اسی طرح اسلام کے اوائل زمانہ میں بھی ایک اُستاد کی ذات ہوتی تھی جو شمع علم کے پروانوں کے لئے مقناطیس کا اثر رکھتی تھی۔ اُستاد اپنے شاگردوں کے لئے تعلیم و ارشاد کا زندہ نمونہ ہوتا تھا۔ اس کا ہر ہر فعل، اس کا ایک ایک تلامذہ کے لئے علم و عرفان کا خزینہ ہوتا تھا۔ شاگردوں سے اس علمی خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا تھا، اس لئے کہ علم "زیبِ پرورِ دین" دین سمجھا تھا نہ کہ برائے "دنیا خوردن"۔ یہ ایک دینی خدمت سمجھی جاتی تھی جس کا اصل اجر و صلہ عنداللہ خیال کیا جاتا تھا۔

اسلام اور ہندوستان دونو کے قدیم نظاماتِ تعلیم میں جنکا ایک ہلکا سا خاکہ اوپر پیش کیا گیا ہے، آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اُستاد اور شاگرد، گرو اور چیلے کے علاوہ کہیں تیسری جماعت کا وجود نظر نہیں آتا۔ اور تعلیم و تعلم اور درس و تدریس کے شغلہ میں کہیں لین دین اور سودا سلف کا جذبہ کام نہیں آتا۔ درسگاہیں اور پاٹھ شالے منڈی یا دکان نہیں ہوتے تھے، جہاں نہ علم کی گرانبہا جنس سیم و زر کے عوض بکتی ہو۔ نہ وہاں کوئی دکاندار یا ایجنٹ درمیان میں ایسا ہوتا تھا جو ایک سے یہ جنس گراں ارزاں لیکر دوسرے تک پہنچاتا ہو۔ ایک وہ دریا ساگر، یا ایک سرچشمۂ علم ہوتا تھا جس سے امیر و غریب، شاہ و گدا سب یکساں سیراب ہوتے تھے۔

لیکن آج کیا ہے؟ ایک طرف طلبہ کی جماعت ہے، دوسری جانب اساتذہ ہیں اور ان کے درمیان میں ایک منتظمین اور ارکان کا طبقہ ہے جسے درس و تدریس سے کوئی تعلق نہیں بلکہ جس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ علوم و فنون کی ایک دکان لگا کر بیٹھے اور اس نقد سودے کو ایک ہاتھ سے لیکر دوسرے ہاتھ بیچنے کا انتظام رکھے۔ بحمد اللہ کہ جامعہ نے یہ گُر ایک حد تک پالیا ہے اور اس کے ہاں اساتذہ و طلبہ کے بیچ میں کوئی تیسری جماعت نہیں ہے جو ان کو جدا رکھے۔ جامعہ ملیہ اپنی حقیر تعلیمی کوششوں کے ساتھ ایک اس بڑے اور اہم تعلیمی تجربہ کو بھی ملک کے سامنے پیش کر رہی ہے۔ اس کے ہاں کی فضا اساتذہ و طلبہ کی کشمکش یا آجر و مزدور کے جھگڑوں سے بالکل پاک ہے اس کے اساتذہ خود ہی آجر بھی ہیں اور خود ہی مزدور بھی۔ اس کے طالب علموں اور اُستادوں میں ایک بڑی حد تک قدیم ہندوستانی اور اسلامی نظامِ تعلیم کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ کاش ملک کی اور بالخصوص مسلمانوں کی دوسری درسگاہیں اس اصول کو سمجھتیں تو آج ان کی راہ میں یہ دشواریاں حائل نہ ہوتیں۔

اُستاد اور والدین کا صفحہ

اُردو لکھنا

(ماسٹر شفیع الدین صاحب نیّر)

لکھنے کی اہمیت بیان کرکے میں آپ کا زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا اپنے خیالات و افکار کا دوسروں تک پہنچانے اور ظاہر کرنے کا یہ ایک نہایت مفید اور کارآمد ذریعہ ہے۔ اگرچہ تقریر بھی اس ضمن میں معین ہوسکتی ہے مگر اس کا اثر محدود ہے صرف سامعین تک۔ لیکن تحریر ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے متقدمین علماء و فضلا کے خیالات۔ موجدین اور مخترعین کی ایجادات کا حال۔ اور عاقل اور دانا حضرات کے منصوبے ہم تک پہنچے ہیں۔ اور یہ سلسلہ نہ معلوم کب تک جاری رہیگا جس طرح ہم نے مرحوم بزرگوں کی تصانیف و تالیفات سے فائدہ اُٹھایا ہے اُسی طرح ہمارا بھی فرض ہے کہ آیندہ نسلوں کے لئے ایسی یادگاریں چھوڑ جائیں جو دنیائی موجودہ اور آیندہ زمانہ کی مصیبت ناک کشمکش میں اُن کی مدد کرسکیں۔ تعلیم اور تجارت کے شعبہ میں تو اسکی لحہ بہ لحہ کی ضروریات سے سب ہی کو اتفاق ہوگا۔ مگر میرے خیال میں تو کوئی بھی کامیاب شعبۂ زندگی ایسا نہیں جس میں بغیر لکھنا جاننے کے کام چل جائے۔

بس جس طرح عام زبان کے جاننے والوں کو لکھنا ضروری ہے اسی طرح اردو لکھنے والوں کو اردو لکھنا ضروری ہے

دوسرے یوں تو انگریزی اور ہندی زبانوں کے لکھنے میں بھی قوت مشاہدہ (Power of observation) کو ترقی اور ہاتھ اور آنکھ کی تربیت Training ہوتی ہے۔ کیونکہ طلبا حروف اور اُن کی ترکیبوں کو دیکھتے ہیں۔ اُن کو یاد رکھنے کی وجہ سے [illegible] قوت حافظہ میں بھی مدد ملتی ہے۔ اس کے علاوہ بچے میں توجہ کرنیکا مادہ پڑھنے سے زیادہ لکھنے کے ذریعہ پیدا ہوسکتا ہے۔ مقابلہ اور فرق دیکھنے سے ایک دوسرے کی صحت کو تسلیم کرنیکا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ خوبصورتی کا مذاق بڑھتا ہے اور صحت اور صفائی اور احتیاط کی طبیعت ابتدا ہی سے عادی ہوجاتی ہے۔ جس سے اخلاق پر بھی اثر پڑتا ہے۔

یہ سب مقصد اردو تحریر میں نسبتاً زیادہ حاصل ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں اس زبان میں فقط حروف تہجی سیکھ کر طالب علم لکھنا نہیں جان سکتا۔ بلکہ طرح طرح سے حروف کو ترکیب دیکر الفاظ بنانے پڑتے ہیں مسٹر بیکن کا قول ہے کہ Writing maketh a man [illegible] اور پُرانے زمانے میں تو کسی درسگاہ کے طلبا کا خط اچھا ہونا اُس کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔

اردو تحریر کی جانب سب سے زیادہ اس لئے بھی توجہ کرنیکی ضرورت ہے کہ اس زبان کا ابھی تک ٹائپ ایجاد نہیں ہوا۔ اور عام طور پر مدرسوں کے طلبا کے خط کی شکایت سننے میں آتی ہے۔

اب اگر میں لکھنے کے مدارج قائم کرنا چاہوں تو وہ میرے خیال میں تین ہیں۔ اوّل معمولی لکھنا جو پڑھنے میں آسکے۔ دوسرے خوشخط لکھنا تیسرے خوشنویسی۔ لیکن خوشنویسی چونکہ ایک مستقل فن ہے اس واسطے اس بات کی توقع قائم کرنا بیجا ہے کہ طلبا اُس درجے تک پہنچ سکیں۔ رہا خوشخط لکھنا سو میرے خیال میں اگر اُستاد اس فن سے واقف ہو۔ اور مناسب مقدار وقت بھی اُس کے لئے مہیا کیا گیا ہو۔ تو اس مقصد کے حصول کی جانب رہنمائی کرنا اُس کا فرض ہے

اس مقصد کے حاصل کرنے میں اُستاد کا زیادہ تر کام نگرانی اور پوری توجہ کے ساتھ ابتدا میں غلط روش پر چلنے سے طالب علم کو روکدینا ہے۔ شروع ہی سے کششوں، دائروں، اور حروف کی کشش و کرسی کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اس وقت جو طریقہ رائج ہے اُس میں اگر ضرورت ہو تو ترمیم میں کچھ مضائقہ نہیں۔ جو مقصد اُستاد کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے وہ ابتدا میں یہ ہو کہ کتاب کی عام عبارت طلبا صحت و صفائی کے ساتھ لکھ لیں۔ الفاظ کی دروبست اور ترتیب کا خیال رہے اور باوجود زودنویسی کے اُنکی تحریر عام طور پر خوشخط ہو۔ (بقیہ برصفحہ ۶ کالم ۱)

کوائف جامعہ

(از کوائف نگار)

دہلی میں ملیریا کا زمانہ بحمد اللہ کہ اب ختم ہوگیا ہے۔ تمام لڑکے اور اساتذہ جو بیمار تھے، وہ سب تقریبًا اچھے ہوگئے ہیں۔ نومبر کے شروع سے انشاء اللہ نہایت اچھا موسم ہوجائیگا اس وقت ہر شخص کی صحت اچھی رہیگی اور اس کی تلافی مافات ہوجائیگی۔

جناب شیخ الجامعہ صاحب ابھی تک حیدر آباد سے واپس تشریف نہیں لائے ہیں، غالبًا ۲۵ر اکتوبر کے بعد آجائیں گے اور امید غالب ہے کہ گل بداماں لوٹیں گے۔

جناب کریم اللہ صاحب جو ہماری جامعہ میں سائنس کے اُستاد تھے، آئندہ دسمبر میں اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ جارہے ہیں۔ آپ اس ماہ کے آخر میں سفر کی ضروری تیاریوں کی غرض سے مکان تشریف لے جارہے ہیں اور آخر ماہ دسمبر میں نیویارک روانہ ہوجائیں گے۔

"مضمون باوجود انتہائی اختصار کے اس قدر بڑھ گیا ہے کہ تفصیلات میں پڑنے کو جی نہیں چاہتا: اسی واسطے اردو پڑھنا اور لکھنا سکھانے کے عام اصول پر اس وقت میں اپنے ناچیز خیالات آپ حضرات کے سامنے پیش کئے ہیں۔ اُمید ہے کہ آپ کے مفید مشورے میری غلطیوں کو درست کریں گے تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بچوں کی تعلیم کا جو بار مجھ جیسے نااہل کے کندھوں پر ڈالا گیا ہے اُس کو باحسن وجوہ انجام دیکر اپنے فرائض کی ادائیگی میں کامیاب ہوسکوں۔ اگر آپ کی حوصلہ افزائی ہوئی تو انشاء اللہ آئندہ پھر خود اردو اعلیٰ تعلیم اور دیگر تعلیمی مسائل پر اپنے حقیر خیالات پیش کرونگا۔ اب آپ سے سمع خراشی کے لئے معذرت خواہ ہوں اور آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے بظاہر نہایت خشک مضمون کو بغور سننے کی زحمت گوارا کی۔

کھیل کی خبریں

دہلی کا آل انڈیا کرکٹ ٹورنامنٹ بجائے ۱۹ر نومبر کے ۹ر نومبر سے شروع ہوگا۔ اس کے سب انتظامات مکمل ہوگئے ہیں۔ جملہ ٹیمیں داخل ہوچکی ہیں یعنی بمبئی، کاٹھیاواڑ، راجپوتانہ، کراچی، پنجاب اور دہلی۔ ان میچوں کے علاوہ ایک نمائشی میچ بھی ہوگا جس میں ایک طرف تو سب ٹیموں کے منتخب کھلاڑی ہوں گے اور دوسری طرف مہاراجہ وزیانگرم کی ٹیم ہوگی جس میں ہابس اور سٹکلف جیسے مشہور کھلاڑی ہوں گے۔

اسٹریلیا کی کرکٹ ٹیم کے سات کھلاڑی انگلستان سے گذشتہ ہفتہ کو اسٹریلیا روانہ ہوگئے۔ وکٹوریہ اسٹیشن پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہیڈ مین کے اسٹیشن میں داخل ہونے کے وقت لوگوں نے اس کا پرجوش استقبال کیا۔ جب گاڑی روانہ ہوئی تو تماشائیوں نے تالیوں سے سر پر آسمان اُٹھالیا۔

آسٹریلیا کی ٹیم ہفتہ کے دن کولمبو پہنچیگی۔ جہاں ٹیم کا سرکاری طور سے استقبال کیا جائے گا۔ یہ ابھی طے نہیں ہوا کہ اس دن کا پروگرام کیا ہوگا۔

دہلی میں کرکٹ کا زمانہ شروع ہوگیا ہے۔ گذشتہ اتوار کو روشن آرا اور مشن کالج کا میچ ہوا جس میں مشن کالج نے روشن آرا کو چھ رن سے شکست دی۔

تاریخ
شیخ محمد عبدہٗ

از جناب غلام سرور صاحب

تباہی بغداد اور سقوط اندلس کے بعد مسلمانوں پر تیسرا نازک زمانہ انیسویں صدی کا گذرا ہے۔ یورپ کی بڑھتی ہوئی ہوس ملک گیری دولت ترکیہ کے حصے بخرے کر کے ان پر تسلط جما رہی تھی۔ ترکوں کا انحطاط حد سے گذر چکا تھا باب عالی اپنا اقتدار روز بروز کھو رہا تھا۔ ہندوستان کی اسلامی حکومت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو چکا تھا۔ افغانستان آپس کی خانہ جنگیوں سے انگریزی فوجوں کے پاؤں تلے روندا جا رہا تھا، ادھر ایران زندگی کے آخری سانس توڑ رہا تھا اور روس اور برطانیہ اپنی استعمار کی آنکھیں کھولے اس کی نزع کا انجام دیکھ رہے تھے۔ افریقہ کے ساحلی بلاد ترکی سے جبراً غصب کر کے یورپ نے اپنے تسلط میں کر لئے تھے۔ مصر کے خدیو خود اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر کھود چکے تھے اور قریب تھا کہ مصر اپنی رہی سہی آزادی یورپی سرمایہ کی نظر کر کے نکبت و ادبار کے گڑھے میں گرتا نظر آئے، ترکی سے یونان اور دوسرے یورپی مقبوضات چھن چکے تھے۔ دولت ترکیہ جو لے دے کے مسلمانوں کے پاس ایک اثاثہ باقی تھا۔ اور جسے اہل یورپ مریض یورپ کہتے تھے حالت نزع میں تھی اور ہر گھڑی نحوست و ادبار میں مزید اضافہ کرتی جاتی تھی

دنیائے اسلام کی یہ تو سیاسی حالت تھی۔ مذہبی حالت اور بھی ابتر تھی، علماء کا جمود اور کفر بازیاں مذہب کی بنیاد کو کھوکھلا کر چکی تھیں۔ بادشاہوں کے استبداد اور ظلم و جور کے خلاف اعلائے کلمۃ الحق علماء کے کفر و الحاد کے فتوؤں کا شکار ہوتا تھا۔ مذہب صرف تعصب اور بغض کا نام رہ گیا تھا جدید علوم و فنون اور فکر حریت خلاف اسلام سمجھے جاتے تھے علماء کے اس طرز عمل نے مسلمانوں کی مذہبی زندگی کو بیکار اور مذہب کے سوتے کو خشک کر دیا تھا۔

ممالک اسلام کو ان داخلی اور خارجی مصائب کے علاوہ تیسری ایک اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی سیاسی آزادی اور سلطنتیں معرض خطر تو تھیں ہی اب ان کا مذہب بھی معاندانہ حملوں کا نشانہ بن رہا تھا مغربی علم و حکمت کا سیلاب اسلامی روایات اور مذہب کو اپنے ساتھ بہا لے جانے کے درپے تھا اس مصیبت و نکبت کے دور میں وسط ایشیا کے گمنام حصے سے جمال الدین افغانی کا ظہور ہوتا ہے، اس باکمال شخصیت کو شیخ محمد عبدہٗ ایسا ہونہار شاگرد ملا۔ یہ کہنا کہ مسلمانان عالم کی موجودہ سیاسی علمی اور مذہبی بیداری ان دو باکمال ہستیوں کے وجود مسعود کی بڑی حد تک رہین منت ہے ذرا بھی مبالغہ نہیں۔

اس نامور استاد اور اس کے مایۂ ناز شاگرد نے دنیائے اسلام کو یورپ کے بڑھتے ہوئے خطرہ سے آگاہ کیا اور اگرچہ وقتی طور پر وہ اپنی مساعی میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن ان کے خیالات آج بھی فرزندان اسلام اور اہل شرق کے لئے راہ ہدایت کا کام دے رہے ہیں۔

شیخ محمد عبدہ ایک غریب گھرانے کے چشم و چراغ تھے آپ کے والدین اپنے تقوے اور دینداری میں اپنی بستی بھر میں مشہور تھے۔

والد نے عبدہ میں غیر معمولی ذہانت اور ذکاوت کے آثار پا کر انکو تعلیم دلانا چاہا لیکن ابتدا میں ان کو پڑھنے کی طرف زیادہ رغبت نہ ہوئی وہ اپنے اور بھائیوں کی طرح اپنے خاندانی پیشہ یعنی کاشتکاری کو پسند کرتے تھے لیکن والد کے اصرار سے مدرسہ کا سلسلہ جاری رہا کچھ عرصہ بعد طنطا کی جامع احمدی میں بھیج دیئے گئے۔ مگر وہاں پر طبیعت نہ لگی۔ آپ خود اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ کتابوں کے شرح اور شرح در شرح کے جھگڑے سے میری روح فنا ہوتی تھی۔ یہ طریقہ تعلیم اس قدر ناقص اور ثقیل تھا کہ طبیعت کی بیزاری نفرت کی حد تک پہنچ گئی، خدا خدا کر کے یہ زمانہ گذرا اور آپ ازہر میں پہنچے۔

شیخ عبدہ کو یہاں بھی انہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ علمائے ازہر اپنی لکیر کے فقیر تھے، نصاب تعلیم اور طرز تعلیم نہایت فرسودہ اور غیر مفید ان کی بلا خوف و خطر تنقید اور حریت رائے مشائخ ازہر کی نظروں میں کھٹکنے لگی

اس زمانہ میں ان کی ذہانت تقریر و تحریر کے جوہر دکھا رہی تھی اور ان کی ہستی ازہر میں خاص ممتاز تھی۔ بس پھر کیا تھا موصوف کو لوگوں نے اعتزال سے منسوب کرنا شروع کر دیا اسی زمانہ میں شیخ جمال الدین افغانی کا مصر میں ورود ہوا۔

اس باکمال شخص کی نگاہ مردم شناس نے عبدہ کو اپنے مناسب پایا اور عبدہ کو جس قسم کے استاد کی تلاش تھی وہ مل گیا۔ جمال الدین افغانی کی ذات والا اپنے اندر ایک کشش رکھتی تھی تھوڑے ہی عرصے میں ان کا مکان طلبہ کا اماجگاہ بن گیا۔ جمال الدین صرف سیاسی آدمی نہ تھے ان کی مذہبی معلومات غیر معمولی علمیت حکیمانہ غور و فکر اور فلسفیانہ استدلال نے جلد ہی طلبہ کی جماعت میں ان کو مقبول بنا دیا۔ یہ درس و تدریس کا سلسلہ تقریباً دس سال تک جاری رہا ازہر کے دوراز کار اور مہمل نصاب تعلیم کے مقابلہ میں شیخ جمال الدین نے طلبہ کو صحیح مذہب اور علوم و حکمت سے آگاہ کیا۔ علماء کا تعصب وجمود غور و فکر کی روشنی سے مبدل ہو رہا تھا کہ یہ ارشاد و ہدایت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ شیخ جمال الدین کی ساحرانہ شخصیت نے طلبہ میں غیر معمولی جوش عمل اور آزادی کی روح پھونک دی تھی طلبہ کی اس جماعت میں شیخ محمد عبدہٗ کی شخصیت خاص طور پر ممتاز تھی، یہ مختصر جماعت موجودہ انتشار و نکبت کے ساتھ مستقبل سے ناامید نہ تھی۔

ان لوگوں میں خدمت اسلام اور خدمت ملک کے جذبات پرورش پا رہے تھے اور ان کا حلقہ اثر دن بدن ترقی کر رہا تھا اور پوری توقع تھی کہ یہ جماعت ناخدا بن کر قوم کی کشتی کو ساحل امن پر لے جانے کی کوشش کریگی۔

مصر میں خدیو اسمٰعیل کا زمانہ تھا۔ اس نے کسی مصلحت سے شیخ جمال الدین کی اس تحریک کو روکنے کی کوشش نہ کی اس کے معزول ہوتے ہی فرانسیسی اور برطانوی قونصلوں نے جدید خدیو کو اس آنے والے خطرے سے آگاہ کیا اور اس کے تدارک پر مجبور کیا چنانچہ شیخ جمال الدین کو مصر سے اور شیخ محمد عبدہٗ کو قاہرہ سے جبراً نکال دیا گیا۔

اس زمانہ میں شیخ محمد عبدہٗ دار العلوم میں مدرس تھے، ان کو قاہرہ چھوڑنا بہت گراں گذرا طوعاً و کرہاً کچھ زمانہ اپنے وطن میں گذارا اور برابر حراست میں رہے۔ اسکے بعد وقائع مصریہ نامی اخبار کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت پیش آئی جو اسکی لغوی اغلاط کی تصحیح کرے ریاض پاشا وزیر اعظم نے شیخ محمد عبدہٗ کو اس کا اہل پاکر یہ خدمت سپرد کی آہستہ آہستہ وہ اخبار کے رئیس تحریر بنا دیئے گئے،

وقائع مصر سرکاری اخبار تھا شیخ عبدہٗ نے اس کے ذریعہ سے ملک و وطن کی پوری طرح خدمت کی وہ زیادہ تر اجتماعی مباحث پر قلم اٹھایا کرتے تھے۔ حکومت کے فرائض اور رعایا کے واجبات، ارشاد و ہدایت اصلاح اخلاق پر مضامین لکھتے۔ حکومت کی کمزوریوں اور بدانتظامیوں پر برملا تنقید کیجاتی ریاض پاشا کو شیخ موصوف پر پورا اعتماد تھا اسلئے مخالفین کی مخالفت کے باوجود انکو اپنے آزاد و خیالات کی تبلیغ میں کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ ان کے اس حسن کار اور اہلیت کی بنا پر ان کے ذمہ مطبوعات مصر کی نگرانی بھی کر دی گئی، شیخ محمد عبدہٗ ان خدمات کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے رہے تھے کہ عرابی پاشا کی وطنی تحریک نے مصر میں ایک جنگ کی صورت اختیار کر لی۔

شیخ عبدہٗ نے اس تحریک کی بہت حد تک دماغی رہنمائی کی، عرابی پاشا اور دوسرے زعماء ان کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے اس وطنی تحریک کا اصل مقصد مصر میں پارلیمنٹ قایم کرنیکا تھا۔ شیخ عبدہٗ مذہبی صلاح کے ساتھ ساتھ موجودہ دور استبداد اور مطلق العنانی کے سخت ترین دشمن تھے ان کے نزدیک مسلمان اسوقت قعر مذلت سے نہیں نکل سکتے جب تک کہ شخصی حکومت کا فیصلہ نہ ہو۔ چنانچہ شیخ موصوف کی شرکت اس قومی جنگ میں ضروری تھی۔

اس جنگ کا جو حشر ہوا اس کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں انگریز خدیو کے خودساختہ سرپرست اور مصر کے امن کے خدائی فوجدار بن کر مصر پر چڑھ دوڑے اور اپنی فوجیں اتار کر مصر پر قبضہ کر کے خدیو کو بحال کر دیا۔

شکست خوردہ زعماء کے ساتھ شیخ عبدہٗ پر بھی سختیاں کی گئیں اور ان پر مقدمہ چلا کر انہیں ملک بدر کر دیا گیا شروع میں شام میں درس و تدریس کرتے رہے، پھر شیخ جمال الدین کے پاس پیرس پہنچے۔ وہاں سے استاد و شاگرد نے اخبار العروۃ الوثقیٰ نکالا اس اخبار نے دنیائے اسلام میں وہی کام کیا جو ہندوستان میں مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال اور البلاغ نے سرانجام دیا تھا۔

باقی آئندہ

جُغرافیہ

نہر پناما

۱۴۹۲ء میں کرسٹو فر کولمبس نے جو کہ ایک مشہور جہازران تھا ایک نئی دنیا کا سراغ لگایا۔ جو کہ آج کل امریکہ کے نام سے مشہور ہے۔ گذشتہ چار سو سال کے اندر امریکہ نے حیرت انگیز ترقی کر لی ہے۔ مال و دولت و تجارت میں یورپ کے قریب قریب کے ہر ملک سے سبقت لے گیا ہے تجارت کو جب اتنا فروغ حاصل ہوا، تو جہازی بیڑوں کی تیاری عمل میں آئی اور جہازوں کے لئے ضرور تھا کہ تجارتی رستہ بھی ایسا ہونا چاہئے کہ جو دشوار گذار اور خطرناک نہ ہو اور اشیائے ضروریات انسانی آسانی سے ضرورتمند ممالک کو پہونچائی جاسکیں۔

اس وسیع براعظم کے قدرتاً دو حصے ہوگئے ہیں۔ ایک شمالی امریکہ اور دوسرا جنوبی امریکہ کہلاتا ہے شمالی امریکہ کا زیادہ حصہ منطقۂ معتدلہ میں واقع ہے جو کہ انسانی بود و باش کے لئے بہترین خطہ ہے۔ اور جنوبی امریکہ کا زیادہ تر حصہ منطقۂ حارہ میں واقع ہونے سے زیادہ مفید نہیں ہے۔ کیونکہ گرمی بہت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے شمالی امریکہ بہ نسبت جنوبی امریکہ کے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ دونوں براعظم ایک دوسرے سے ایک تنگ خاکنائے کے ذریعہ ملے ہوئے ہیں جو کہ خاکنائے پناما کہلاتی ہے۔

خاکنائے پناما بالکل پہاڑی زمین سے بنی ہے۔ اور ایک مقام پر صرف ۳۰ میل چوڑی ہے اس خاکنائے کے بیچ میں حائل ہو جانے سے جہازوں کو اگر یورپ سے یا افریقہ سے یا نیویارک سے سین فرانسسکو (San. fransisco.) واقع مغربی امریکہ کو جانا ہوتا تو پورے جنوبی امریکہ کا چکر لگا کر جاتے تھے۔ اور رستہ چار یا پانچ ہزار میل کا ہوتا تھا

ایک فرانسیسی کمپنی نے اس تکلیف کو محسوس کیا۔ اور خاکنائے پناما میں سے ہو کر ایک نہر کاٹنے کا ارادہ کیا۔ یہ رزولیوشن پاس ہوگیا لیکن خطہ استوا کے قریب ہونے سے گرمی اور سمندر کے قریب ہونے سے تری تھی۔ اور اس وجہ سے وہاں پر زہریلے مچھروں کی کثرت تھی۔ اور یہ مچھر کام کرنے والے مزدوروں کی ہلاکت کا باعث بنے۔

مزدوروں کی ہلاکت اور دیگر وجوہات کی بنا پر فرانسیسی کمپنی کو اپنے مقصد سے دست بردار ہونا پڑا۔ اور یہ مشہور ہوگیا کہ یہاں پر بہت بھوت پریت ہیں اور وہ مزدوروں کو کھا جاتے ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی تجارت عروج پر تھی اور یہ ملک دنیا کا سب سے زیادہ نفع دار حصہ ہونے کی وجہ سے دنیا میں سب سے زیادہ مالدار تھا اور اسی وجہ سے اب بھی ہے اس نے تجارت میں بہت ترقی کی اور امریکہ کی متحدہ ریاستیں تجارت میں یورپ کے ممالک سے بھی بڑھ گئیں اور اب اس کو بہت سے سیاسی معاملات بھی درپیش ہوئے، تو اس ملک کی توجہ بھی اس طرف مبذول ہوئی۔

حیرت انگیز اخبار

آج کل جو حیرت انگیز ترقیاں اور ایجادیں ہو رہی ہیں وہ اس سے پہلے کسی شخص کے خواب وخیال میں بھی نہ تھیں اور انہیں کو دیکھتے ہوئے خیال کیا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ ترقی اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ اسی کمزور ہستی نے جسے انسان کہا جاتا ہے، اپنی دماغی قوتوں کے ذریعہ سے سفر، سواری کے لئے یہاں تک کہ ایک نوکر کا کام بھی مشین سے لیا ہے۔

ایک مشہور مصنف نے لکھا ہے کہ "دنیا اب دن بدن آج کل کی ایجادوں کی ضرورتمند ہوتی جا رہی ہے"۔ اسی نے ایک دلچسپ کتاب حال ہی میں لکھی جسمیں چھاپہ خانوں اور اخباروں کی ترقی کا حال لکھا ہے، جو ہمیں اس بیسویں صدی میں دیو اور پریوں کی کہانیوں سے زیادہ تعجب خیز معلوم ہوتے ہیں۔ اس کتاب میں اخبار "نیوز آف دی ورلڈ" کا حال لکھا ہے۔ اس اخبار کی اشاعت تیس لاکھ ہے جو یقیناً دنیا کے کسی اخبار کی نہیں اس سے ایک صدی پہلے اخبار کی ایک سال کی اشاعت اتنی تھی جتنا کہ اب وہ ایک ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔ موٹر لاریوں اور ریل کے علاوہ اس اخبار کی ذاتی پندرہ ریل گاڑیاں ہیں جو ملک کے ہر حصہ میں "نیوز آف دی ورلڈ" پہنچاتی ہیں۔

اگرچہ اس اخبار کے پاس اس کا بہت بڑا ذاتی چھاپہ خانہ موجود ہے جو بہت زیادہ کام میں مصروف رہتا ہے لیکن اس کے علاوہ چھیاسٹھ بڑے بڑے چھاپہ خانے دس لاکھ کاپی فی گھنٹہ چھاپتے ہیں۔ اور اگر اس اخبار کی دن کی اشاعت کے صفحے زمین پر ملا کر بچھا دیئے جائیں تو وہ بارہ ہزار میل تک پھیل جائیں گے۔

یقیناً ہر شخص کو خیال ہو گا کہ اس عجیب وغریب اخبار کے لئے کاغذ کہاں سے آتا ہو گا۔ اس تیس لاکھ اشاعت سے زیادہ تعجب انگیز یہ بات ہے کہ اس اخبار کا کاغذ تیار کرنے میں ساٹھ ہزار پانچ سو درخت ہر ہفتہ کٹوائے جاتے ہیں گویا تین لاکھ نوے ہزار درخت کا ایک عظیم الشان جنگل بلکہ ملک کا ملک صاف کر دیا جاتا ہے۔

لطیفہ

ہوشیار وکیل

ایک شخص نے عدالت میں دعویٰ دائر کیا کہ محکمہ ریلوے کی بدانتظامی کی وجہ سے میرا بایاں بازو زخمی ہو کر بے کار ہو گیا ہے اور اب میں اس کو کام کرتے وقت اچھی طرح اوپر نہیں اٹھا سکتا۔ ریلوے کے وکیل نے مدعی سے ہمدردی کے ساتھ دریافت کیا۔

"کیا آپ کے بازو میں سخت درد ہوتا ہے"

"جی ہاں۔ بہت سخت"

"آپ اس کو اوپر اٹھا سکتے ہیں"

"نہیں بالکل نہیں"

"افسوس! مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے اس حادثہ سے پیشتر تو آپ بازو کو بخوبی اوپر اٹھا سکتے ہونگے"

"ہاں حضور!"

"اچھا تو اب صرف یہ بتا دیجئے کہ آپ اس بازو کو کتنا بلند اٹھا سکتے تھے"

اس کے جواب میں مدعی نے اپنا بازو سر سے اونچا لے جا کر کہا۔

"جناب اس قدر!"

اس پر عدالت میں ایک فرمائشی قہقہہ پڑا اور مدعی جو جھوٹا تھا سخت شرمندہ ہوا۔

(بقیہ مضمون صفحہ ")

تھا کنائے پناما کا یہ خطہ کہ جہاں نہر بنائی جانی منظور تھی۔ وہ کولمبیا واقع جنوبی امریکہ کے تحت میں تھا۔ ریاستہائے متحدہ نے اس کی آزادی دلائی اور ایک ڈاکٹر کو بھیجا کہ وہ مزدوروں کی ہلاکت کی وجہ دریافت کرے اس نے بتلایا کہ صرف یہ مچھر انسان کی ہلاکت کا باعث ہیں کئی من مٹی کا تیل چھڑکا گیا۔ اور مچھر مر گئے۔ چنانچہ نہر تیار ہو گئی یہ نہر سوئز سے بہت بڑی ہے۔ اب بھی اس میں ایک خرابی ہے کہ نہر کے کنارے ٹوٹ ٹوٹ کر نہر میں گرا کرتے ہیں۔ جب یہ مصیبت بھی دور ہو جائے گی تو نہر پناما دنیا کی تمام نہروں سے بہتر اور مفید ثابت ہو گی۔

قصے کہانیاں

شریف ڈاکو

ایک صاحب خورشید نامی ریل گاڑی میں سفر کر رہے تھے بدن پر لمبی اچکن۔ سر پر عمامہ۔ ہاتھ میں نازک چھڑی۔ آنکھوں میں سرمہ۔ سامنے ایک خوبصورت پاندان غرض نہایت پرتکلف اور شریف آدمی معلوم ہوتے تھے لیکن آپ ایسے شکر گذار بندے تھے کہ سوائے عید و بقرعید کے سجدہ کرنیکا نام تک نہ لیا۔ آپ کا عقیدہ تھا کہ مرتے وقت توبہ و استغفار کرلیں گے۔ گناہ معاف ہوجائیں گے۔ یہ روزی کی زحمت اپنے سر کون لے! خورشید تنہا ایک طرف بنچ پر بیٹھا ہوا اپنی آئندہ زندگی کے لئے کسی خاص اسکیم پر غور کر رہا ہے۔ دوسری طرف سامنے والی بنچ پر ایک دوسرے صاحب تشریف فرما ہیں۔ آپ کو والدین کیجانب سے گل شیر کا خطاب ملا ہے آپ بھی دیکھنے میں بہت ہی شریف انسان معلوم ہوتے ہیں پندرہ روپیہ کی عینک سے آنکھیں چھپی ہوئی ہیں، بوٹ بھی اعلیٰ قسم کا ہے۔ رومال بھی کم قیمت کا نہیں کچھ دیر تک تو ان دونوں حضرات میں بیگانگی سی رہی لیکن رفتہ رفتہ تعارف پیدا ہو گیا مصافحہ و معانقہ کی رسم ادا کی گئی پھر نہ پوچھئے ایسی گہری چھنی کہ دونوں نہایت ہی قدیم گہرے دوست معلوم ہونے لگے کبھی اخلاقی مسائل پر فلسفیانہ غور و بحث ہوئی کبھی سیاسی امور پر دوستانہ تبادلہ خیالات شروع ہوتا کبھی مصر و روم یونان و ایران۔ روس و ٹرکی کے بڑے بڑے نامور انسان کی تاریخ اور انکے کارنامے بیان ہونے لگتے۔ زبان اور کان کیلئے مختلف قسم کی دلچسپیاں موجود تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد خورشید صاحب نے ایک بٹوا نکالا جو صرف آپ ہی اپنی نظیر تھا گل شیر صاحب کی آنکھیں کھل گئیں۔ آپنے نہایت متانت و سنجیدگی سے کہا "سبحان اللہ کیا ہی اچھا بٹوا ہے اس کا رنگ کیا ہی پیارا معلوم ہوتا ہے۔ کاٹ میں کسی نے ستم ہی کردیا ہے۔ لایئے صاحب لایئے میں ذرا ہاتھ میں لیکر دیکھوں۔ بٹوا کا ہاتھ میں جانا تھا کہ طرح طرح کے خیالات دل میں پیدا ہونے لگے کبھی ڈور کی تعریف کرتے کبھی اسکے بہنے کی اسی قسم کے خیالات میں آپ غلطان و پیچاں تھے کہ گاڑی دوسرے اسٹیشن پر آگئی قلی قلی کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک قلی ڈبے کے سامنے آیا۔ کہئے صاحب کوئی سامان ہے ؟ گل شیر صاحب نے کہا نہیں

ہم اس اسٹیشن پر نہیں اتر ینگے اب راستہ بالکل صاف تھا
بسم اللہ کہکر آپ کو دپڑے اور جلدی جلدی قدم آگے بڑہاتے گئے
خورشید صاحب کی حیرت و تعجب کی انتہا نہیں رہی۔ آپنے
تعاقب کیا دو ہی ایک قدم چلکر اب دونوں دوست قریب
ہوگئے۔ خورشید نے کہا کہئے حضرت کہاں جارہے ہیں؟ آپ
کے قدم بہت جلد جلد اٹھ رہے ہیں۔ لائیے میرا بٹوہ دیجئے۔

گل شیر۔ واہ حضرت واہ آپ خوب آدمی ہیں میرے
بٹوے کو اپنا بناتے ہیں۔ ڈریئے خدا سے جو ہمکو دیکھتا ہے ایمان
داری اور صداقت اصل اسلام ہے۔

خورشید۔ رہنے دیجئے آپ اپنے وعظ و نصیحت، میں
نے آپ ایسے ناصح اور ایماندار بہت دیکھے ہیں خیریت اسی
میں ہے کہ میرا بٹوہ میرے حوالہ کیجئے۔

باتیں زیادہ بڑھ گئیں۔ دونوں سچے دوستوں میں جوتے
چلنے لگے۔ کشتی کا سامان ہو ہی رہا تھا کہ پولیس آپہونچی دونوں
کو دس دس ہنٹر لگائے پھر بٹوا گل شیر سے لے لیا۔

پولیس۔ بتلاؤ اس بٹوے میں کتنے خانے ہیں

گل شیر۔ چار خانے۔

پولیس۔ ترتیب وار ہر خانے کی چیز کو بتلاؤ۔

گل شیر۔ پہلے میں دو اٹھنیاں۔ دوسرے میں دو روپے

ایک سرکاری رسید تیسرا خالی چوتھے میں
دو چونیاں۔

پولیس۔ میاں خورشید، تم بتلاؤ کتنے خانے ہیں۔

خورشید۔ تین خانے، پہلے میں دو اشرفیاں۔ دوسرے
میں تین روپے اور ایک پانچ روپیہ کا نوٹ تیسرے
میں تین چونیان۔

پولیس نے بٹوہ کھولا۔ خورشید کے بیان کے مطابق
تمام چیزیں پوری اور صحیح اتریں۔ بٹوا خورشید کے حوالہ کردیا
گیا اور گل شیر حوالات کے۔

پیام بھائیو:۔ اس زمانہ میں ہماری سوسائٹی اسی طرح
کے دوستوں سے بھری ہوئی ہے، ہماری محبت ظاہری ہمارا
خلوص مکاری، اور ہماری نیت سرتا پا فساد ہے۔ ہمکو چاہئے
کہ ہم مخلص اور ایک دوسرے کے سچے خیر خواہ بننے کی
کوشش کریں۔

ورنہ ممکن ہے کہ دنیا کی پولیس کی نگاہوں سے ہم
اپنے اعمال سیاہ کو چھپالیں۔ لیکن خدا کی پولیس کی نگاہوں
سے انکا بچانا ناممکن ہوگا۔

ابو داؤد متعلم مدرسۃ الاصلاح
سرائے میر

ایک نہایت دلچسپ کہانی

(جناب عبدالعلیم صاحب نامی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

تم تینوں جاؤ اور آپس میں پھوٹ ڈلواؤ یہانتک کہ ایک دوسرے کی آنکھیں نکالنے پر تیار ہوجائیں۔ کیا تم اس کام کو کرسکوگے۔

بیشک! ہم کرسکیں گے تینوں نے جواب دیا۔

کیونکر کروگے ؟

بہت آسانی سے انہوں نے کہا: پہلے ہم انکو برباد کردینگے اور جب انکے پاس کچھ نہ رہیگا۔ ہم تینوں کو یکجا کردیں گے۔ وہ آپس میں کٹ مرینگے کامیابی یقینی ہے!

بالکل درست۔ میں خیال کرتا ہوں کہ تم اپنی ذمہ داریاں سمجھ گئے ہو جاؤ اور کام ختم کرنے سے پیشتر اپنی صورت مت دکھاؤ۔ ورنہ کھال کھینچ کر پھینک دونگا۔

بچہ شیطان وہاں سے ایک دلدل میں پہونچے اور سوچنے لگے کہ کام کیونکہ شروع کرنا چاہئے۔ ناچاقیاں بڑھیں اور وہ آپس میں لڑنے لگے۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ سب سے ہلکا کام اسی کو ملے۔ آخر طے پایا کہ کام تقسیم کرلیا جائے اور جو سب سے پہلے ختم کرے وہ دوسرے کی مدد کرے اور ایک وقت اسکے لئے مقرر کرلیا جائے جب وہ اسی دلدل میں ملیں تاکہ معلوم کرسکیں کہ کس کو مدد کی ضرورت ہے۔

وقت مقررہ آیا اور تینوں بچہ شیطان اسی دلدل میں ملے۔ ہر ایک نے اپنا قصہ بیان کرنا شروع کیا کہ واقعات کیونکر رونما ہوئے اور اب کس حالت میں ہیں۔ پہلا جسکے حصہ میں سائمن سپاہی آیا تھا کہنے لگا۔ میرا کام ٹھیک انجام پارہا ہے۔ سائمن کل باپ کے گھر واپس جائیگا۔

تم نے کیونکر اسکا انتظام کیا، ایک ساتھی نے دریافت کیا۔

جواب ملا: میں نے سائمن میں اسقدر قوت بھردی کہ اس نے بادشاہ سے تمام دنیا فتح کرنے کی درخواست کی۔ شاہ نے اجازت دیدی اور اسکو اپنا جنرل مقرر کرکے شاہ ہند کو فتح کرنے لئے روانہ کیا۔ لڑائی کا میدان گرم ہوا لیکن شب سے پیشتر میں نے سائمن کے سپاہیوں کی قوت زائل کردی اور شاہ ہند کے لئے تنکوں کے بے شمار سپاہی پیدا کردیئے۔ جب سائمن کے سپاہیوں نے تنکے کے سپاہیوں کو اپنے چہار جانب دیکھا وہ خوف زدہ ہوگئے۔ سائمن نے توپیں اور بندوقیں چلانے کا حکم دیا لیکن وہ بھی بیکار ہوگئیں۔ سائمن کے سپاہی خوف زدہ ہوکر بھیڑوں کی طرح بھاگے۔ شاہ ہند نے پیچھا کیا اور انکو بری طرح قتل کیا۔ سائمن کی بے عزتی کی گئی۔ ریاست ضبط ہوئی اور کل اسکے قتل کا حکم ہو میرے لئے صرف ایک دن کا کام باقی ہے۔ میں اسکو قید سے نکل کر بھاگنے میں مدد دونگا اور کل اس قابل ہوجاؤں گا کہ آپ میں سے جسکو ضرورت ہو اسکی مدد کروں،

دوسرا بچہ شیطان جسکے ذمہ طارس کیا گیا تھا آگے بڑھا اور اپنا قصہ اس طرح کہنا شروع کیا "مجھے مدد کی ضرورت نہیں میرا کام ٹھیک طریقے سے انجام پا رہا ہے۔ طارس ایک ہفتہ سے زیادہ ٹھیر نہیں سکتا۔ میں نے پہلے اسکو لالچی بنایا اور پھر اسکی تمناؤں کو اسقدر بڑھا کہ جو کچھ وہ دیکھتا خریدنے کی خواہش کرتا۔ قرض لینا اس نے پہلے ہی شروع کردیا تھا اب اسکے بوجھ سے اس قدر دب گیا ہے اور صاف ظاہر ہے کہ اس سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتا۔ ایک ہفتہ میں اسکے بل واجب الادا ہونگے اور اس سے پیشتر اس کا اثاثہ تباہ کردوں گا وہ ادائیگی کے ناقابل ہوگا اور باپ کے پاس بھاگ جانے پر مجبور ہوجائیگا۔

دونوں نے تیسرے بچہ شیطان سے دریافت کیا جسکے حصہ میں ریون پڑا تھا۔ تمہارا کام کیسا چل رہا ہے۔

بہت برا۔ اسنے جواب دیا، میں نے اسکی شراب میں تھوک دیا کہ پیٹ میں درد ہونے لگے۔ اسکے بعد کھیت پر گیا اور اسکو پتھر کی طرح سخت بنادیا

کہ اسکو جوت نہ سکے۔ میں خیال کرتا تھا کہ وہ اپنا کام جاری نہ رکھ سکے گا لیکن بیوقوف کی طرح جیسا کہ وہ ہے ہل لیکر آیا اور نالیاں بنانے لگا۔ وہ پیٹ کے درد سے چلا اٹھتا تھا لیکن کام کئے جاتا تھا۔ میں نے ہل توڑ دیا لیکن وہ گھر گیا اور دوسرا لے آیا۔ اور پھر اپنا کام شروع کر دیا۔ میں زمین کے اندر گھس گیا اور ہل کا پھارا پکڑ لیا لیکن اوس پر کچھ اثر نہ ہوا وہ اور زیادہ ہل پر جھک گیا پھارا تیز تھا اور میرے ہاتھ زخمی ہو گئے اس نے کھیت کو ختم کر دیا ہے صرف ایک ٹکڑا باقی ہے بھائیو آؤ اور میری مدد کرو۔ ورنہ سب کی محنتیں بیکار ہو جائیں گی اگر بیوقوف اپنا کام کئے گیا اسکے بھائیوں کو کسی چیز کی ضرورت نہ ہو گی اور وہ انکی کفالت کرے گا،

سائمن کے بچہ شیطان نے دوسرے دن آنے کا وعدہ کیا اور وہ رخصت ہو گئے۔

۳

ایون سارا کھیت ختم کر چکا تھا۔ صرف ایک پٹی باقی تھی اسکو بھی پورا کرنے کے لئے وہ آیا۔ اس کا پیٹ درد کر رہا تھا لیکن ہل چلنا ضروری تھا۔ اس نے لگام کو ڈھیلا کیا۔ ہل کو موڑا اور کام کرنے لگا۔ ایک نالی ختم ہوتی لیکن واپسی پر ہل گھسٹنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی چیز نے پکڑ لیا ہے۔ یہ بچہ شیطان تھا جس نے ہل کے دونوں پھاروں میں ٹانگیں اڑا دیں تھیں اور اسکو روکے ہوئے تھا۔

یہ کیا ہے' ایون نے خیال کیا۔ یہاں جڑیں نہ تھیں پھر بھی کوئی جڑ موجود ہے۔

ایون نے اپنا ہاتھ زمین میں ڈالا پکڑا اور کوئی نرم شے محسوس کرتا ہوا باہر گھسیٹ لایا۔ یہ شے جڑ کی طرح سیاہ تھی لیکن حرکت کرتی اور تڑپتی ہوئی یہ زندہ بچہ شیطان تھا۔

یہ کیا بدصورت شے ہے' ایون نے دل میں خیال کیا۔ اور ہل سے مار دینے کے لئے ہاتھ اٹھایا لیکن بچہ شیطان گڑگڑا کر کہنے لگا۔

مجھے نہ مارنے میں آپ کے لئے ہر کام کرنے کو تیار رہوں۔

تم کیا کر سکتے ہو،

جو کچھ آپ فرماویں۔

ایون نے سر کھجلایا۔

میرا پیٹ درد کرتا ہے تم اس کا علاج کر سکتے ہو۔

بیشک! ابھی ابھی،

اچھا کرو،

بچہ شیطان ایک نالی کے قریب گیا۔ اودھر ادھر تلاش کیا۔ اپنے پنجوں سے کھودا اور تین جڑوں کا ایک گچھا نکال کر ایون کو دیدیا۔

ان میں سے ایک کھا جائیے۔ آپ کا درد دور ہو جائیگا، اسنے کہا۔

ایون نے جڑیں لے لیں انکو علیحدہ کیا اور ایک نگل گیا۔ درد فوراً دور ہو گیا بچہ شیطان نے درخواست کی کہ اب اسکو جانے دیا جائے۔ وہ زمین کے اندر گھس جائیگا اور پھر کبھی نہ آئیگا،

بہت بہتر، جاؤ خدا حافظ۔ ایون نے کہا۔

جوں ہی خدا کا نام لیا گیا بچہ شیطان زمین پر پتھر کی طرح پانی میں گرا۔ صرف ایک سوراخ نظر آیا۔

ایون نے باقی دو جڑیں ٹوپی میں رکھ لیں اور کام میں مشغول ہو گیا۔ اس نے پٹی ختم کی۔ ہل کو کندھے پر رکھا اور گھر کی طرف چل دیا اسنے گھوڑے کو کھولا، جھونپڑے میں داخل ہوا اور اپنے بھائی سائمن سپاہی کو کھانے پر دیکھا سائمن کی ریاست ضبط ہو چکی تھی اور وہ بمشکل قید سے نکل کر بھاگا اور اپنے باپ کے پاس رہنے کے لئے آیا تھا۔

سائمن نے ایون کو دیکھا اور کہا میں تمہارے پاس رہنے کے لئے آیا ہوں مجھے اور میری بیوی کو اس وقت تک کھلاؤ جب تک مجھے کوئی ملازمت نہ مل جائے۔

بہت بہتر' ایون نے کہا' آپ ہمارے ساتھ رہ سکتے ہیں۔

ایون بنچ پر بیٹھنے کے قریب ہی تھا کہ لیڈی کو ناگوار گذرا اور اس نے اپنے شوہر سے کہا۔ میں اس غلیظ کسان کے ساتھ کھانا پسند نہیں کرتی،

سائمن سپاہی نے کہا' لیڈی صاحبہ فرماتی ہیں کہ تم انکو اچھے نہیں معلوم ہوتے اس لئے باہر جا کر کھانا کھاؤ،

دیون نے کہا بہت بہتر اور میں شب کو بھی باہر رہوں گا۔ کیونکہ مجھو گھوڑی کو چرانا ہے۔

یہ کہکر روٹی لی، کوٹ پہنا اور اپنی گھوڑی کے ساتھ کھیت کیطرف چلدیا

(باقی آیندہ)